[illegible]

جامعہ

جامعہ ملّیہ اسلامیہ، دہلی

خط و کتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر - نئی دہلی

P. O. JAMIA NAGAR, NEW DELHI-25

جامعہ

سالانہ چندہ
چھے روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس نئے پیسے

جلد ۴۶	بابت ماہ جنوری سنہ ۱۹۶۲ء	شمارہ ۳

فہرست مضامین

سالنامہ

رسالہ "جامعہ" کا اگلا شمارہ سالنامہ ہوگا، جس میں ۱۹۶۱ء کے اردو ادب کا بسط و تفصیل سے جائزہ لیا جائے گا۔ اس کا حجم تقریباً ۱۴۰ صفحات ہوگا، اور قیمت ڈیڑھ روپے ہوگی۔

سالنامہ ڈاک خانہ سے رسیدے کر بھیجا جائے گا، لیکن پھر بھی راستہ میں کھو جانے کا امکان ہے، اس لئے جو حضرات چاہتے ہوں کہ "سالنامہ" انھیں یقینی طور پر مل جائے، وہ فیس رجسٹری کے پچاس نئے پیسے بھیج دیں، ورنہ رسالہ کے نہ ملنے کا دفتر ذمہ دار نہیں ہوگا اور دوبارہ طلب کرنے پر تعمیل کرنے سے قاصر ہوگا۔

جن خریداروں نے دوسرے سال کا چندہ ابھی نہیں بھیجا ہے، ان سے درخواست ہے کہ مع فیس رجسٹری جلد بھیج دیں۔

سالنامہ کے مضامین کی تفصیل اس شمارے کے آخری صفحہ ۱۶۸ پر ملاحظہ ہو

بنیادی قومی تعلیم کا سماجی کردار

ڈاکٹر سلامت اللہ

قومی زندگی کے ہر پہلو سے متعلق آج ہمارے دیس ہندوستان میں بحث و مباحثہ کا بازار گرم ہے یہاں تک کہ ہم اپنی منزل کے بارے میں متفق نہیں ہیں کہ ہمیں کہاں پہنچنا ہے۔ اس معاملے میں کہ ہماری سماجی زندگی کا کیا نقشہ ہونا چاہیئے، مختلف جماعتوں کے خیالات ایک دوسرے سے آپس میں ٹکراتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک طرف ملک کی موجودہ حکومت اور لوگوں کی ایک خاصی بڑی تعداد سمجھتی ہے کہ ہماری مادی اور روحانی دونوں قسم کی ترقی کے لئے سوشلسٹ سماج قائم کرنا نہایت ضروری ہے۔ ایک ایسا سماج جس میں سب ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کریں اور اپنی قابلیت اور طاقت کے مطابق ملک کی خوش حالی کو بڑھانے کی کوشش کریں اور اس کی برکتوں سے سب ہی فیضیاب ہوں۔ کسی کو دوسرے کی محنت سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کا حق نہ ہو۔ اس کے خلاف دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ ملک کی ایک چھوٹی مگر با اثر جماعت سماج کے موجودہ ڈھانچے کو برقرار رکھنا چاہتی ہے۔ جس کی بنیاد اشتراک عمل کی بجائے باہمی مقابلے پر قائم ہے اور جس میں اکثریت اپنی محنت کے پھل سے بڑی حد تک محروم رہتی ہے اور اُس کا فائدہ وہ چھوٹا سا طبقہ اٹھاتا ہے جس کے قبضے میں دولت پیدا کرنے کے ذریعے ہیں۔

جب قومی زندگی کے مقصد جیسے بنیادی مسئلے میں اس قدر اختلاف رائے ہے، تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ تعلیم کے معاملے میں جو محض ایک وسیلے کی حیثیت رکھتی ہے، مختلف جماعتوں کے خیالات جُدا جُدا ہیں۔ یوں تو ہمارے ہاں ابتدائی سے لے کر اعلیٰ تعلیم کی ہر ایک منزل کے بارے میں الگ الگ رائیں ہیں کہ اس کی شکل کیا ہونی چاہیئے، لیکن جتنے شدید اختلافات ابتدائی تعلیم کے بارے میں ہیں، اتنے شاید اور کسی منزل کی تعلیم کے بارے میں نہیں ہیں۔ ابتدائی تعلیم کا مقصد

اور روپ کیا ہو۔ اس موضوع پر اُس وقت سے ایک مسلسل بحث چھڑی ہوئی ہے جبکہ مہاتما گاندھی نے ۱۹۳۷ء میں قوم کے سامنے بنیادی تعلیم کا خیال پیش کیا تھا۔ آج کم و بیش ایک چوتھائی صدی کی مدت ختم ہو چکی ہے، مگر بحث اب بھی جاری ہے کہ بنیادی قومی تعلیم میں کون سی چیزیں اہم ہیں۔ یہاں تک کہ ملک کی مختلف ریاستوں میں جو تھوڑے بہت مدرسے بنیادی اسکول کے نام سے کھولے گئے ہیں، ان کے بارے میں شبہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ وہ صحیح معنوں میں بنیادی مدرسے کہلانے کے مستحق ہیں بھی یا نہیں۔

ایسا کیوں ہے؟ اسے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم بنیادی تعلیم کے تصور کو تاریخی اور سماجی پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کریں۔

ہندوستان پر برطانیہ کا قبضہ ہو جانے کے بعد یہاں کی حکومت کا ڈھانچا بھی بدلا لیکن اس سے کہیں زیادہ اہم بات یہ ہوئی کہ وہ بنیادیں ہل گئیں جن پر پرانے سماج کی عمارت کھڑی تھی۔ وہ سماجی نظام جو صدیوں سے اس دیس میں قائم تھا، ڈگمگانے لگا۔ اس سماج کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں اندرونی طور پر کسی بڑی تبدیلی کا پیدا ہونا قرین قیاس معلوم نہیں ہوتا تھا۔ یہاں لوگوں کے حقوق و فرائض ان کے اپنے اپنے طبقے کے اعتبار سے متعین تھے اور ان کی پابندی کرانے میں سرکاری حکم یا ضابطہ قانون کا اتنا دخل نہیں تھا، جتنا کہ روایات اور عقائد کا۔ مثال کے طور پر لوگوں کے پیشے، اختیارات اور سماجی رتبے کا انحصار ذات پات پر تھا۔ یا جو لوگ دولت مند تھے، جن کے پاس جاگیریں تھیں، ان کے اور ان کی رعایا کے درمیان حقوق و فرائض کے رشتے واضح تھے۔ اگرچہ ہندوستان میں انگریزوں کے آنے سے پہلے کئی ایک حکومتیں بنیں اور بگڑیں، سینکڑوں حاکم، راجے مہاراجے، بادشاہ اور شہنشاہ آئے اور گئے، لیکن ملک کے سماجی نظام میں کوئی بنیادی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ اس کا اقتصادی ڈھانچا جوں کا توں برقرار رہا۔ بہت پرانے زمانے سے ہندوستان کی دولت کا سب سے بڑا ذریعہ کھیتی باڑی تھا۔ گاؤں کی زندگی میں زراعت اور گھریلو دستکاری میں ایسا تال میل تھا کہ زندگی کی تمام بنیادی ضرورتیں گاؤں ہی میں پوری ہو جاتی تھیں۔ گاؤں اس طرح کسی باہر کی ایجنسی کے محتاج نہیں تھے۔ لیکن دیہی زندگی کی اس تصویر سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیئے کہ وہ مادی یا تہذیبی لحاظ سے بھری پوری تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس سماج میں زندگی کی ضرورتیں بہت محدود تھیں۔ اور اندرونی طور پر اُس زندگی کے امن اور شانتی کو درہم برہم کرنے والے

اسباب موجود تھے۔ بظاہر لوگ اپنی موجودہ حالت پر قانع تھے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ملک میں کبھی کوئی ہل چل پیدا نہیں ہوئی۔ بلکہ اصلی بات یہ ہے کہ کبھی کبھی ہنگامے برپا ضرور ہوئے، بغاوتیں، جنگیں اور خوں ریزیاں بھی ہوئیں، مگر ان کا اثر حاکموں کی تبدیلی، اور ایک وقتی اتھل پتھل سے زیادہ گہرا نہیں ہوا۔ سماجی زندگی پر جمود طاری رہا۔ اور سماج کے مختلف طبقے اور گروہ اپنے اپنے معینہ درجے کے مطابق زندگی گزارتے رہے۔ اور سماج کے اقتصادی نظام میں توازن قائم رہا۔

برطانوی حکومت کی پالیسی اور طریق کار نے ہندوستان کی سماجی زندگی کو تہ و بالا کر دیا۔ اور اس کے اقتصادی توازن کو بگاڑ دیا۔ صنعتی انقلاب کی بدولت انگلستان میں ملک کی ضرورت سے زیادہ چیزیں مشینوں سے بننے لگیں۔ ان کی کھپت کے لئے انگلستان کو ہندوستان سے بہتر منڈی اور کہاں مل سکتی تھی۔ چنانچہ ان چیزوں کی تجارت کو ہندوستان میں ہر جائز اور ناجائز طریقے سے بڑھاوا دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کی گھریلو دستکاریاں تباہ ہو گئیں۔ ملک کی زراعت کا بھی یہی حشر ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حکومت نے زمینداری کی جو سنستھا قائم کی، اس سے زرعی پیداوار کو بہت بڑا دھکا لگا اور کسان تباہ ہو گئے۔ اب تک زمین پر کسان کا اپنا قبضہ تھا اور وہ اپنی پیداوار کا ایک مقررہ حصہ براہ راست سرکار کو ادا کر دیتا تھا لیکن اب زمینداری کے نئے نظام میں سرکار اور کسان کے درمیان ایک تیسرا شخص "زمیندار" حائل ہو گیا اور وہ خود پیداواری عمل میں کوئی خاص حصہ لئے بغیر کسان کی محنت سے فائدہ اٹھانے لگا۔ زمیندار کو ہر قسم کی لوٹ کھسوٹ کرنے کی چھوٹ تھی، کیونکہ وہ برطانوی حکومت کو قائم رکھنے اور مضبوط بنانے میں ہر ممکن مدد دینے کے لئے تیار تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کسان کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ کسان کی بربادی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کھیتی باڑی سے روزی کمانے والوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا تھا۔ اس لئے کہ برطانوی صنعت کے حملے کا مقابلہ دیسی دستکاری نہ کر سکی اور دستکاروں کو زندہ رہنے کے لئے مجبوراً زراعت کا سہارا لینا پڑا۔ یہ اتنی بھیانک اور دل ہلا دینے والی تباہی تھی کہ اس کا احساس حکومت کے اعلیٰ حلقوں کو بھی ہوا۔ چنانچہ

لارڈ ولیم بنٹنگ گورنر جنرل نے ایک اپنے سرکاری مراسلے میں صورت حال کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے،

"جولاہوں (بُن کروں) کی ہڈیاں ہندوستان کے میدانوں کا رنگ پھیکا کر رہی ہیں!"

جہاں برطانوی حکومت نے ہندوستان پر اتنی بڑی مصیبت نازل کی، وہاں نادانستہ طور پر اس سے ایک فائدہ بھی ہوا۔ ہندوستانی سماج صدیوں سے جمود کے عالم میں تھا اور لوگوں نے سمجھ لیا تھا کہ ہماری حالت ہمیشہ ویسی ہی رہے گی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ جو کچھ بھی ہے وہ ہماری قسمت میں لکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بڑی سے بڑی سماجی ناانصافی، بے عزتی، ظلم و تشدد اور حکمراں طبقے کی خودسری کے سامنے سر جھکانے پر مجبور تھے۔ وہ طرح طرح کی توہم پرستی کا شکار تھے اور انھیں اس تاریکی سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ جو حالات برطانوی حکمت عملی سے پیدا ہوئے، انھوں نے اس جمود کو توڑا۔ عام تباہ حالی نے ہندوستانیوں کو بری طرح جھنجھوڑا اور یہ سوچنے پر آمادہ کیا کہ آخر اس صورت حال سے کیوں کر چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ادھر انگریزی تعلیم کے ذریعے ہندوستان کے پڑھے لکھے طبقے میں نئے خیالات ترقی کر رہے تھے، جو دراصل یورپ کے صنعتی انقلاب کی دین ہیں یعنی جمہوریت مساوات اور آزادی۔ یہ وہ انقلابی خیالات ہیں جن سے سرشار ہو کر ہندوستانیوں نے مختلف قسم کی سیاسی سماجی اور تہذیبی تحریکیں شروع کیں۔ اور ان کی بدولت وہ جمود ٹوٹا، جو صدیوں سے ہندوستانی سماج کو میٹھی نیند سلا رہا تھا۔

برطانوی تسلط کے خلاف ملک میں جو بھی اندولن شروع ہوئے، وسیع معنوں میں ان سب کا کسی نہ کسی طرح عوام کی تعلیم سے تعلق تھا۔ باضابطہ طور پر نہ سہی، بے ضابطہ طور پر یہ بھی تعلیم کا ذریعہ تھے، کیوں کہ وہ عوام میں ایک نئی ذہنیت اور ایک نیا شعور پیدا کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اس قسم کی بالواسطہ تعلیم کچھ زیادہ کارگر نہیں ہو سکتی تھی۔ جمہوریت کا نیا تصور یورپ سے حاصل ہوا تھا۔ اس کا تقاضا تھا کہ عوام کی باضابطہ تعلیم کا سرکاری طور پر انتظام کیا جائے تاکہ کم از کم تہذیبی میدان میں ترقی کرنے کے سب کو برابر مواقع حاصل ہوں۔ اس احساس ضرورت نے آگے چل کر عوام کی مفت اور لازمی تعلیم کے مطالبے کی شکل اختیار کر لی۔

انگریزی حکومت کو اپنے ابتدائی دور میں ہندوستانیوں کی تعلیم کی ضرورت کا کوئی احساس

نہیں تھا۔ لیکن کچھ عرصے بعد حکومت کو اس طرف تھوڑی بہت توجہ دینی پڑی۔ اس لئے کہ اسے اپنے دفتری کام چلانے کے لئے ایسے ہندوستانیوں کی ضرورت تھی جو انگریزوں کے مقابلے میں کم تنخواہ پر سرکاری نوکری کر سکیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان سے یہ بھی فائدہ حاصل ہو کہ وہ حکومت اور عوام کے درمیان ایک کڑی کا کام کر سکیں یعنی یہ ہندوستانی ملازمین حکومت کا آلہ کار بن کر اسے تقویت پہنچا سکیں۔ گو کہ اس تعلیم کا دائرہ بہت محدود تھا۔ ملک کی آبادی کے ایک بہت چھوٹے حصّے نے اس تعلیم سے فائدہ اُٹھایا۔ مگر سیاسی اور سماجی لحاظ سے دیکھئے، تو ملک پر اس کا بہت گہرا اثر پڑا۔

یہ سچ ہے کہ انگریزی تعلیم کی بدولت ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی آزادی کی تحریک کے لئے چند غیر معمولی رہنما حاصل ہوئے ہیں، جنھوں نے مغربی تہذیب و تمدن کے بہترین عناصر سے اپنی ذات کو سنوارا۔ جمہوریت، آزادی، مساوات، انسان دوستی، سائنسی طریقہ، وغیرہ کو خود اپنایا اور ان ہی قدروں کا سہارا لے کر مختلف تحریکوں کی رہنمائی کی۔ لیکن عام طور پر انگریزی تعلیم کا نتیجہ ملک کے حق میں مفید ثابت نہیں ہوا۔ اور ہوتا بھی کیسے جب کہ اس کا منشا یہ تھا ہی نہیں؟ جن لوگوں نے یہ تعلیم پائی، ان کی اکثریت نے برطانوی حکومت کے مقاصد پورے کئے۔

انگریزی تعلیم کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے سماج میں ایک نیا طبقہ پیدا ہو گیا، جو رنگ روپ کے لحاظ سے تو ہندوستانی تھا مگر اس کی عادتیں، دلچسپیاں اور رہن سہن کے طریقے انگلستان کے حکمران طبقے سے زیادہ ملتے جلتے تھے۔ پھر کیا تعجّب کہ اس طبقے نے ہمیشہ انگریزی حکومت کو قائم رکھنے اور آزادی کی جدوجہد کو کمزور بنانے میں اہم حصّہ لیا۔

اس تعلیم سے ایک نقصان اور ہوا۔ ہندوستانی سماج پہلے ہی دولت اور ذات پات کی بنا پر مختلف گروہوں میں بٹا ہوا تھا۔ اب انگریزی تعلیم نے اس میں ایک اور دراڑ ڈال دی۔ انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے بعد لوگ خود کو کسی اور دنیا کی چیز سمجھنے لگے اور دوسروں کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے۔ ان دونوں گروہوں میں کسی قسم کا تعلق باقی نہ رہا۔ سچ تو یہ ہے کہ انگریزی تعلیم عوام کے لئے تھی ہی نہیں۔ اس سے صرف خواص ہی فائدہ اٹھا سکتے تھے، صرف

وہی لوگ جن کے پاس دولت تھی، جو پہلے ہی سماج کے اونچے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ کیونکہ اولاً تو یہ تعلیم خاصی مہنگی تھی اور دوسرے، اس کے لئے شہروں میں اسکول قائم کئے گئے تھے، جہاں مالی لحاظ سے کم حیثیت والے اور خاص کر گاؤں کے غریب اور متوسط طبقے کے لوگ اپنے بچّوں کی تعلیم کا انتظام نہیں کر سکتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ انگریزی تعلیم سے گاؤں اور قصبے کے چند مال دار لوگوں نے بھی ذاتی طور پر فائدہ اٹھایا۔ لیکن اس تعلیم کا سماجی زندگی سے کوئی تعلق نہیں تھا، اور تعلیم یافتہ لوگوں کو شہر اپنی طرف کھینچ لیتے تھے جہاں وہ اپنے لئے جنت بنا سکتے تھے۔ اس لئے گاؤں اپنی آبادی کے ان عناصر سے محروم ہوتے چلے گئے جو شاید نئے زمانے کے تقاضوں کو سمجھ کر مادی اور تہذیبی لحاظ سے گاؤں کی زندگی کو خوب صورت اور خوش حال بنانے میں کچھ مدد کر سکتے۔ اس طرح دیہی زندگی جو بدیسی حکومت کے ہاتھوں لُٹ کھسٹ کر ہر لحاظ سے ویران اور مفلس ہو رہی تھی، اور زیادہ پست ہوتی چلی گئی۔

ہندوستان کو انگریزی تعلیم سے جو سب سے بڑا نقصان پہنچا وہ یہ ہے کہ اُس نے سماجی زندگی کی بنیادی حقیقتوں سے تعلیم یافتہ طبقے کو بالکل الگ تھلگ کر دیا۔ یوں تو یہ تعلیم ایک نئی تہذیب کی دعوے دار تھی، لیکن اس نے اس بنیادی حقیقت سے آنکھیں چرالیں کہ تمام تہذیب کا سرچشمہ انسانی محنت ہے کہ اس کے بغیر نہ تو تہذیبی زندگی کی مادی چیزیں حاصل ہو سکتی ہیں اور نہ صحیح معنوں میں وہ اخلاقی اور روحانی قدریں جو حقیقت میں تہذیب کی جان ہیں۔ انگریزی تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم یافتہ طبقہ اتنا اپاہج ہو گیا کہ نہ وہ کسی قسم کی پیداوار میں حصّہ لینے کے قابل رہا اور نہ ہی اس میں سماجی زندگی کو سنوارنے کی کوئی اہلیت باقی رہی۔ یہ طبقہ ہر قسم کی جسمانی محنت و مشقت سے گریز کرنے لگا۔ ہر وہ کام جس میں ہاتھ اور لباس کے میلے ہونے کا اندیشہ ہو، اس کے نزدیک گھٹیا اور ہیچ قرار پایا۔ ہندوستانی سماج میں پہلے ہی دولت اور ذات پات کی بنا پر اونچ نیچ کا خیال کیا کم تھا! انگریزی تعلیم نے الا بمی غضب کر دیا۔ زمانے کا تقاضا تو یہ تھا کہ ملک میں جمہوریت کے خیال کو تقویت پہنچائی جاتی اور لوگوں میں برابری اور باہمی عزت و احترام کے رجحان کو ترقی دی جاتی اور ملک کی خوشحالی

کے لئے پیداوار بڑھانے کی مہم میں سبھی شریک ہوتے۔ مگر انگریزی تعلیم کا بالکل الٹا اثر ہوا۔ یہاں تک کہ یہ ہر قسم کی سماجی ترقی کی راہ میں روڑا بن گئی۔

انگریزی تعلیم کے ان مضر اثرات سے آزادی کی تحریک کے لیڈر باخبر تھے۔ چنانچہ قومی پلیٹ فارم سے برطانوی حکومت کی اس تعلیمی پالیسی پر کڑی نکتہ چینی ہونے لگی۔ ۱۹۳۷ء میں ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی رُو سے تعلیم کی ذمے داری صوبوں کی نمائندہ حکومتوں کے سپرد کی گئی۔ تو ہندوستانیوں کو پہلی بار یہ موقع ملا کہ وہ اپنے تصورات کے مطابق ملک کی تعلیمی پالیسی مرتب کریں۔ مہاتما گاندھی نے اس موقع پر ملک کے سامنے بنیادی قومی تعلیم کا خاکہ پیش کیا۔ گاندھی جی نہ صرف آزادی کے اندولن کے سب سے بڑے نیتا تھے، بلکہ تعلیمی معاملات میں بھی ان کی اچھی نظر تھی۔ انھوں نے اپنے جنوبی افریقہ کے قیام کے دوران اور بعد میں سابرمتی آشرم میں کچھ تعلیمی تجربے بھی کئے تھے۔ اور اس سے بھی اہم بات یہ تھی کہ ان کے ذہن میں ہندوستان کی سماجی ترقی اور خوش حالی کا ایک جامع اور واضح تصور موجود تھا۔ وہ جسمانی محنت و مشقت کو بہر حال تعلیم کا ایک ضروری حصہ سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک کوئی بھی تعلیم اُس وقت تک تعلیم کہلانے کی مستحق نہ تھی، جب تک کہ اُسے سماجی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کا ذریعہ نہ بنایا جائے، اس لئے کہ وہ جس قسم کے سماج کو قائم کرنا چاہتے تھے، اس میں ہر ایک فرد کے لئے ایسے کاموں میں حصہ لینا ایک لازمی فرض کی حیثیت رکھتا تھا، جن پر سماج کی خوش حالی اور ترقی کا دار و مدار ہو۔ ان کا عقیدہ تھا کہ تعلیم کے اعلیٰ مقاصد، اخلاقی خوبیاں اور قدریں حاصل کرنے کا موثر طریقہ یہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گاندھی جی نے بنیادی قومی تعلیم میں دستکاری اور دوسرے پیداواری کاموں کو مرکزی جگہ دی اور اس کے ساتھ ساتھ ان مشغلوں پر بھی زور دیا جو سماجی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے ضروری ہیں۔ مثلاً بستی کی صحت و صفائی کی مہم میں حصہ لینا، سڑکیں بنانا، مریضوں کی دیکھ بھال کرنا، وغیرہ۔ گاندھی جی کا خیال تھا کہ اس طرح تعلیم ایک خاموش سماجی انقلاب کی علم بردار بنے گی۔ اور ایک ایسا سماج بنانے میں مدد دے گی جس میں سب مل جل کر زندگی بسر

کریں گے، کوئی کسی کی محنت سے ناجائز فائدہ نہ اُٹھا سکے گا، ہر ایک شخص سب کی بھلائی کے لئے کام کرے گا، اور سب کی کوششوں کا پھل ہر ایک کو نصیب ہوگا۔ گاندھی جی کے آدرش سماج کا روپ یہ ہے اور اسی کو وہ جمہوریت کی رُوح اور سوشلزم کا نچوڑ کہتے تھے۔

یہ ہے بنیادی قومی تعلیم کا وہ پہلو، جس میں نئے سماجی نظام کی ایک جھلک دکھائی دیتی ہے۔ گاندھی جی نے بنیادی تعلیم کے اسی پہلو پر سب سے زیادہ زور دیا تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے کہا تھا کہ بنیادی مدرسے کا مستقل خرچ بچوں کے کام سے پورا ہونا چاہیئے۔ مگر ہوا یہ کہ بنیادی تعلیم کے اسی پہلو کو عمل میں سب سے کم زور بنایا گیا۔ آزادی سے پہلے بھی یہی حالت تھی اور آج بھی آزادی کے چودہ سال بعد یہی حالت ہے۔ اگرچہ اب یہ بات سرکاری پالیسی کے طور پر تسلیم کرلی گئی ہے کہ پورے ملک میں ابتدائی تعلیم کا روپ بنیادی تعلیم ہی ہوگا، لیکن اکثر مدرسوں میں اس قسم کے کام شروع نہیں کئے گئے ہیں۔ ایسے مدرسے بہت تھوڑے ہیں جہاں دستکاری یا حرفے کا کام ہوتا ہو۔ مگر یہ بھی کچھ اس طرح کیا جاتا ہے گویا کئے کی لاج رکھنی ہے۔ نہ کوئی کام کی چیز بنتی ہے اور نہ کوئی اور تعلیمی فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ ایسا تعلیمی فائدہ، جس کا ماہرینِ تعلیم کی مجلسوں میں آئے دن چرچا ہوتا رہتا ہے۔

آخر، یہ صورت حال کیوں ہے؟ یوں تو بہت سے اسباب ہیں جن کا تعلق تعلیم کا انتظام کرنے والوں، استادوں، بچوں کے سرپرستوں وغیرہ سے ہے، لیکن اصل وجہ معلوم کرنے کے لئے مدرسے کی چہار دیواری سے باہر جانا پڑے گا۔ ہماری حکومت نے ہندوستان میں سوشلسٹ سماج قائم کرنے کا اعلان تو ضرور کیا ہے۔ مگر جو طریقے اختیار کئے ہیں ان سے اس مقصد کو حاصل کرنے میں بڑی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ہمارا موجودہ سماج مختلف طبقوں میں بٹا ہوا ہے۔ اگرچہ یہاں تعداد کے اعتبار سے وہ طبقہ بہت بڑا ہے جو جسمانی محنت و مشقت کے ذریعے اپنا پیٹ پالتا ہے اور ملک کی پیداوار اور دولت میں اضافہ کرتا ہے۔ لیکن

طاقت کے لحاظ سے دیکھیئے تو یہ طبقہ بہت کم مایہ ہے۔ اس کے مقابلے میں دولت مندوں کا چھوٹا سا طبقہ بہت طاقت ور ہے۔ اس کا ملک کی سیاسی اور سماجی زندگی پر بڑا اثر ہے۔ اس طبقے کو جسمانی محنت کرنے اور پیداوار کے کام میں خود حصّہ لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ طبقہ کسی ایسی چیز کو گوارا نہیں کرے گا جس سے اس کی سماجی برتری کو خطرہ ہو۔ بنیادی قومی تعلیم کا یہ اصول کہ دستکاری اور ہاتھ کے کام کو تعلیم میں مرکزی جگہ دی جائے، دولت مند طبقے کے نزدیک اسی قسم کا ایک خطرہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ طبقہ بنیادی تعلیم کو نہ تو آزادی سے پہلے خوشی خوشی قبول کرنے کے لئے تیار تھا اور نہ اب ہے۔ اس طبقے نے شروع ہی سے اس اصول کی روح کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر اس طبقے کی طرف سے یہ خیال پیش کیا گیا ہے کہ دستکاری کو تعلیم میں جگہ دینا تو اچھا ہے کیوں کہ اس سے بچّے کی تخلیقی قوت کو ابھرنے کا موقع ملتا ہے اور اس کے ذریعے بچے کی شخصیت کے وہ نقوش ابھرتے ہیں جنھیں کتابی تعلیم دبا کر رکھتی ہے۔ مگر اس طبقے نے اس خطرے کا بھی اعلان کیا ہے کہ اگر تعلیم میں پیداوار پر زور دیا گیا تو تعلیم کے اعلیٰ مقاصد کا خون ہو جائے گا۔ اور بچہ محض کارخانے کا مزدور بن کر رہ جائے گا۔ اسی طرح دوسرے سماجی کاموں مثلاً مدرسہ اور بستی کی صحت و صفائی کے پروگرام میں بچے کی شرکت پر اس طبقے کی طرف سے یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ اس قسم کے کاموں میں مدرسہ کا قیمتی وقت ضائع ہوتا ہے جو بہر کیف پڑھنے لکھنے پر صرف ہونا چاہیئے۔ اور اس کے علاوہ بچے کا جسم اور لباس گندا ہو جاتا ہے۔ غرض، بنیادی تعلیم کے اُس رول کو کم زور بنانے کے لئے طرح طرح کی دلیلیں اور تاویلیں پیش کی گئی ہیں، جس کا تعلق سماج کی اصلاح اور ترقی سے ہے۔ اس کا اثر یہ ہوا ہے کہ بنیادی تعلیم کے اس اہم پہلو پر بہت کم توجہ دی جا رہی ہے۔

اسی سلسلے میں ایک بات اور غور طلب ہے۔ فرض کیجیئے کہ بنیادی مدرسوں میں پیداواری مشغلوں اور دوسرے سماجی کاموں کو عملاً ویسی ہی اہمیت دی جاتی جیسی کہ ایک سوشلسٹ سماج کی تعمیر کے لئے ضروری ہے۔ مگر اس قسم کے مدرسے محض نمونے کے طور پر

تھوڑی تعداد میں کھولے جاتے اور ملک کے باقی سب مدرسوں میں پرانے ڈھنگ کی کتابی تعلیم ہی ہوتی رہتی، تو کیا بنیادی تعلیم کا مقصد پورا ہو جاتا؟ ہرگز نہیں۔ یہ چند مثالی مدرسے سماجی ڈھانچے میں کوئی بنیادی تبدیلی کیسے پیدا کر سکتے! اس قسم کی تبدیلی کے لئے ضروری ہے کہ پوری قوم کی ذہنیت بدلی جائے۔ بنیادی تعلیم دراصل پوری قوم کی تعلیم کا ایک باضابطہ پروگرام ہے سماج پر اس کا اثر پورے طور پر صرف اسی وقت محسوس کیا جا سکتا ہے، جبکہ ملک کے تمام بچوں کی ابتدائی تعلیم لازمی طور پر صرف بنیادی مدرسوں ہی میں ہو، اور ان مدرسوں میں پیداواری مشغلوں اور سماجی کاموں کو کھیل کود اور تماشے کے طور پر نہیں بلکہ اس نیت سے اپنایا جائے کہ وہ نئے سماج کی زندگی کے ضروری اجزا ہوں گے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ چھ سے چودہ سال تک کی عمر کے تمام بچوں کے لئے صرف ایک ہی قسم کے مدرسے ہونے چاہئیں، یعنی بنیادی مدرسے اس عمر کے بچوں کے لئے، ان کا تعلق چاہے کسی طبقے سے ہو کسی اور قسم کے مدرسے نہیں ہونے چاہئیں۔

"آتشِ گُل" کے اشعار آئینۂ ایّام میں

جناب عبداللہ ولی بخش قادری

شخصیت کسی خلا میں تشکیل نہیں پاتی بلکہ حالات و حادثات، واقعات و معاملات کے آئینے میں اُبھرا کرتی ہے۔ ہمارے من اور تن کی دنیا کا اپنے ماحول کے ساتھ کچھ انوکھا سمجھوتہ ہو جاتا ہے، ایسا سمجھوتہ جس کی کوئی نظیر نہیں ہوا کرتی اور جو ہمارے مخصوص نظریۂ حیات کا غماز ہوتا ہے۔ جگر نے اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے۔

اپنی اپنی وسعتِ فکر و یقیں کی بات ہے جس نے جو عالم بنا ڈالا، اُسی کا ہو گیا

اُن کی اپنی "وسعتِ فکر و یقیں" کے دو نمایاں دَور آئے۔ ایک وہ زمانہ جب اُن کی نگاہیں "شعلۂ طور" سے خیرہ تھیں۔ وہ محض ایک "شاہد در بغل" توبہ شکن مے کش" تھے۔ اور دوسرا وہ عہد جب "آتشِ گل" کی تپش اُن کے سوز دروں نے بڑی شدت سے محسوس کی۔ انھوں نے اپنے ماضی کو "خدا حافظ" کہا اور اُن کی چشمِ بصیرت نے انھیں ایک نئے عالم سے باخبر کیا۔ گرد و پیش کے حالات اس شاعرِ رنگیں نوا سے کچھ تقاضے کرنے لگے اور وہ کارزارِ حیات میں حُدا خوانی کرتا ہوا چل پڑا۔ ع

مجھے کرنی ہے اب کچھ خدمتِ دار و رسن ساقی

جگر اب رمز شناسِ حیات بن چکے تھے۔ انھیں اپنی اس قلبِ ماہیت کا خود بھی بخوبی احساس تھا۔ ع پہلے شراب زیست تھی، اب زیست ہے شراب

انھیں اپنی حیثیت کا بھی احساس ہو گیا۔ وہ سمجھ گئے کہ وہ "منجملۂ خاصانِ میخانہ" ہوں اور:

مرے شعر میں ہیں نزاکتیں، مری نظم میں ہیں لطافتیں مری فکر میں کہیں اے جگر ادبِ کثیف کی جا نہیں

ان کے نزدیک سیاست کارگہِ مکر و ضلالت تھی۔ لیکن ہر ایک باہوش شہری اپنے دیس کے سماجی، معاشی اور سیاسی حالات سے متاثر ہوا کرتا ہے۔ جگر کی ذات پر بھی وطن کے حالات کا اثر پڑا۔ اگرچہ انھوں نے

محدود و مخصوص اصطلاح میں سیاسی شاعری نہیں کی۔ وہ کسی سیاسی جماعت یا سماجی اور معاشی نظام کے نقیب بن کر سامنے نہیں آئے لیکن اُن کے کلام میں ماحول کا عکس نمایاں ہے۔ ان کا دل، ایک صاحبِ نظر اور مخلص وطن پرست کا دل ہے۔ ایک پاک طینت اور صاف باطن فرد کا دل ہے۔ اور ان سب سے بڑھ کر ایک شاعر کا دل دھڑکتا ہوا ہے۔ اسی لئے "آتشِ گل" کے اشعار میں جو دراصل ان کی زندگی کی نشاۃ ثانیہ کی بہار ہیں ان کے دور کی پوری آئینہ داری ملتی ہے۔

بدیسی سامراج کے زمانے میں دنیا کی مادی ترقی کی کچھ بھیک ہمارے نصیب میں بھی آئی۔ کوتاہ بینوں اور نفس پرستوں کو اس میں آقا کی فراخ دلی، دکھائی دی اور کچھ سادہ لوح صورتِ حال پر قناعت گزیں ہو کر روزمرہ کی زندگی میں رنگ، دبو، تلاش کرنے لگے۔ جگر نے ابنائے وطن کی رگِ حمیت کو ٹٹولا:

پرائے ہاتھوں جینے کی ہوس کیا　　　نشیمن ہی نہیں تو پھر قفس کیا
کرم صیاد کے صدہا ہیں پھر بھی　　　فراغِ خاطرِ اہلِ قفس کیا
قفس سے ہے اگر بیزار بلبل　　　تو پھر یہ شغلِ تزئینِ قفس کیا

آپ نے دیکھا کہ آزادی یا غلامی پر نہ تو کوئی فلسفیانہ بحث ہے اور نہ بندھے ٹکے الفاظ میں "نعرۂ انقلاب" یہاں کسی چوبدار کی بے کیف تکرار یا فوجی افسر کی بلند آہنگی بھی نہیں۔ اور وقتی طور پر جذبات مشتعل کرنے کا کوئی سامان بھی نہیں کیا گیا ہے تاہم ذہن کو بیدار کرنے اور دل گرمانے کے لئے بہت کچھ موجود ہے۔

اسی اثناء میں ملک کے اندر بیداری بڑھی اور غیر ملکی نظام پر بوکھلاہٹ کا عالم طاری ہونے لگا۔ جگر نے صورتِ حال سمجھی اور بڑے معصومانہ انداز میں چوٹ کی:

اسی اک جرم پر اغیار میں برپا قیامت ہے　　　کہ ہم بیدار ہیں اور اپنا مستقبل سمجھتے ہیں

مگر ان کا حقیقت شناس دل جانتا تھا کہ اصل حالات اغیار کی اس گھبراہٹ کے متقاضی نہیں ہیں وطنِ پاک بے دست و پا ہے۔ لہذا احباب کو حقیقت کا احساس بھی دلاتے ہیں اور اغیار کی حالت پر طنز بھی کر جاتے ہیں:

صیاد کی نظر میں وہ نشتر سے کم نہیں　　　اک لغزشِ خفی جو مرے بال و پر میں ہے

انگریز نے دوسری جنگِ عظیم میں جیت کے باوجود اپنے آپ کو گھاٹے میں پایا۔ اب فضائے عالم میں سلطانئ جمہور کا نعرہ بلند تھا۔ ہندوستان کی سرزمین سے بھی اُسے اپنا آب و دانا اٹھتا دکھائی دیا۔ طیش میں آکر نفاق کا بیج جسے ساتھ لایا تھا اور جس کی آبیاری برابر کرتا چلا آرہا تھا، اپنے الوداعی تحفے کے طور پر گھر گھر بانٹنے لگا۔ پھر جو کچھ ہوا، ہم سب بخوبی واقف ہیں۔ عروسِ آزادی سے ہم کنار ہونے کے لئے بھائی سے بھائی دست و گریباں ہو گیا اور وہ بھی اس طرح کہ قبائے انسانیت تک چاک کر ڈالی۔ جگر کا حساس دل بالکل بجھ گیا :

بے کیف دل ہے اور جئے جا رہا ہوں میں — خالی ہے شیشہ اور پیئے جا رہا ہوں میں

وہ دل کہاں ہے اب کہ جسے پیار کیجئے — مجبوریاں ہیں ساتھ دیئے جا رہا ہوں میں

اب ان کے پیغامِ محبت و مروّت کا سننے والا کون تھا۔ مذہب کے نام پر سیاسی صف بندی تھی۔ لہذا اس آواز کی بے اثری اور حالات کی ابتری پر کڑھ کر رہ گئے۔

مرا نالہ ہوش رُبا ہو گیا، مرا نغمہ روح فزا ہو کیوں — کہ چمن میں پھول تو ہیں وہی مگر ان میں بوئے وفا نہیں

یہ ایک شعر نہیں بلکہ اس غزل (ع۲۹) کے بیشتر اشعار یہی کیفیت لئے ہوئے ہیں۔ اگلی غزل (ع۳۳) میں ماحول کی تلخی کا اور بھی صاف صاف اظہار موجود ہے۔ پوری سترہ اشعار کی یہ غزل اس وقت کے حالات اور ان سے پیدا شدہ جگر کے جذبات کا ایک سچا مرقع ہے۔ ہر ایک شعر، خون آلود نشتر ہے جو قلب کی گہرائیوں سے گزر کر آیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جگرِ مجروح تڑپ رہا ہے۔ شدتِ احساس و خلوص نے اسے پاش پاش کر دیا ہے :

خلوصِ شوق، نہ جوشِ عمل، نہ دردِ وطن — یہ زندگی ہے خدایا کہ زندگی کا کفن

کبھی یہ علیل سی فضائیں یہ مریضِ ساز زمانہ، کہہ کر خود کو بہلایا جاتا اور کبھی اپنی ہی ذات سے بشانِ خود فریبی سوال ہوتا :

تجھے اے جگر ہوا کیا کہ بہت دنوں سے پیارے — نہ بیانِ عشق و مستی، نہ حدیثِ دلبرانہ

ایسا لگتا ہے کہ نئے سیاسی حالات نے اُن کے جسم سے جان ہی نکال لی ہو۔ وہ دیکھتے ہیں کہ رنگِ زمانہ کیسا بدل گیا۔ بظاہر وہی صورتیں ہیں لیکن دلوں میں کیسا تغیر پیدا ہو چکا ہے۔ ایسے حادثاتِ زمانہ، ان سے لذتِ حیات ہی چھینے لیتے ہیں۔ غزل (ع۵۵) کے قریب قریب سب ہی اشعار سے یہ بات

واضح ہے۔ یہاں تک کہ آخر میں وہ کہہ پڑتے ہیں :

وہی ہے زندگی لیکن جگرؔ یہ حال ہے اپنا   کہ جیسے زندگی سے زندگی کم ہوتی جاتی ہے

وطن کے حالات نے انھیں بے وطن سا محسوس کرایا۔ اس سانحے کی شدت برداشت نہ ہو سکی۔ بس پکار اٹھے :

معاذ اللہ اس کی وارداتِ غم معاذ اللہ   چمن جس کا وطن ہو اور چمن بیزار ہو جائے

فرقہ پرستی اور تنگ نظری کے مظاہرے بڑے جاں سوز تھے۔ جگرؔ نے گردشِ فلک کی شکایت ہی نہیں کی بلکہ اپنا دل چیر کے رکھ دیا :

آ پڑا کچھ وقت ایسا گردشِ ایام سے   زندگی شرما رہی ہے زندگی کے نام سے

آج کل میخانے میں تقسیم ہوتے ہیں جگرؔ   زہر کے ساغر شرابِ زندگی کے نام سے

اس گندے ماحول میں ان کے لئے سانس لینا دوبھر تھا۔ آزادی کے نام پر یہ بربادی دیکھی نہ جاتی تھی مگر بے بس لاچار تھے۔ بس یہی کہہ سکتے تھے :

بھری بہار میں تاراجیٔ چمن مت پوچھ   خدا کرے نہ پھر آنکھوں سے وہ سماں گزرے

اس تاراجیٔ وطن، میں بلاشبہ سب سے بڑا ہاتھ فرقہ وارانہ فسادات کا تھا۔ اللہ ہی وہ پستی تھی جس کو جگرؔ کی عالی ظرفی کسی طور پر برداشت نہ کر سکتی تھی۔ ان کی اس بے زاری اور مایوسی کے ذمہ دار یہی ناگفتہ بہ واقعات ہیں۔ انھیں اس فرقہ واریت کے جنون میں نہ ایک فرقے کی جیت نظر آئی اور نہ دوسرے کی بھلائی دکھائی دی۔ وہ جانتے تھے کہ دونوں کی ہار ہے۔ لہذا زبان سے بے ساختہ طور پر نکل ہی گیا :

اللہ رے اس گلشنِ ایجاد کا عالم   جو صید کا عالم، وہی صیاد کا عالم

ذرا سنبھلے تو خونِ ناحق پر نظر پڑی اور ان کی صوفی منشی پکار اٹھی :

منصور تو سر دے کے سبک ہو گیا لیکن   جلاد سے پوچھے کوئی جلاد کا عالم

لیکن ان کی بات سننے والا کون تھا! سب ہی بے راہ روی کا شکار تھے، انھیں دراصل افراد کی تباہی کا غم نہیں تھا بلکہ اس خلفشار میں بربادیٔ چمن کا نقشہ صاف نظر آ رہا تھا۔ انھیں ساری سرزمینِ چمن ہی گریہ کناں نظر آ رہی تھی۔ اس کرب نے بے چین کر رکھا تھا :

اربابِ چمن سے نہیں پوچھو یہ چمن سے — کہتے ہیں کسے نکہتِ برباد کا عالم

مگر اس عالمِ آہ و بکا میں جگرؔ خستہ تن کی آواز کون سنتا۔ آزادی کے تصوّر نے سرشار کرنے کے بجائے بدمست کر دیا تھا۔ فرقہ واریت کا عفریت دیس کے نواسیوں کو ذاتوں میں بانٹ کر ان کی کاٹ چھانٹ کر رہا تھا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ جن ہاتھوں کو سرپرستی کرنی چاہیے تھی وہ بھی زبردست کے طرفدار دکھائی دینے لگے۔ یہ صورت، ناقابلِ برداشت تھی۔ ظاہر ہے مصلحت اندیشی بھی اس شاعرِ خوش گفتار کو نہ روک سکی۔ خلوصِ نیت اور جذبۂ صداقت پکار اٹھا:

حکومت کے مظالم جب سے ان آنکھوں نے دیکھے ہیں — جگرؔ ہم ہمبئی کو کوچۂ قاتل سمجھتے ہیں

اور اسی احساس کے تحت انھوں نے یہ بھی کہا:

کہتے ہیں بھائی بھائی ہیں اہلِ وطن تمام — پھرتے ہیں آستینوں میں خنجر لیے ہوئے

صرف یہ ایک شعر نہیں بلکہ اس سلسلے کے تمام اشعار اس وقت کے حالات کے سچّے مرقعے ہیں اور جگرؔ کے دردِ نہاں کا مظہر۔ انھوں نے لوگوں کے وحشی پن اور درندگی کو دیکھا تو کہا۔ ایک بار نہیں بلکہ بار بار:

آدمی کے پاس سب کچھ ہے مگر — ایک تنہا آدمیت ہی نہیں

ہر چند کائناتِ دو عالم ہیں اے جگرؔ — انساں ہی ایک چیز ہے، انساں مگر کہاں

آدمی کو آدمی سے بُعد، وہ بھی کس قدر — زندگی کو زندگی کا رازداں سمجھا تھا میں

کیا قیامت ہے کہ اس دورِ ترقی میں جگرؔ — آدمی سے آدمی کا حق ادا ہوتا نہیں

انھیں یہ زندگی قطعی گوارا نہ تھی۔ وہ موت کو ترجیح دے رہے تھے:

یہی ہے زندگی تو زندگی سے خودکشی اچھّی — کہ انساں، عالمِ انسانیت پر بار ہو جائے

بعض اوقات کسی ایک حادثے کا اثر ان کے ذہن پر اتنا گہرا پڑا کہ وہ صاف صاف کہے بغیر نہ رہ سکے:

آنکھیں ابھی کچھ اور بھی ہیں منتظر — چھپرا کی قتل گاہ کا منظر لیے ہوئے

ملک کے ان حالات سے اُکتا کر آجکل ہیں وہ قطعی بے رُوک ہو گئے۔ زخمِ جگر کھول کر رکھ دیے ہیں:

فکرِ جمیل خوابِ پریشاں ہے آج کل — شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

سازِ حیات، سازِ شکستہ ہے ان دنوں　　　بزمِ خیالِ جنتِ ویراں ہے آج کل

یہ پہلے دو شعر نہیں بلکہ باقی تینوں اشعار بھی اس وقت کے حالات کے اسی طرح مرثیہ خواں ہیں۔ جگر کے حساس دل نے ماحول کی ہر ایک تلخی کو محسوس کیا۔ مخلص رہبرانِ قوم کی بے بسی کو بھی سمجھا، قومیت کے نام پر شیطنت کا غلبہ بھی دیکھا اور کانٹے کسی کے حق میں کسی کو گل و ثمر والا اہتمام گلستاں بھی۔ آبا و اجداد سے جو مقدس ترکہ اردو زبان کی شکل میں ملا تھا، اسے بھی تنگ نظری کا شکار پایا۔ دل کی اذیت نے طنز کی شکل اختیار کر لی :

ہونے کو یوں تو روز نئی ہیں عنائیتیں　　　اردو زباں پر خاص کر احساں ہے آجکل

ان ابتر شب و روز کے باوجود اربابِ حل و عقد خاموش نظر آئے۔ کچھ کے نزدیک یہ خاموشی مصلحت وقت کا تقاضا ہی ہوئی تھی۔ جگر کے لئے یہ تاویل نمک پاشی کے مصداق تھی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ شائستگی کے بھیس میں روحِ زندگی رواں دواں ہے، ایسے آڑے وقت پر بھی اگر ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ رہا جائے، تو وہ زندگی کیا!

اس سے تو خودکشی ہی غنیمت ہے اے جگر　　　وہ مصلحت جو پیشۂ مرداں ہے آج کل

پھر ایک منحوس گھڑی آئی جبکہ گاندھی جی کی شہادت کا سانحہ پیش آیا۔ جگر نے گاندھی جی کی یاد میں، جس خلوص عقیدت کا اظہار کیا ہے وہ اپنی آپ مثال ہے۔ بالخصوص جب ہم اس وقت کے حالات کے پیش نظر جگر کا یہ خراجِ عقیدت پڑھیں تو بین السطور بہت کچھ نظر آئے گا۔ انھیں قومی زندگی میں بہتیرے ایسے افراد نظر آئے 'جو گاندھی جی کا نام زبان پر من کے اندر چور' رکھتے تھے۔ 'آوازیں' دراصل جگر کی اپنی آوازیں ہیں جنھیں ندائے وقت سمجھنا چاہیئے۔ یہاں پر انھوں نے صاف طور پر پکار کر کہا :

چمن کے مالی اگر بنا لیں موافق اپنا شعار اب بھی　　　چمن میں آسکتی ہو پلٹ کر، چمن سے روٹھی بہار اب بھی

کوئی یہ چپکے سے ان کو پوچھے کہاں گئے آپ کے وہ دعوے　　　نچوڑتا ہی لہو غریبوں کا دستِ سرمایہ دار اب بھی

انھوں نے صرف رہبرانِ قوم کو ہی متوجہ نہیں کیا بلکہ اہلِ وطن سے بھی کہا :

اگرچہ آزادئ وطن کو گزر چکا ایک سال کامل　　　مگر خود اہلِ وطن کے ہاتھوں فضا ہے ناسازگار اب بھی

اسی کا ہے نام اگر ترقی تو اس ترقی سے باز آئے　　　کہ خونِ مخلوقِ سے خدا کی زمیں ہے لالہ زار اب بھی

یہی وہ زمانہ ہے جبکہ دیس کے کج فہم اور خود غرض لوگوں کے طرزِ عمل سے پوری ایک جماعت کی باعث

ہراساں اور پریشان تھی۔ نہ حال کا اطمینان تھا اور مستقبل میں امید کی کوئی کرن جھلملاتی دکھائی دیتی تھی۔ تعصب اور جذبات کا غلبہ تھا۔ اس وقت بہت سے لوگوں پر عرصۂ حیات "تنگ ہوتا دکھائی دیتا تھا مگر ان کا یہ حالِ تباہ بھی تنگ نظر اہل وطن کی نظروں میں خار تھا۔ لہذا جگر نے کہا:

ہمیں ملا کر بھی خاک و خوں میں نہیں ہیں وہ مطمئن ابھی تک　　ہماری لحد کے ذرے ہیں ان کے دامن پہ بار اب بھی

اس نظم میں جس کا عنوان "آوازیں" ہے، انھوں نے بہت کچھ کہہ دیا ہے اگر گوش نصیحت نیوش ہو۔ پھر یکایک انھیں خیال آیا کہ کہیں کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ وہ بالکل مایوس ہیں۔ اس لئے یاد دلایا:

کبھی کبھی غور کرتے رہیے، جگر کا مصرع یہ پڑھتے رہیے　　چمن میں آسکتی ہے پلٹ کر چمن کی روٹھی بہار اب بھی

اور تنگ ظرفیٔ زمانہ کے خیال سے اپنی نیت کا بھی اعلان کیا۔ لیکن پورے وقار کے ساتھ:

جگر کی ہر زندگی محبت، نہیں ہے اس کو کسی سے نفرت　　جگر کے دل میں ہے سب کی عزت جگر ہے یاروں کا یار اب بھی

ان کی نظم نوائے وقت، دراصل نوائے وقت ہے:

اٹھو اٹھو! کہ زندگی ہی زندگی پہ بار ہے　　بڑھو بڑھو! کہ چار سو پکار ہی پکار ہے
وہ وقت ہے کہ علم حق ہے علم شیطنت میں گم　　وہ وقت ہے کہ آدمی کا آدمی شکار ہے
کہاں کے مطربِ غزل کہاں کے شاہدِ چمن　　کہ زندگی تمام تر بساطِ کارزار ہے

اور یہ تک کہنے پر مجبور ہو گئے:

کھلا بابِ زنداں تو کیا اس سے حاصل　　کہ خود زندگی بن گئی قید خانہ

جگر کی اس مایوسی نے جو فسادات اور آزادی سے کچھ قبل اور کچھ بعد کے حالات کی بنا پر پیدا ہوئی تھی کہیں کہیں طنز کی شکل بھی اختیار کر لی جب بھی انھیں جھنجھلاہٹ ہوئی، ان کا لہجہ تند و تیز ہو گیا۔ اکتاہٹ، پریشانی اور بے بسی نے طبیعت میں جو تناؤ اور کھنچاؤ پیدا کیا، اسے کم کرنے کی یہی راہ ملی۔ مثلاً نویدِ آزادی کے ساتھ ساتھ ابتری بڑھی، گھٹی نہیں۔ عوام میں بے چینی پھیلی۔ کچھ دلِ ناصبور اپنے محبانِ وطن کو ہی موردِ الزام قرار دینے لگے۔ جگر کی طبعِ نازک پر یہ تنگ ظرفی بہت گراں گزری۔ وہ بس جھلا گئے:

گلشن کی تباہی پر کیوں رنج کرے کوئی　　الزام جو آنا تھا، دیوانوں کے سر آیا

ہمارے دیس کو کچھ بڑے ممالک کی اعانت درکار ہوئی۔ جگر کی غیور طبیعت کو ٹھیس لگی۔ ذرا تیور ملاحظہ فرمایئے:

رلبط بڑھایا تھا ستاروں کے ساتھ — کم نہ ہوئیں ان سے بھی کچھ ظلمتیں

اس پُر آشوب زمانے میں جھوٹی تسلیاں دینے والوں کی بھی کمی نہ تھی۔ بہت سے اربابِ اقتدار صرف گندم نمائی پر اکتفا کیے ہوئے تھے جگر نے اِن واعظانِ قوم کو براہِ راست مخاطب کیا:

صداقت ہو تو دل سینوں سے کھنچنے لگتے ہیں واعظ

حقیقت خود کو منوا لیتی ہے، مانی نہیں جاتی

یہ بات تو انھوں نے ان سب کی طرف کہی جو نا انصافیِ زمانہ کا شکار ہو رہے تھے لیکن کچھ ایسے بھی تھے جو اپنی سطحی اور وقتی آسودگی سے مطمئن ہو کر، ان کی ذاتی حالت پر ترس کھاتے ہوئے ملے جگر ان احبابِ کم نظر کی نادانی پر کیسے ضبط کرتے۔ بہ عنوانِ شائستہ کہہ ہی دیا:

مرے حال پر رحم فرمانے والے — بہ غور اپنی جانب بھی اے کاش دیکھیں

انھوں نے لوگوں کے قول و فعل میں تضاد پایا تو اس اخلاقی پستی پر کُڑھے۔ ان میں بہت سے اکابر بھی شامل تھے۔ اب کیا کہتے، دل کے پھپھولے، دعا بن کے نکلے:

وہ زندگی جو زباں تک ہی پائی جاتی ہے — خدا کرے کہ حقیقت میں زندگی بن جائے

انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ اہلِ وطن جامِ آزادی سے سرشار ہوئے بغیر ہی بہکنے لگے۔ اس تنگ ظرفی پر انھیں ملال بھی ہوا اور مستقبل کی طرف سے اندیشہ بھی۔ یہ کہہ کر اپنی خلش مٹائی اور دوسروں کو ٹوکا:

نہ تابِ مستی، نہ ہوشِ ہستی کہ شکرِ نعمت ادا کریں گے

خزاں میں جب ہے یہ اپنا عالم، بہار آئی تو کیا کریں گے

مذہب کے نام پر بہت سے لوگ زمانے کے ہاتھوں کچھ ایسے ستائے گئے کہ ہمت ہی پست ہو گئی۔ انھوں نے فرقہ پرستی کو اپنی بدحالی کا ذمہ دار سمجھا اور سچی کے پاس جانے کی جرأت ختم کر بیٹھے۔ جگر کو اس رویے میں جوہرِ ذاتی کی توہین نظر آئی۔ اور انھوں نے پھر ٹوکا:

کہ زندگی خود حسین ہوگی تو پھر توجہ وہ کیا کریں گے — خیلم کارانِ عشق سوچیں، یہ شکوہ سنجانِ حُسن سمجھیں

جب رقصِ ابلیس ہر چہار طرف نظر آیا تو زبان سے نکلا :

حسن و صورت کے نہ حسرت کے نہ ارمانوں کے　　اُف کہ انساں ہیں مارے ہوئے انسانوں کے

ایسے حالات میں 'عظمت رفتہ' کا دھیان آیا تو کچھ 'مسدس حالی' والی کیفیت طاری ہوگئی :

اسی کشتی کو نہیں تابِ تلاطم صد حیف
جس نے منہ پھیر دئے تھے کبھی طوفانوں کے

بہت سے اہلِ وطن 'نازِ بے جا' میں مبتلا نظر آئے۔ اپنے آپ کو بزعم خود 'باعثِ رونقِ گلستاں' سمجھنے والوں کی کمی نہ تھی۔ جگر کو ان اوچھی طبیعتوں کے قرینے گراں گزرنا لازمی تھے۔ خودداری مانع تھی کہ اپنے منہ سے اپنی تعریف کی جائے مگر یہ بھی بتانا ضروری تھا کہ 'حبِ وطن' میں ہم کسی سے پیچھے نہیں' صرف اپنی ہی طرف سے بالکل شخصی طور پر نہیں بلکہ وطن عزیز کی ایک قابلِ لحاظ آبادی کی طرف سے :

پھولوں کو نازِ حُسن اگر ہے تو ہو جگر　　کانٹے بھی ہیں غرورِ گلستاں لئے ہوئے

فسادات میں جس طرح انسانی اقدار ملیامیٹ ہوئیں ان کی چُبھن کا اندازہ تو ہم کر چکے ہیں لیکن جب یہ احساس طنز یہ شکل اختیار کر لیتا ہے تو کچھ اور دو آتشہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً :

جہل خرد نے دن یہ دکھائے　　گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے

رہبرانِ قوم میں کچھ ایسے بھی نظر آئے جو رہزن کہلانے کے مستحق تھے۔ جگر کو طیش آیا۔ بد دعا نکلی :

بہ شکل ناخدا جس میں ہی اب تک جعفر و صادق
وہ کشتی غرق ہو جائے تو بیڑا پار ہو جائے

لیکن جگر نے طنز پر تکیہ نہیں کیا اور نہ مایوسی میں آسودگی تلاش کی۔ یہ محض وقتی احساسات بن کر ان کی شاعری میں نمودار ہوئے۔ دراصل ان کا میلانِ طبع اثباتی تھا۔ اور وہ بڑے حق بیں تھے۔ یہی ان کی عالی ظرفی اور بلندیٔ کردار کی علامت ہے۔ انھوں نے یاس کے تیز جھونکوں کے دوران میں بھی نہ امید کا دامن چھوڑا اور نہ صداقت سے منہ موڑا۔ وہ حق گو بھی رہے اور حقیقت پسند بھی۔ انھوں نے بربریت کے مظاہرے دیکھے لیکن شعاعِ امید

سے اپنے چشم و دل کو روشن رکھا۔ فسادات کے اس تاریک دور میں بھی ان کی آنکھیں کھلی رہیں۔ حیوانیت کی چیرہ دستیوں کے ساتھ ساتھ، انھیں محبت کے پیکر بھی وہ دیکھ سکے اور انھوں نے نہ صرف اپنی ڈھارس بندھائی بلکہ اوروں کو بھی یہ مژدہ سنایا:

میں نے انھیں تاریک فضاؤں میں بھی اکثر دیکھے ہیں برستے ہوئے انوارِ محبت

اور تلقین کی:

خلوصِ عشق و یقینِ حیات کے ہمراہ جنونِ شوق و فسونِ نگاہ پیدا کر

یہی زمیں ترا مسکن، یہی ترا مدفن اسی زمیں سے تو مہر و ماہ پیدا کر

ان کا حقیقت شناس دل، آزادی کے نام سے مطمئن ہونے والا نہ تھا۔ انھوں نے اہلِ وطن کو مختلف قیود میں جکڑا ہوا دیکھ کر انھیں اس صورتِ حال سے آگاہ کرنا، اپنا فرض سمجھا:

قفس توڑ کر مطمئن ہو نہ بلبل قفس صورت آشیاں اور بھی ہیں

انھوں نے اپنے مزاج کو حرماں نصیب نہ ہونے دیا اور برابر اپنے آپ کو سمجھاتے رہے:

طولِ غمِ حیات سے گھبرا نہ اے جگر ایسی بھی کوئی شام ہے جس کی سحر نہیں

جب انسانوں نے درندوں کو مات کر دیا، اس وقت بھی انسان کے خلق اُنس پر ان کا ایمان باقی رہا:

وہی ہے روحِ محبت، وہی ہے جسمِ وفا بدلتا رہتا ہے لیکن مذاقِ پیراہن

صدق دلی کا یہ عالم ہے کہ اپنی ذرا سی چوک بھی گوارا نہیں۔ خراب حالات نے بددل بنایا تھا جب حالات بدلتے دیکھے تو فوراً اعتراف کیا:

عشق کی بربادیوں کو رائیگاں سمجھا تھا میں
بستیاں نکلیں جنھیں ویرانیاں سمجھا تھا میں

حق گوئی میں کسی وقت بھی تکلف سے سروکار نہیں رکھا۔ اگر حالات کی سختی نے 'بھاگ مسافر، میرے وطن سے، میرے چمن سے'، کہلوانے پر مجبور کیا تو اسی کے ساتھ ساتھ وطن مالوف کی محبت عناں گیر بھی رہی:-

کیا بتاؤں کس قدر زنجیرِ پا ثابت ہوئے چند تنکے جن کو اپنا آشیاں سمجھا تھا میں

بربادی اور تباہی کے عالم میں ہر چند مایوسی نے کمندیں ڈالیں لیکن وہ نکل ہی بھاگے۔ ان کی روشن ضمیری

ہمیشہ کام آئی اور وہ عارفانہ شان سے کہتے ہوئے ملے:

یہ صحن و روش، یہ لالہ و گل ہونے دو جو ویراں ہوتے ہیں
تخریب جنوں کے پردے میں تعمیر کے ساماں ہوتے ہیں
منڈلائے ہوئے جب ہر جانب طوفاں ہی طوفاں ہوتے ہیں
دیوانے کچھ آگے بڑھتے ہیں اور دست و گریباں ہوتے ہیں

ان کو یوں تو یقینِ کامل تھا کہ شہیدانِ وطن کا خون رائیگاں نہ جائے گا لیکن ان کا دل حق نگر یہ بھی کہتا تھا کہ اگر اس خون سے تعمیرِ وطن ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا:

یہ خون جو ہے مظلوموں کا، ضائع تو نہ جائے گا لیکن
کتنے وہ مبارک قطرے ہیں جو صرفِ بہاراں ہوتے ہیں

انھوں نے اپنی ہمت بھی خود بندھائی اور دوسروں کا حوصلہ بھی بڑھایا:

جو طوفانوں میں پلتے رہے ہیں — وہی دنیا بدلتے رہے ہیں
نکھرتا آرہا ہے رنگِ گلشن — خس و خاشاک جلتے رہے ہیں
چراغِ دیر و کعبہ اللہ اللہ — ہوا کی زد پہ جلتے رہے ہیں

کبھی مذاق مذاق میں پتے کی بات کہہ کر مایوس ہونے سے بچانے کی کوشش کی:

یہ فتنے جن سے اک دنیا ہے نالاں — انھی سے گرمیٔ بازار بھی ہے
جگر ان حادثات سے گھبرا نہ جانا — یہی تو ہے دلچسپیوں کا زمانہ

اور اسی مطمحِ نظر کے تحت اپنی زندگی کے مقصد کی وضاحت کی:

مرا تو فرض چمن بندیٔ جہاں ہے فقط — مری بلا سے بہار آئے یا خزاں گزرے

'نوائے وقت' میں ماحول کی پستی کا ذکر کرنے کے بعد بھی یہی کہا:

زمیں کو روندتے ہوئے، صفوں کو چیرتے ہوئے — بڑھے چلو، بڑھے چلو! یہ وقت کی پکار ہے

'اعلانِ جمہوریت' تو عنوان ہی صاف بتا رہا ہے کہ میں کیا ہوں۔ یہاں پر انھوں نے بڑے خلوص کے ساتھ اربابِ اقتدار اور ابنائے وطن کی خدمت میں چند گزارشات پیش کی ہیں۔ انھیں اپنے

منصب سے آگاہ کیا ہے اور جمہوریت کے تقاضوں کی طرف رجوع کرایا ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے اور بھی ضروری تھا کہ حالات دگرگوں تھے :

چمن چمن ہی نہیں جس کے گوشے گوشے میں
کہیں بہار نہ آئے کہیں بہار آئے

یہ میکدے کی، یہ ساقی گری کی ہے توہین
کوئی ہو جام بکف، کوئی شرمسار آئے

لہذا جتایا :

خلوص و ہمتِ اہلِ چمن پہ ہے موقوف
کہ شاخِ خشک میں بھی پھر سے برگ و بار آئے

نہ ہو عام مسرت، محال ہے اے دوست
کہ زندگی کو کسی حال میں قرار آئے

اور ان کا یہ ایمان رہا :

نمودِ صبح کاذب ہی دلیلِ صبح صادق ہے
افق سے زندگی کی دیکھ وہ ابھری کرن ساقی

حق گوئی ان کا شعار تھا۔ اس وقت کے سیاسی حالات کے پس منظر میں یہ شعر پڑھیے :

اس جہد و طلب کی دنیا میں کیا کارِ نمایاں ہوتے ہیں
ہم صرف شکایت کرتے ہیں، وہ صرف پشیماں ہوتے ہیں

دنیا کے حالات پر جب ان کی نظر گئی تو سائنس کی حیرت انگیز ترقی کے باوجود انھیں انسان کی اخلاقی پستی نظر آئی۔ ایک طرف آسائش و آرام کا سامان فراہم ہوتے دیکھا تو دوسری طرف مہلک ہتھیاروں کی تیاریاں بھی نظر آئیں۔ فوراً زبان سے نکلا :

تسخیرِ مہر و ماہ مبارک تجھے مگر
دل میں اگر نہیں ہے تو کہیں روشنی نہیں

جب انسان کو فضا اور خلا کی پرواز کے لئے آمادہ پایا تو کہا :

طعن کیا کیا نہ فرشتوں نے کیے تھے جس پر
عرش پیما ہے وہی خاک کا پتلا ہو کر

دنیا کے مدبرین کو جب جنگ و جدل کے منصوبے باندھتے دیکھا تو اظہارِ تاسف کیا :

عمریں بیتیں، صدیاں گزریں
ہے وہی اب تک عقل کا بچپن

انھوں نے دیکھا کہ دیس کی نعمتیں سب کے لئے نہیں ہیں کوئی نادار ہے اور کوئی مال دار، تو زبان سے نکلا:

پھول کھلے ہیں گلشن گلشن　　　لیکن اپنا اپنا دامن

.زادی کی نااہلی نے شمعِ آزادی کی لو بہت دھیمی کر رکھی تھی۔ ان کی صاف گو، اور حق گو، طبیعت بغیر کہے نہ مانی:

کام ادھورا اور آزادی　　　نام بڑے اور تھوڑے درشن

شمع ہے لیکن دھندلی دھندلی　　　سایہ ہے لیکن روشن روشن

لیکن اظہارِ حقیقت سے انھیں آسودگی نہیں ہوتی۔ وہ انکشاف بھی کرتے ہیں اور اپنی بالغ نظری کا گلہ بھی:

وسعتِ فکر و نظر بھی نہ مجھے راس آئی　　　ہر تبسم پہ جراحت کا گماں ہوتا ہے

سازِ مطرب کے کرشموں پہ نہ جانا کہ یہاں　　　اکثر اس طرح سے بھی رقصِ فغاں ہوتا ہے

آخر کار اس وقت کے معاملات اس حقیقت کو سامنے لے آتے ہیں:

کارگہِ حیات میں اے دوست　　　یہ حقیقت مجھے نظر آئی

ہر اُجالے میں تیرگی دیکھی　　　ہر اندھیرے میں روشنی پائی

قحطِ بنگال نے ہر ایک حساس طبیعت کو جھنجھوڑا۔ جگر کا دل بھی خون ہوا۔ جو لکھا، انسانی ہمدردی میں لکھا اور ان کی دُور رس نگاہوں نے ان حالات کا انجام بھی بھانپ لیا۔ اس ناگہانی افتاد کی :وٹ میں انھیں سامراجی نظام کا تختہ اُلٹتا نظر آیا:

اربابِ وطن کو میری جانب سے ہو مژدہ　　　اغیار کو مجبورِ سفر دیکھ رہا ہوں

ان کی حق گوئی و حق شناسی "ساقی سے خطاب" میں پوری فن کاری کے ساتھ نمایاں ہے۔ ہر شعر ایک حقیقت ہے، اعلان ہے۔ اس سائنسی دَور کی عظمتوں کے باوجود عالمِ انسانی میں جو انتشار پھیلا ہوا ہے، اس سے اپنی بات کا آغاز کرتے ہیں:

وہی انسان جسے سرتاجِ مخلوقات ہونا تھا　　　وہی اب سی رہا ہے اپنی عظمت کا کفن ساقی

لباسِ حریت کے اُڑ رہے ہیں ہر طرف پُرزے　　　بساطِ آدمیت ہے شکن اندر شکن ساقی

کہیں خود حُسن رہ جائے نہ ذوقِ ملکیت بن کر　　　کہیں خود عشق ہو جائے نہ محدودِ وطن ساقی

اپنے معاشرے کی پست حالت کو بسا اوقات انھوں نے بے کم وکاست یونہی شعر کے قالب میں پیش کر دیا ہے ؛

شرافت کا میعار، افراطِ دولت　　صداقت کی معراج، لفظی ترانہ
زبانوں پہ اصلاحِ قومی کے نعرے　　مگر طبیعتیں بیشتر مفسدانہ

جگر کی اس تمام حق شناسی وحق گوئی میں اُن کی خود اعتمادی کو بڑا دخل تھا۔ انھیں ہر حال میں اپنی ذات پر بھروسہ رہا اور خودی کی تذلیل کبھی گوارا نہ کی۔ وہ رہینِ منت ہو کر زندگی گزارنا نہیں چاہتے تھے اگرچہ حوادثِ زمانہ کے تقاضے کچھ ایسے ہی تھے۔ جب اپنے گرد و پیش دیکھتے تو قدم ڈگمگانے لگتے۔ اسی لئے اپنے اندر خود اعتمادی پیدا کرنے کی خاطر اور دوسروں کے لئے مثال قائم کرنے کی غرض سے برابر اقدار کی بات کرتے۔ جگہ بہ جگہ ان کے کلام میں یہ تاثر موجود ہے مثلاً

جان فدا اس پہ کہ جس نے جگر　　زلیست بسر کی نہ سہاروں کے ساتھ
وہ ہیں ہی کہ جن کے ہاتھوں نے　　گیسوئے زندگی سنوارے ہیں

جو حق کی خاطر جیتے ہیں، مرنے سے کہیں ڈرتے ہیں جگر
جب وقتِ شہادت آتا ہے، دل سینوں میں رقصاں ہوتے ہیں

ہم کو مٹا سکے، یہ زمانے میں دم نہیں　　ہم سے زمانہ خود ہے، زمانے سے ہم نہیں
میری زباں پہ شکوۂ اہلِ ستم نہیں　　مجھ کو جگا دیا، یہی احسان کم نہیں
پھول بسر کرتے ہیں خاروں کے ساتھ　　کھیلتے ہیں ہم بھی شراروں کے ساتھ
زندگی ہے نام جہد و جنگ کا　　موت کیا ہے؟ بھول جانا چاہیئے

تو بہ زمانہ بساز، کی بات سنی تو پھر اپنے مسلک کی وضاحت کی :

ہر ایک غم کو فروغ دے کر یہاں تک آراستہ کریں گے　　وہی جو رہتے ہیں دور ہم سے، خود اپنی آغوش وا کریں گے
جدھر سے گزریں گے سرفروشانہ کارنامے سنا کریں گے　　وہ اپنے دل کو ہزار روکیں، مری ہمت کو کیا کریں گے
ہم اپنی کیوں طرزِ فکر چھوڑیں، ہم اپنی کیوں وضعِ خاص چھوڑیں　　کہ انقلاباتِ نو بہ نو تو ہوا کئے ہیں، ہوا کریں گے

اس طرح جگر نے ملک کے مظلوم طبقے کی ترجمانی کی۔ صاف صاف بتایا کہ ہمیں اپنی صداقت پر بھروسہ ہے۔ ہم محبت کے بندے ہیں۔ ہم سے اپنی زبان، تہذیب اور روایات ترک کرنے کی بات نہ کرو۔ یہ چھوٹے دل کی باتیں ہیں۔ جگر نے یہ سب کچھ کہا اور پورے اعتماد کے ساتھ کہا اور ساتھ ہی ساتھ احباب کے سامنے ایک نصب العین بھی رکھا۔ اور جتایا کہ تمھارا فرض کیا ہے:

خود اپنے سوزِ باطن سے نکال اک شمع غیر فانی
چراغ دیر و حرم تو لے دل جلا کریں گے، بجھا کریں گے

جب مہاتما گاندھی کی آواز کو ملک کی ایک بڑی تعداد مجذوب کی بڑ سمجھنے لگی، اس وقت جگر کا اپنا ایمان بھی متزلزل ہو گیا، لیکن جلد ہی وہ خود کو ہوش میں لے آئے:

ناز ہے شاہدِ فطرت کو بھی جس پر ہمدم — وہ چمن سب ہیں لگائے ہوئے دیوانوں کے

تغیرات زمانہ سے گھبراہٹ ہوئی تو پھر دہرایا:

انقلابات سے کیا خوف کہ ہر عزم جگر — اسی آغوش میں پلتا ہے، جواں ہوتا ہے

انھیں اپنے منصب کا بھی پورا احساس رہا۔ اس منحوس دور سے گزرے لیکن اپنی ہستی کو فراموش نہیں کیا۔ آلامِ روزگار کے مارے ہوئے اپنے حرماں نصیب بھائیوں سے پکار کر کہا:

آگے قدم بڑھائیں جنھیں سوجھتا نہیں — روشن چراغِ راہ کیے جا رہا ہوں میں

جن لوگوں نے ان پر اعتبار نہیں کیا اور ان کی عظمت کے قائل نہ ہوئے یا انھیں سمجھ ہی نہ سکے ان سب کو بھی انھوں نے مخاطب کیا اور اپنی شانِ امتیاز بتائی:

میں وہ صاف ہی نہ کہہ دوں جو ہے فرق مجھ میں تجھ میں
ترا درد، دردِ تنہا، مرا غم، غمِ زمانہ

جگر نہ رہ جائے بن کر آہ جو اک کاسۂ سائل — نہ ایسی شاعری اپنی، نہ ایسی زندگی اپنی

اتنا کہہ کر وہ چپ نہیں ہو گئے بلکہ واضح طور پر انھوں نے رہنمائی بھی کی۔ وہ جانتے تھے کہ گمراہ کن حالات کا سامنا ہے۔ پریشان طبیعتیں اور سہمے ہوئے دل بڑی جلدی بدگمان بھی ہو جاتے ہیں اور مایوس بھی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اہلِ غرض اور فتنہ پرور سارے ملک میں چھائے ہوئے ہیں

ایسے وقت میں انھوں نے "گزر جا" میں بازیچہ ارباب سیاست سے نہ صرف نفرت و بیزاری کا اظہار کیا بلکہ ہر آک گمرہی کی طرف سے متنبہ کیا اور واضح الفاظ میں لائحہ عمل سامنے رکھا۔ ان سب کے لیے جو اُن کی طرح زمانہ کے ہاتھوں بیزار تھے:

ہر تنگ نظر اہلِ صحافت سے گزر جا　　　ہر سادہ و پُرکار عبارت سے گزر جا

الفاظ نہیں دام ہیں یہ مکر و دغا کے　　　ہر سادۂ و پُرکار عبارت سے گزر جا

اس پوری نظم میں اس وقت کے پیش نظر لطیف اشاروں میں نہ صرف بے راہ روی سے بچنے کو کہا ہے بلکہ راہ راست پر گامزن ہونے کی تلقین بھی کی ہے:

سر تا بقدم پیکرِ ایثار و عمل بن　　　مرحلۂ شکر و شکایت سے گذر جا

پھر ایک وقت وہ آیا جب انھوں نے وطن کو راہِ راست پر گامزن دیکھا۔ اس وقت بڑی سادگی اور نیک نفسی سے رہبرانِ قوم کی خدمت میں خراجِ عقیدت پیش کیا:

سعیٔ مآلِ فکر و نظر دیکھتا ہوں میں　　　منزل رواں دواں ہے جدھر دیکھتا ہوں میں

جگر کے اس اثباتی میلانِ طبع اور خود اعتمادی کا راز، ان کی حب الوطنی میں پنہاں ہے۔ وہ اپنے وطن کے سچے پرستار تھے۔ انھیں فرقہ وارانہ فسادات اور اس زمانے کے خراب حالات نے بددل کیا اور جب انھیں ہر طرف بربادیٔ چمن کے سامان نظر آئے اور انھوں نے ہر شے میں کسی شے کی کمی پائی، وہ تلخیٔ دوراں کا بُری طرح شکار ہو گئے۔ مایوسی اور بیزاری طبیعت میں دخل کرنے لگی، لیکن یہ کیفیت ان کا مزاج نہ بن سکی۔ ان کی شخصیت نے حالات کے آگے سپر نہیں ڈالی بلکہ ان کا جوہرِ ذاتی اُبھرا انھوں نے دلِ ناداں کو بہر طور سمجھایا اور رادرگیتی کے سچے سپوت ہونے کی بنا پر گمراہ ہونے سے بچ نکلے جب انھیں انسان گھٹتے ہوئے اور سلئے بڑھتے ہوئے دکھائی دئے تو ان کی چشم بصیرت نے اسے فریبِ نظر سے زیادہ اہمیت نہیں دی اور وہ آخر کار خود کو سمجھانے اور دوسروں کو بتانے میں کامیاب ہوئے:

پھول وہی، چمن وہی، فرق نظر نظر کا ہے　　　عہدِ بہار میں تھا کیا، دورِ خزاں میں کیا نہیں

مگر انھوں نے دیکھا کہ ان کا یہ جذبہ سادہ لوحی پر محمول کیا گیا۔ ان کے اپنے بھی ان کو ناعاقبت اندیش

بگھ بیٹھے۔ ان اہلِ دنیا کے نزدیک ابرے کو بُرا ہی کہنا مناسب بات تھی اور بدسے اجتناب برتنا ہی سمجھ داری تصور کیا جا سکتا تھا۔ جگر نے ایسے آڑے وقت میں اپنے آپ کو بھی سمجھایا اور تنقید بین نظروں کو بھی جواب دیا:

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز　　کانٹوں سے بھی نباہ کیے جا رہا ہوں میں

ساقی سے خطاب' میں ان کا جذبۂ وطنیت ایک والہانہ انداز اختیار کر گیا ہے اور وہ کہہ اٹھتے ہیں:

یہ سنتا ہوں کہ پیاسی ہے بہت خاکِ وطن ساقی
خدا حافظ چلا میں باندھ کر سر سے کفن ساقی

اور آخر میں وارفتگی کا عالم طاری ہو جاتا ہے اور وہ اپنے ساقیِ میخانۂ روحانیت کے حضور میں بس یہی ایک آرزو لیے ہوئے نظر آتے ہیں:

بدہ جامِ مے باقی کہ در جنت نہ خواہی یافت
سوادِ ساحلِ گنگا و گلگشتِ جمن ساقی

جگر کی دیدہ وری اپنے وطن کے حالات تک ہی محدود نہیں رہی۔ انھوں نے ہندوستان کے سیاسی حالات کا بھی جائزہ لیا اور دنیا کے اسبابِ انتشار پر نظر ڈالی۔ پھر وہ اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ ساری خرابی کی جڑ، امتیازِ رنگ و نسل اور وطنیت کا محدود تصور ہے۔ ان کی وسعت نظر نے جغرافیائی حدود سے بالاتر ہو کر دیکھنے پر اکسایا اور وہ وطن پرستی سے گزر کر انسان دوستی کی منزل میں اتر آئے۔ اس نقطۂ نظر کا نمایاں اظہار ان کی نظم 'گذر جا' میں موجود ہے:

انسانیتِ عام کے مرکز کی بنا ڈال　　ہر ناقص و محدود جماعت سے گذر جا
ہے خدمتِ مخلوق ہی نعم البدل اپنا　　کر خدمتِ مخلوق، تجارت سے گذر جا
تو حسن کے اک دائرۂ کُل کی طرف آ　　ہر جزوی و محدود حقیقت سے گذر جا
انسان بن انسان، یہی ہے تری معراج　　رنگ و وطن و قوم کی لعنت سے گذر جا

انھوں نے ہر ایک کو اپنی عینک کا پابند پایا اور تعلیم و تربیت کی بھٹّی سے حسبِ خواہش اور حسبِ ضرورت سانچوں میں ڈھلے ڈھلائے انسان نکلتے دیکھے۔ اس پابندیٔ حالات و خیالات میں انھیں

اشرف المخلوقات کی سراسر تذلیل نظر آئی:

بشر کی یہ پستی ارے توبہ توبہ   زمانے کا آقا، غلامِ زمانہ

وہ برابر بلند ہمتی کا درس دیتے رہے۔ حسن عمل اور حسن یقین کی تلقین کرتے رہے۔ اک جنت جاوید پیدا کرنے کے لئے اُبھارتے رہے کیونکہ ان کے سامنے زندگی کا واضح تصوّر موجود تھا:

عشق ہی زندہ و پایندہ حقیقت ہے جگر   عشق کو عام بنا، ذوقِ یقین پیدا کر

یہ جائزہ نامکمل بھی ہے اور شخصی تصورات کا پابند بھی مگر ان کوتاہیوں کو دور کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے، کیونکہ 'آتش گل' کی شاعری میں جگر کی شخصیت کا پرتو اور ماحول کا عکس تلاش کرنا تھا، اس غرض سے اس مجموعے کے متعدد اشعار کو ان کے پس منظر میں بقدر ظرف دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ 'آتشِ گل' میں آزادی سے قبل کے تفرقے سے متاثر ہو کر بھی کہا گیا ہے اور آزادی کے بعد رونما ہونے والے انسانیت سوز واقعات بھی جگر کا حساس دل، خونِ جگر سے برابر رقم کرتا چلا گیا ہے۔ کبھی وہ کرب سے چیخ اٹھے اور لہجہ سخت ہو گیا اور کبھی آس کے دامن کی گرفت بالکل ڈھیلی پڑ گئی۔ لیکن ہر بار انھوں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور روشن پہلو کو پیش نظر رکھ کر اپنے آپ کو تازگی بخشی۔ اس رویے کو اختیار کرنے میں ان کی حب الوطنی بڑی کام آئی، اور ان کی حق شناس نظریں انجام کار انسان دوستی پر جا کر ٹکیں۔ بس یہی تمام کیفیات 'آتشِ گل' کے اشعار میں جھلکتی ہیں۔ کبھی پس پردہ اور کبھی منظر عام پر۔ کہیں اشاروں میں اور کہیں پوری بے تکلفی کے ساتھ۔ کسی وقت زیرِ لب اور کسی وقت بہ بانگِ دہل۔ سچ تو یہ ہے کہ انھوں نے اپنے بارے میں ذرا بھی غلط نہیں کہا:

تکلف سے تصنع سے بری ہے شاعری اپنی
حقیقت شعر میں جو ہے وہی ہے زندگی اپنی

"آتشِ گل' اس شعر کی تائید بھی ہے اور جگر کی زندگی کا آئینہ دار بھی۔ اس بات کا سب سے بڑا ثبوت یہی ہے کہ شعلہ طور' میں اس جہان کی خبر اس طرح نہ ملے گی۔ انسان یوں تو بذاتِ خود اک محشر خیال ہے، لیکن اس کی شخصیت اپنے ماحول کے ردِ عمل سے ہی بنتی ہے۔ جگر نے کسی مخصوص سیاسی مسلک یا

فلسفیانہ نظریئے کے لئے اپنی شاعری کو فرضِ کفایہ کے طور پر پیش نہیں کیا۔ وہ 'ترقی پسندی' 'افادی ادب' اور 'قومی شاعری'، جیسی ٹکسالی اصطلاحات کے رعب میں بھی نہیں آئے۔ اور یہی ان کے جوہر ذاتی یا نفسی وجود کا کرشمہ ہے جو انھیں دوسروں سے نہ صرف ممیز کرتا ہے بلکہ ممتاز و نمایاں اور گرانقدر بھی بنا دیتا ہے۔ 'آتشِ گل' کا خالق، انسان دوستی کا علم بردار ہے۔ وہ حقیقت پسند بھی ہے اور ترقی پسند بھی۔ تنگ نظری، تعصب اور محدود عقائد کے خلاف جد و جہد بھی کر رہا ہے اور راہِ نیک کی نشان دہی بھی۔ اس نے اپنے افکار سے اہلِ وطن کو چونکایا بھی، کبھی نرم لہجے میں، کبھی درشتی سے لیکن اس کا خلوصِ نیت بہرحال شامل رہا۔ 'آتشِ گل' کی شاعری کے عہد میں ان کی شخصیت کا ایک نمایاں موڑ آیا۔ وہ چیزے دیگر، بن گئے۔ ماحول کے ردِ عمل سے ان کے جوہر کھلے اور ان کی شخصیت نے جلا پائی۔ اس آب و تاب کے ساتھ انھوں نے یہ سب کچھ کہا اور پوری فنی مہارت کے ساتھ کہا۔ اس طرح انھوں نے غزل کے پیرہن کو وسعت دی، اس کو کچھ اور حسین بنایا اور پہلے سے زیادہ کام کی چیز بھی۔ اسی لئے جبکہ اس دور کے بہت سے مقبول و معروف شعرار کا کلام کسی سیاسی جلسے کی ہنگامہ آرائی کی طرح بہت جلد فراموش کر دیا جائے گا، جگرؔ کی 'آتشِ گل' صاحبانِ دل کو برابر گرماتی رہے گی۔

بابر نامہ

پروفیسر محمد مجیب

دنیا میں بہت سے مصور گزرے ہیں، جنھوں نے اپنی تصویر بنائی ہے اور اس طرح اپنی طبیعت کے وہ رنگ دکھائے ہیں جو ہمیں اور کہیں نظر نہیں آتے۔ بابر نامہ میں ہمیں ایک شخصیت کی تصویر ملتی ہے، جو وقفوں کے ساتھ قریب چھتیس برس تک کھینچی جاتی رہی۔ بابر نامہ کو جس حیثیت سے دیکھیے ایک شاہ کار ہے۔ اس کی زبان چغتائی ترکی کا نمونہ ہے۔ اسے بابر نے اپنے ہاتھ سے لکھا اور اس کا خط اتنا خوب صورت تھا کہ وہ خط بابری کے نام سے مشہور ہوا۔ بابر کی طبیعت ایسی نہیں تھی کہ وہ کسی کام کو روز پابندی کے ساتھ کرتا رہتا۔ روزنامچے کے لحاظ سے بابر نامہ مکمل نہیں ہے، بابر نے اپنی سوانح عمری ۱۴۹۴ء سے شروع کی ہے، جب وہ بارہ برس کی عمر میں فرغانہ کا بادشاہ ہوا اور غالباً اس کے چند سال بعد سے وہ ایک یادداشت لکھنے لگا، جس کی مدد سے اس نے بعد میں کتاب مرتب کی۔ جو کچھ یادداشت میں نہیں تھا، وہ کتاب میں بھی رہ گیا، لیکن اس سے بابر نامہ کی تاریخ اور ادبی قدر کم نہیں ہوتی، اس کے کئی زبانوں میں ترجمے ہوئے ہیں اور ہر ملک اور ہر مذاق کے لوگ اس کی سادگی، صفائی اور بے تکلفی کی تعریف کرتے ہیں۔

اپنے باپ عمر شیخ مرزا کا خاکہ بابر نے اس طرح کھینچا ہے: ٹھگنا قد، چہرے کا رنگ سرخ، چھوٹی گھنی ڈاڑھی، بدن بھاری، مزاج ذرا چالاک، کپڑے بہت چست پہنا کرتے تھے۔ چنانچہ بند باندھتے تھے تو پیٹ سکیڑ لیتے تھے، اکثر ایسا ہوتا کہ باندھنے کے بعد بدن چھوڑ دیتے یا سانس لیتے تو بند ٹوٹ جاتے تھے..... وہ خاصے پڑھے لکھے تھے، خمستین، مثنوی اور تاریخ کی کتابیں ان کی نظر سے نکلی ہوئی تھیں۔ شاہ نامہ کو بہت دیکھا کرتے تھے، اگرچہ موزوں طبیعت تھی، مگر شعر گوئی پر توجہ نہ کرتے تھے..... وہ سخی بھی بہت تھے اور سخاوت ہی جیسی ان کی اور خصلتیں بھی تھیں، خوش مزاج، فصیح

شیریں کلام اور بہادر آدمی تھے .... تیر انداز اوسط درجے کے تھے، گھونسا زبردست مارتے تھے، یہ ممکن نہ تھا کہ وہ کسی کو گھونسا ماریں اور گھونسا کھانے والا گر نہ پڑے، ملک گیری کے خیال میں بہت دوستوں سے چھُٹ گئی تھی اور بہت سے لوگ ان سے کھٹک گئے تھے۔ شروع میں بہت شراب پیتے تھے پھر ہفتہ میں دو ایک مرتبہ مے نوشی کا جلسہ ہونے لگا، خوش صحبت آدمی تھے۔ ایسے موقعوں پر مناسب اشعار پڑھا کرتے تھے۔ آخر میں معجون بہت کھانے لگے تھے۔ معجون کھانے کے بعد مزاج چڑچڑا ہو جاتا تھا۔ رحم دل بہت تھے، ہمیشہ چوسر کھیلتے رہتے، کبھی جوا بھی کھیل لیتے تھے"۔

بابر ایسے باپ کا بیٹا تھا، باپ کے بارے میں اس نے جس طرح سے لکھا ہے اس سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ اپنے بارے میں بھی اس نے بے تکلفی سے، گویا بغیر تیاری کے، جیسے کوئی کسی دوست کو بات کرتا ہے، سب کچھ بیان کر دیا ہوگا۔ اس نے اپنے وطن فرغانہ، سمرقند، کابل، اور ہندوستان کا جغرافیہ خاصی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ آدمیوں کا ذکر کرتے ہوئے، اس نے خیال نہیں رکھا ہے کہ ہم انہیں نہ جانتے ہوں گے اور یہ مشکل بھی بہت تھا کہ وہ سینکڑوں آدمیوں اور جھگڑوں کا پورا حال لکھے جن سے اس کو واسطہ پڑا مگر اس کا ہمیں خوب اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ ایسی دنیا تھی، جس میں نہ آدمی کا بھروسہ تھا نہ بات کا، جس کی تقدیر میں بے چینی لکھی ہوئی تھی، جس میں مرد آدمی وہ تھا، جو ہر وقت جان اور مال کو داؤ پر لگائے رکھتا اور بے فکری سے دوستوں کے ساتھ مل بیٹھتا، شعر پڑھتا اور شراب پیتا، غفلت اور بیداری، نشہ اور ہوشیاری کی دھوپ چھاؤں کے خوب مزے لیتا۔ بابر پانی پت کی طرف ابراہیم لودھی سے مقابلے کے لئے بڑھ رہا تھا، سب کچھ ہار جیت پر منحصر تھا اور وہ کسی وقت غافل نہیں ہوا لیکن کسی شوق میں کمی نہیں ہوئی۔ وہ ایک ہی سلسلہ میں لکھتا ہے کہ خواجہ کلاں غزنی سے شراب کے کئی اونٹ لایا تھا، اس کا مکان قریب ہی تھا، وہیں محفل جمی۔ پھر اس علاقے کی کھیتی باڑی کا ذکر آتا ہے، وہ کہتا ہے کہ مقام خوب صورت ہے، اس کے قریب دو مرغزار ہیں، پہاڑ چھوٹے چھوٹے ہیں، جہاں آبادی ہے، وہاں مور اور بندر بہت ہیں۔ اس کے بعد جنگ کی کارروائیاں بیان ہوتی ہیں، پھر نظر قدرت کے مناظر کی طرف جاتی ہے، ایک جگہ پسند آئی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے یہاں ایک

چار باغ بنانے کا حکم دیا۔ پھر ایک لڑائی ہوتی ہے، اس کا حال بیان کر کے وہ لکھتا ہے کہ اسی مقام پر ہمایوں نے اپنی ڈاڑھی منڈائی۔ اس کو آج اٹھارہواں سال ہے اور مجھ کو چھیالیسواں اب وہ سر سادہ کے پاس پہنچ گیا تھا۔ یہاں ایک چشمہ تھا، جس میں برابر پانی رہتا تھا۔ اس میں سیر کرنے کے لئے ایک کشتی بنائی گئی، جس میں دالان تھا۔ فضا کا لطف اٹھانے اور ہر طرف نظر دوڑانے کے اصل مقصد پر کوئی بڑا اثر نہیں پڑا۔ پانی پت کے میدان میں اسے کامیابی ہوئی دہلی پر قبضہ ہوا، اس کے بعد آگرہ پر۔ مگر اس وقت گرمی بہت بڑھ گئی تھی، آگرہ کے باشندے مغلوں سے ڈر کر بھاگ گئے تھے، اس لئے بابر کے سرداروں اور اس کی فوج کو غلہ اور چارہ کی کمی سے بڑی تکلیف پہنچی۔ اچھے اچھے سرداروں اور سپاہیوں کے جی چھوٹ گئے۔ اس حالت کو دیکھ کر بابر نے سب کو بلایا اور کہا: "غور کرو، مدتوں کوشش کی، محنت اٹھائی، فوجیں لے کر چڑھائیاں کیں، ہم نے اپنی جان کو اور فوجوں کو لڑائی کی جلتی آگ میں ڈالا۔ خدا نے فضل کیا کہ ایسے ایسے زبردست دشمن زیر کئے، یہ وسیع ملک ہاتھ آیا۔ اس وقت کونسی زبردستی ہے اور کیا دباؤ ہے کہ جس ملک کو اتنی جانیں کاہی سے لیا ہے، اسکو یوں ہی چھوڑ کر چلتے بنیں اور تنگ دستی کی بلا میں پھنسیں؟ جو میرا دوست ہے وہ بیہودہ باتیں منھ سے نہ نکالے، جس کو ٹھہرنے کی تاب نہ ہو اور جو جانا چاہے بسم اللہ کرے۔"

گویا شمالی ہندوستان پر حملہ کر کے وہاں کی حکومت حاصل کرنا کوئی سیاسی پالیسی نہیں تھی، بس کچھ دوست تھے جو خوشی اور رنج میں ایک دوسرے کا ساتھ دینا چاہتے تھے اور لڑائیاں صرف اس وجہ سے لڑتے رہتے تھے کہ اس کے سوا زندگی گزارنے کی اور کوئی صورت نہ تھی۔ تھوڑے دنوں میں حالات اور بدلے، بابر کی بارہ تیرہ ہزار فوج کچھ اور کم ہو گئی۔ ایک طرف رانا سنگرام مقابلے کے لئے تیار ہوا، دوسری طرف پٹھان سرداروں نے جگہ جگہ مخالفت شروع کی، محمد شریف، فوج کے نجومی نے پیشین گوئی کی کہ اس وقت جو لڑے گا وہ نقصان اٹھائے گا۔ کھانوا کی لڑائی سے پہلے معاملہ اتنا نازک ہو گیا تھا کہ بابر کو اپنے گناہ سب یاد آ گئے۔ اس نے شراب ساری پھنکوا دی، سونے چاندی کے پیالے اور صراحیاں خانقاہوں میں اور غریبوں میں

تقسیم کرادیں، شیشے کے برتن سب توڑ ڈالے بابر کے ساتھ اس کے تین سو کے قریب سرداروں نے اس کی طرح توبہ کی۔ جب لڑائی ہونے والی تھی تو بابر نے اپنے سرداروں اور سپاہیوں کو جمع کرکے کہا کہ جس نے ماں کا پیٹ دیکھا ہے وہ ضرور ایک دن قبر بھی دیکھے گا، جو دنیا میں آیا ہے، وہ یہاں سے جائے گا بھی ...... اب سب کو حلف اٹھانا چاہیے تاکہ کوئی اس موت سے نہ بھاگے اور جب تک دم میں دم ہے اس لڑائی سے منہ نہ پھیرے۔" یہ پہلا اور آخری موقع تھا جب لڑائی کو ایک مذہبی حیثیت دی گئی، ورنہ اسے ایسا کام سمجھا گیا جسے مرد آدمی کرتے ہیں اور مرد آدمی ہونے کی وجہ سے کرتے ہیں۔

بابر کی نظر ہندوستان کی ایک ایک چیز پر پڑتی، پہاڑوں، میدانوں، دریاؤں اور چشموں پر، درختوں، پودوں اور پھولوں پر جانوروں اور پرندوں پر، اس نے ہر چیز کا مقابلہ اپنے وطن کی چیزوں سے کیا اور آخر میں جو رائے قائم کی وہ ہندوستان کے حق میں نہیں تھی، مگر یہ رائے ایک آزاد شخص کی تھی، جو اچھے اور برے میں تمیز کر سکتا تھا اور جو کچھ پسند ہوتا اس سے واقعی لطف اٹھا سکتا تھا۔ اس نے اپنے کسی عیب اور کسی غلطی کو چھپایا ہوتا تو ہم کہتے کہ اسے ہندوستان پر اعتراض کرنے کا حق نہیں تھا، لیکن وہ مرد تھا، قدر شناس تھا، بے تکلف تھا، اس نے جس آئینے میں اپنی صورت دیکھی اس میں سب کو ان کی صورت دکھائی۔

بازگشت

محترمہ ساجدہ زیدی

رات خاموش ہے تاروں کے دیے بھی خاموش　　　آج بیتابیٔ دلِ سوزِ دروں ساکت ہے
جیسے طوفانِ بلا دل میں لیے بحرِ نصیب　　　سطحِ دریا کی ہر اک موج بھی یوں ساکت ہے
ہر شجر سہما سا، سمٹا سا نظر آتا ہے　　　شبِ مہتاب کا ہر کیف فسوں ساکت ہے
ہم نفس تیرگیٔ شب کے سوا کوئی نہیں

کتنے بے نور ہیں تجلی کے ستارے اس شب　　　درد میں لپٹی ہوئی رات کی پہنائی ہے
سوز میں ڈوب کے نکلا ہے سفینہ دل کا　　　کیسے بتلاؤں میں کس طرح یہ رات آئی ہے
ماہِ امید بجھا شوق کے تارے ڈوبے　　　بس یہاں میں ہوں مرے درد کی تنہائی ہے
شبِ مہ کیف سحر، بادِ صبا کوئی نہیں

اے شبِ تار تجھے قصۂ دل کیسے سناؤں؟　　　کیا یہ ممکن ہے کہ لے آئے تو اس درد کی تاب
کس طرح کھول کے رکھ دوں ترے سناٹے میں　　　جس کا عنواں ہے غمِ دل وہ تمنا کی کتاب
یاس و حرماں مرے سوز و تپشِ دل کا صلہ　　　کم نگاہی مری دیرینہ وفاؤں کا جواب
ہاں مگر دشتِ تمنا سے گلہ کوئی نہیں

تند طوفانِ بلا شوق کی لو لرزاں سی　　　دل کی نازک سی تمنائیں کڑی راہ گذر
ایک دہکا ہوا شعلہ سا رگِ جاں کے قریب　　　یاس کی تپتی دوپہر دل میں امیدوں کے سفر
دشتِ تنہائی میں بکھرے ہوئے یادوں کے نجوم　　　شبِ فرقت میں پڑے ٹوٹے ہوئے اشکوں کے گہر
صلۂ راہروِ کوئے وفا کچھ بھی نہیں

وادیِ فکر کے رستے بڑے پُر پیچ سہی   ذہنِ بیتاب کو ملتی تھیں پناہیں لیکن
دل مرا درد کے صحراؤں میں بھٹکا کیا کیا!   شوقِ آوارہ کی پیاسی تھیں نگاہیں لیکن
ہر نفس جادۂ امید کا رہرو تھا مرا   بند تھیں عشرتِ امروز کی راہیں لیکن

اور اس کشمکشِ غم کا علاج کچھ بھی نہیں

تجربے غم کے سناؤں تو ہو عنوانِ حیات   زندگی گرد دل، رہنے تو ہزاروں ناسور
لاکھوں پیاسے رہے میخانے کی دیوار تلے   جن سے صہبائے نشاط اور مئے رنگین تھی دور
مضمحل دستِ جنوں کوہِ گرانِ غم کے اٹھائے   شعلۂ دل نہ بجھے لیے دفا گو ہے دور

وہ مظاہر کہ نظر جن سے چرائی نہ گئی

ظلمِ سرمایہ کے اور پیکرِ تہذیب کا درد   محنتِ روز و شب و شام و سحر گریہ کناں
محنتِ شب کی طرح سخت کڑی دھوپ کے دن   شام کی گود میں پھیلا ہوا کٹیوں کا دھواں
یاس کی گرد سے سنولائے ہوئے عارضِ زرد   حسنِ تہذیب کے چہرے پہ سیاہی کے نشاں

وہ سیاہی کہ جو غازوں سے چھپائی نہ گئی

دھوپ کی آنچ سے کمھلائے رہے پھول سے جسم   وہ فسانے کہ تصور سے لرز جائے حیات
خونِ مزدور سے گلرنگ حسینوں کے لباس   دلِ مضطر کی تمنا تھی کہ ڈھل جائے یہ رات
محنتِ سخت کا غازہ رخِ محبوبی پر   نگہ و دل کا تقاضا کہ سنور جائے حیات

ظلم و بیداد کا اس دور میں چرچا ہی نہیں

پھر بھی میں راہِ تمنا سے اٹھا لائی ہوں   ریزہ ہائے غمِ دل، سوزِ دروں، خونِ جگر
سلسلہ ایک ہی وحشت کا وہ دل ہو کہ حیات   ایک ہی فردِ جنوں، تارِ نفس، تارِ نظر
اے شبِ تار بتا ان کو کہاں لے جاؤں   دل کے دامن میں سمیٹے ہیں وفا کے جو گہر

دہر میں جنسِ وفا کا کہیں سودا ہی نہیں

جون ۱۹۶۱ء

حالات حاضرہ

چین اور ہندوستان

چین نے دھمکی دی ہے کہ اگر ہندوستان اپنی فوجی سرگرمیوں سے باز نہ آیا اور سرحدوں پر نئی فوجی چوکیاں قائم کرتا رہا تو اس کی فوجیں میک ماہن لائن کو پار کر جائیں گی، ہندوستان کی حکومت نے اس کے جواب میں یہ واضح کر دیا ہے کہ اگر ایسا ہوا تو ہندوستان اس کی مزاحمت کرے گا اور ضرورت پڑی تو وہ جنگ کر کے چین کو مجبور کرے گا کہ وہ ہندوستان کی سرحدوں پر اپنے جارحانہ عزائم سے باز آئے۔ چین نے ہندوستان کے ساتھ اب تک جو کچھ کیا تھا وہ بغیر اعلان کے کیا تھا، اس مرتبہ باقاعدہ اعلان ہے، دھمکی ہے اور بہانہ یہ ہے کہ ہندوستان اپنی سرحدوں کی حفاظت کر رہا ہے ہمارا خیال ہے کہ بین الاقوامی دنیا کے لئے چین کے اس رویہ میں کوئی ایسی بات نہیں جس سے وہ دم بخود رہ جائے، اس قسم کے بیسیوں تماشوں سے دنیا کی تاریخ بھری پڑی ہے، معلوم ہے کہ جب کوئی قوم بین الاقوامی جرائم کے لئے اپنا پروگرام بناتی ہے تو اس کی تکمیل کے لئے خود ایسی صورت حال پیدا کرتی ہے جو اس کے حصول مقاصد کے لئے بہانہ بن سکے، مغرب اور مشرق میں ہر جگہ اس کی مثالیں مل سکتی ہیں، تعجب اس پر ضرور ہے کہ چین کا یہ رویہ اُس ہندوستان کے لئے ہے جس نے چینی انقلاب کی تاریخی حقیقت کو نہ صرف تسلیم کیا بلکہ برابر اس کی کوشش کرتا رہا کہ "منکر" قومیں بھی اسے تسلیم کریں اور نئے چین کو عالمی برادری کا ایک اہم رکن تصور کریں،

کہا جا سکتا ہے کہ چین پر یہ ہندوستان کا کوئی احسان نہیں، یہ تو ایک جیتی جاگتی حقیقت تھی، ہندوستان اگر اسے نہ مانتا تو دوسری "منکر" قوموں کی طرح مجرم ہوتا، ہم بھی اسے مانتے ہیں لیکن ہندوستان کی یہ مسلسل کوشش کہ ساری دنیا اس تاریخی حقیقت کو تسلیم کرلے، اس کا سیاسی فرض نہیں تھا، ہاں اخلاقی فرض

مزدور تھا اور اس نے کما حقہٗ اسے پورا کیا، اور اس سلسلے میں وہ بہت سی قوموں کے نزدیک مورد عتاب بھی رہا، اس کے علاوہ دوسرے طریقوں سے بھی وہ چین پر واضح کرتا رہا کہ اس کی طرف سے اُسے ہمیشہ خیر سگالی اور دوستی کا یقین رہنا چاہیئے، اس کی بنیادی پالیسی قیام امن ہی، زندہ رہو اور دوسروں کو زندہ رہنے دو، اس کا فلسفہ حیات ہے، شروع شروع میں چین نے بھی اس جذبہ اور اس پالیسی کی قدر کی، اگر معلوم ہوا کہ ہر اخلاقی قدر کو اضافی حیثیت دینے کا فلسفہ دوستی کو بھی اسی نظر سے دیکھتا ہے، چین نے ہندوستان کے جذبۂ خیر سگالی کو بھی اسی پیمانے پر برتا اور دوستی کے اُس جامہ کی جس میں چینی رسالک کے بھی تار تھے، دھجیاں اڑاکر اپنے پُرامن ہمسایے کی علاقائی سالمیت پر حملہ کر دیا، فرض کر لیجیے کہ سرحدوں سے متعلق کوئی غلط فہمی تھی، یا دونوں ملکوں کے نقطۂ ہائے نظر میں کوئی اختلاف تھا، تو کیا یہ اختلاف دوستانہ فضا میں گفت و شنید کے ذریعہ طے نہیں کیا جا سکتا تھا۔ تبت میں چین نے اپنا اقتدار قائم کیا، اور جس طرح سے قائم کیا اُسے ہندوستان نے پسند نہیں کیا، وہاں کے بے خانماں لاما کو پناہ دی لیکن اس پر کچھ پابندیاں بھی لگا دیں، یقیناً چین کو یہ بات اچھی نہیں لگی لیکن اُسے اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ ہندوستان ایک آزاد ملک ہی، اس کا اپنا ایک طریقہ ہے، ایک اصول ہی، وہ اس کی توقع بھی کرتا ہی کہ دوسرے اس اصول کا احترام کریں گے، اگر احترام نہ کریں تو کم از کم اس کے آزادی اور آزاد پالیسی کے حق کو ضرور تسلیم کریں گے، اس لیئے تبت کے واقعہ کے بعد بھی باہمی اختلافات پُرامن طریقے سے دور ہو سکتے تھے۔

اب سوال یہ ہے کہ چین نے جارحانہ طریقۂ کار کیوں اختیار کیا؟ یہ سوال مشکل ہے اگر اخلاقی اصولوں پر اس کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش کی جائے، سیاسی اور خالص سیاسی وجوہ کئی ہو سکتے ہیں، اور چین کے معاملے میں ہمیں سیاسی وجوہ ہی سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔

چین کے ساتھ دنیا کے بعض اہم اور بڑے ملکوں نے جو سلوک کیا ہے اسے وہ آسانی سے بھول نہیں سکتا، نئی امنگوں اور نئے حوصلوں کے ساتھ گراں خوابی سے بیدار ہوتی ہوئی قوم کو اہمیت نہ دینا ویسی ہی غیر دانشمندی ہے جیسے کسی ایسے نوجوان کے جذبات کی قدر نہ کرنا جو عنفوان شباب کی منزلوں سے گزر رہا ہو، اس سے اس میں چڑچڑاپن اور غصہ پیدا ہوتا ہے اور وہ سب سے بیزار ہونے لگتا ہی، امریکہ اور اس کے بعض ساتھیوں نے اس حقیقت کو نظر انداز کیا ہی اور اس کی وجہ سے چینی قوم چڑچڑے پن میں ایسے کام کرتی رہی ہے جو اس کی قدیم

روایات کے عین منافی ہے، غم و غصہ میں اس نے معقولیت اور ہوشمندی کا دامن چھوڑ دیا ہے، اور اپنے وجود کی حقیقت کو ثابت کرنے اور یہ جتلانے کے لیے کہ اگر اُسے بین الاقوامی دنیا میں ضابطہ کے ساتھ وہ پوزیشن نہیں مل سکتی، تو دوسرے طریقوں سے وہ اسے حاصل کر کے رہے گا، وہ غلط اور صحیح ہر طرح کا اقدام کرتی رہی ہے۔ اس سلسلہ میں اس نے اندرونی طور پر اور خارجی معاملات میں ایسے مجرمانہ کام بھی کیے ہیں جسے مہذب دنیا معاف نہیں کر سکتی۔

چین اور مارکس کے فلسفہ کا علمبردار ہے اور انقلاب کا نقیب، اس کے اپنے مسائل بھی ہیں، معاشی، سماجی اور سیاسی غرض ہر قسم کے، جنھیں وہ کم سے کم مدت میں حل کرنے کی کوشش کر رہا ہے، اُس کے معاشی نظام میں ابھی استحکام نہیں پیدا ہوا ہے، وہ اپنے یہاں مکمل انقلاب کا خواہاں ہے، اسی کے ساتھ وہ اپنا فرض سمجھتا ہے کہ دنیا میں کمیونزم کی اشاعت اور مارکسی نظام کے حامیوں کی مدد کرے، خاص طور سے ایشیا اور وہ بھی جنوب مشرقی ایشیا میں وہ جلد از جلد اس انقلاب کا خواہاں ہے، ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ وہاں سے ایسی خبریں موصول ہوئی تھیں کہ اس کے ذمہ دار رہنما اشتراکی انقلاب کی کامیابی کے لئے جنگ ضروری سمجھتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ جنگ ہوگی تو سرمایہ داری نظام جس کی بنیادیں پہلے سے ہی کمزور ہو چکی ہیں ختم ہو جائے گا اور اشتراکی انقلاب کی کامیابی کے امکان بہت بڑھ جائیں گے، یہ بات بھی ان کی طرف منسوب کی گئی ہے کہ وہ اسی کو صحیح مارکسیزم کہتے ہیں اور اس سلسلہ میں روس سے ان کا اختلاف بھی ہے، وہ روس کے نعرۂ امن اور مواسات (CO-EXISTENCE) کے نظریہ کو اصولی مارکسزم سے انحراف تصور کرتے ہیں اور انھیں بدعت قرار دیتے ہیں، یہ اور بات ہے کہ روس خود کہاں تک امن کا خواہاں ہے اور امن کا صحیح مفہوم اس کے نزدیک کیا ہے۔ روس اور چین کا یہ نظری اختلاف اگر خالص علمی سطح پر ہوتا تو کوئی مضائقہ نہ تھا لیکن جب چین کی طرف سے یہ عملی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور اس کے امن پسند ہمسایے اس کی زد میں آتے ہیں تو صورت حال تشویشناک ہو جاتی ہے۔

اس وقت ایشیا میں مغربی طرز کی جمہوریت اور اشتراکیت کی سرد جنگ جاری ہے، چین جو اشتراکی انقلاب کا نقیب ہے ہندوستان کو اپنا حریف تصور کرتا ہے جہاں جمہوری طریقہ کار سے معاشی اور سماجی انقلاب لانے کی جدوجہد ہو رہی ہے، پنڈت نہرو کی قیادت میں ہندوستان کا یہ عزم ہے کہ تشدد اور خونریزی سے گریز کرتے ہوئے پُرامن طریقہ سے، سماجی اور معاشی انصاف کی بنیادوں پر ایک ایسا جمہوری نظام قائم

کیا جائے جہاں فرد کی اہمیت بھی باقی رہے اور ساتھ ہی ساتھ استحصال بالجبر کے لئے کوئی موقع نہ ہو، دوسرے لفظوں میں یہ کہ جمہوری طریقہ کار اختیار کرکے سوشلزم قائم کیا جائے، یہ تجربہ اگر کامیاب ہو جاتا ہے تو جمہوریت کو اپنی بقا کے لئے ایک سہارا مل جاتا ہے، چین کا جس فلسفۂ حیات پر ایمان ہے اس کا تقاضا کچھ اور ہے، وہ ایشیا کے پسماندہ ملکوں کے مسائل کا حل صرف اشتراکی انقلاب میں دیکھتا ہے، ہندوستان اس کا منکر ہے، اس لئے ہندوستان کی ترقی اور کامیابی میں چین کو اپنی شکست کے آثار نظر آتے ہیں، ہندوستان بنیادی طور پر امن پسند ہے اور وہ اپنے سیاسی اور معاشی تجربہ کے لئے بھی امن کا خواہاں ہے، چین کا منصوبہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کو یکسوئی کے ساتھ تعمیر و ترقی کے کام کے لئے امن کی فضا نہ ملے اور اس طرح ایشیا میں جمہوریت کا کوئی ٹھکانا نہ ہو، ہندوستان کی کامیابی کا اثر ایشیا اور افریقہ کی اُن قوموں کے فکر و عمل پر بھی پڑے گا جو ابھی سامراج کی زنجیروں سے آزاد ہوئی ہیں اور آزاد ہو رہی ہیں، اسی لئے بہر صورت ہندوستان چین کی عالمی انقلاب کی تمنا کی راہ میں ایک روڑا ثابت ہوگا۔

خبریں موصول ہو رہی ہیں کہ چین کو کچھ داخلی پریشانیاں بھی ہیں، غلہ کی وہاں بہت کمی ہے، کمیون کا پروگرام تقریباً ناکام ثابت ہو چکا ہے، وہاں کے عوام بددلی کا شکار ہو رہے ہیں وغیرہ وغیرہ، معلوم نہیں حقیقت کیا ہے، ویسے اگر پریشانیاں ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں، اس لئے کہ وہ بھی ابھی تجربہ کی منزل سے گزر رہے ہیں اور اپنی جلد بازی میں بعض باتیں غلط بھی کر رہے ہیں یا مقابلہ اور سابقہ کے دباؤ سے منصوبہ بندی میں کوتاہیاں رہ جاتی ہیں یا عوام اس سرعت کا ساتھ نہیں دے پاتے، یہ ہوتا ہے تو ہندوستان میں بے شمار مسائل ہیں، الجھنیں ہیں، لیکن اپنی پریشانیوں اور الجھنوں پر پردہ ڈالنے یا ان کی طرف سے اپنی قوم کی توجہ ہٹانے کے لئے اگر چینی حکومت ہمالہ کی بلندیوں پر جارحانہ اقدام کا ایک محاذ کھول دے تو جہاں ایک طرف دنیا کا امن خطرہ میں پڑ سکتا ہے وہاں خود اُس نظام کی کمزوریاں اس سے نہیں دور ہو سکتیں اور نہ اس کی الجھنیں ہی دور ہو سکتی ہیں، ہندوستان کمزور ملک نہیں ہے، اگر ہندوستان اور چین میں جنگ شروع ہو جاتی ہے تو جیسا کہ پنڈت نہرو نے کہا ہے، یہ طویل جنگ ہوگی اور عالمی جنگ ہو سکتی ہے، اس لئے دفاعی تیاریوں کے ساتھ یہ کوشش بھی جاری رہے گی کہ دوسرے طریقوں سے اس سرحدی تنازعہ کو ختم کیا جائے، ہندوستان میں بھی بعض ایسی جماعتیں اور افراد ہیں جو پنڈت نہرو

کی اس پالیسی کو کمزوری اور بزدلی پر محمول کرتے ہیں اور ممکن ہے کہ چین کو بھی یہی مغالطہ ہو لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔

گوا اور پاکستان

ہندوستان کی مشکل یہ ہے کہ وہ سنجیدگی سے پُرامن فضا چاہتا ہے، وہ عدم تشدد کی بنیادی اچھائیوں پر ایمان رکھتا ہے، اس کے ذمہ دار رہنماؤں نے بار بار یہی کیا ہے، اگر اُسے مجبور ہو کر کسی قوم سے لڑنا پڑا تو اس سے اس کے ضمیر کو سخت صدمہ پہنچے گا، مگر جارحیت کو برداشت کرنا اور ملک کی علاقائی سالمیت کو خطرہ میں ڈال دینا اُسے قبول نہ ہوگا اور اسے مجبوراً ہتھیار اٹھانا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آج تک اپنے سینے پر پرتگالی سامراج کے پنجے کو برداشت کرتا رہا ہے، لیکن اب گوا میں پرتگالیوں کا ظلم اور تشدد اتنا بڑھ گیا ہے کہ ہندوستان اپنے سمندروں میں بھی آزادی کے ساتھ کچھ نہیں کر سکتا، پرتگال نے بھی جارحیت پر کمر باندھ لی ہے، ہندوستان اس سے بنرد آزما ہونے کے لئے تیار ہے مگر یہاں بھی وہی مشکل اس کے سامنے ہے، جنگ نہ ہو اور خوش اسلوبی سے معاملات طے ہو جائیں اور پرتگال ہندوستان چھوڑ کر چلا جائے تو ہندوستان اس کے لئے اور انتظار کر سکتا ہے۔

ان حالات میں پاکستان کا جو رویہ ہے وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ پچھلے دنوں چین نے کشمیر کی شمالی سرحدوں سے متعلق پاکستان کو رام کرنے کی کوشش کی تھی اور یہ اشارہ کیا تھا کہ وہ اس سے معاملہ کرنے کو تیار ہے، لیکن اس سلسلے میں کوئی واضح بات سامنے نہیں آئی تھی، اور شاید مختلف اسباب اور اپنی قومی مصلحتوں کی بنا پر پاکستان نے چین کی کچھ زیادہ ہمت افزائی بھی نہیں کی تھی، اب پھر اس کا امکان ہے کہ پاکستان میں چین کی ڈپلومیٹک سرگرمیاں بڑھ جائیں اور چین پاکستان سے کوئی معاملہ کرنے کا سلسلہ شروع کر دے، ابھی ابھی خبر آئی ہے کہ پاکستان میں چین کے سفیر نے صدر ایوب اور وزیر خارجہ منظور قادر سے ملاقات کی ہے اور چینی سفیر کے بیان کے مطابق گفتگو کامیاب رہی ہے، گوا سے پاکستان کو خواہ مخواہ کی دلچسپی رہی ہے اور اس معاملے میں اس نے بڑی رجعت پرستی اور سامراج دوستی کا مظاہرہ کیا ہے، یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ بعض معاہدے، ہیں وہ پرتگالیوں سے دوستی کا دم بھر رہا ہے۔ بہر حال دونوں رجحان منفی رجحان کے حامل ہیں اور اس سے خود پاکستان کو نقصان پہنچ سکتا ہے، اور

غالباً پہنچ رہا ہے۔ دہلی میں باوثوق ذرائع سے یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ جب سے پرتگالیوں نے گوا میں ہنگامہ کھڑا کیا ہے اور اپنی فوجی پوزیشن مضبوط کرنا شروع کی ہے، کشمیر میں جنگ بندی لائن پر پاکستانی فوجیوں کی سرگرمیاں بڑھ گئی ہیں اور کئی بار اس کی کوشش کی گئی ہے کہ اس لائن کو پار کیا جائے، یہ بھی پتہ چلا ہے کہ گوا میں پرتگالیوں سے پاکستان اپنا تعلق قائم کئے ہوئے ہے، کراچی کے ہوائی اڈے پر پرتگالی ہوائی جہاز اپنی ضرورتوں سے اترتے ہیں اور پرتگالیوں کے اسلحے کراچی ہوکر گوا پہنچتے ہیں، دوسری طرف صدر ایوب نے ہندوستان کو مشترکہ دفاع کی دعوت دی ہے لیکن یہ دعوت مشروط ہے، صدر ایوب نے کہا ہے کہ اگر ہندوستان کھلے دل کے ساتھ کشمیر کے مسئلے حل کرنے کے لئے پیش کش کرے تو پاکستان ہندوستان کے ساتھ مشترکہ دفاعی معاہدہ کرنے کو تیار ہے اور پھر دونوں مل کر بیرونی حملہ کا مقابلہ کریں گے، پاکستان کا یہ رویہ توقع کے عین مطابق ہے اور ہندوستان کو اس پر حیرت نہیں ہونا چاہیئے، افسوس پاکستان کی غیر دانشمندانہ حرکت پر ہوتا ہے جہاں کے عوام اس کا خمیازہ بھگتتے رہے ہیں۔

کانگو میں اقوام متحدہ

کانگو میں بھی اس وقت ہندوستانی سپاہی لڑ رہے ہیں جہاں اقوام متحدہ کے وقار کا مسئلہ درپیش ہے، ہندوستان اقوام متحدہ کے وجود کو اور پُراثر وجود کو امن عالم کے لئے ضروری تصور کرتا ہے، اور اس بار امریکہ اور ہندوستان دونوں اس معاملہ میں عملی طور پر متفق ہوتے ہیں، مغربی یورپ کی بعض اہم قوموں کو کٹنگا سے زیادہ دلچسپی ہے اور وہ اقوام متحدہ کی زیادہ پروا نہیں کرتے، ان کے سامنے اپنا قومی مفاد ہے، ان میں انگلستان بھی شامل ہے جو اقوام متحدہ میں تو اس ریزولیوشن کی تائید میں تھا جس کو عمل میں لانے کی کوشش ہو رہی ہے لیکن عملی طور پر اس کا رویہ اس کے برخلاف ہے، اس سلسلہ میں ہندوستان سے اس کا سخت اختلاف ہے، گوا کے معاملے میں بھی وہاں کے سرکاری حلقے ہندوستان کے ساتھ نہیں ہیں، اور وہ بیچ بچاؤ کے لئے تیار ہیں، حقیقت یہ ہے کہ وہ گوا پر پرتگالی قبضے کے حق میں ہیں خاص طور سے اس لئے کہ اگر پرتگال کو گوا چھوڑنا پڑا تو اس کا اثر افریقہ میں ان کے مفاد پر پڑے گا، ان کی طرف سے یہ منطق پیش کی جاتی ہے کہ اگر پنڈت نہرو نے ایشیا اور افریقہ کی قوموں کو خوش کرنے کے لئے گوا میں پرتگالیوں کے خلاف کچھ کیا تو اس سے ان کا بین الاقوامی وقار خطرہ میں پڑ جائے گا دلچسپ بات یہ ہے کہ انھیں اس وقت اپنے وقار سے زیادہ پنڈت نہرو کے وقار کی فکر ہے، یہ ہے استعمار کی چالیں مختلف انداز سے سامنے آتی رہتی ہیں۔

۱۳۷۲۵۹

تعلیمی مسائل

قومی یک جہتی اور تعلیم

پچھلے دنوں ہمارے رہبرانِ قوم کو دیس کے اندر انتشار کے آثار دیکھ کر بڑی تشویش ہوئی۔ آج جبکہ ہر فرد اور اس کا ہر لمحہ وطن کی تعمیرِ نو کے لئے وقف ہونا چاہیئے تاکہ فی الحقیقت ایک مہذب و شائستہ جمہوری نظام قائم ہو گر تفرقہ پرور عناصر کی ریشہ دوانیاں واقعی بڑی پریشان کن ہیں۔ ایک ناسور کی طرح جسے خارجی مرہم پٹی سے ایک مدت تک نہہ داماں رکھا گیا ہو، یہ جسدِ قوم کا فساد جگہ بہ جگہ، اتفاقیہ اور ارادتاً موقع بے موقع برابر نمودار ہو رہا ہے۔ ایسی تخریبی کارروائیاں جب وطن کے نوجوان بھی کرنے لگیں تو مسئلہ اور نازک ہو جاتا ہے۔ ان علامتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مشترکہ قومیت کی اساس ابھی بڑی ناپائیدار ہے اور یہ خطرہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ اتحادِ قومی کی روایات جنھیں بڑی جاں سوزی سے قائم کیا گیا ہے اور جو ہماری عزت و ناموس اور بقا کے لئے بڑی اہم ہیں، کہیں نصیب دشمناں ملیا میٹ ہو کر نہ رہ جائیں۔

قومی یک جہتی کانفرنس نے جو اکتوبر میں دلی میں منعقد ہوئی تھی شعوری طور پر اس مسئلے کو ملک کے سامنے پیش کیا اور متنبہ کیا کہ ہم علاقائی تعصب، فرقہ پرستی، ذات پات کی تفریق، لسانی مغائرت اور کچھ اس سے بھی زیادہ تنگ و تاریک تصورات کے مہلک اثرات کا اپنے آپ کو شکار ہونے سے محفوظ رکھیں اور اپنے احساسِ قومی کو فراموش نہ کریں۔ اس کانفرنس نے مسئلے کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد یہی نتیجہ نکالا کہ ان تمام علائق سے نجات حاصل کرنے کا واحد ذریعہ تعلیم ہے۔ کیونکہ قومی یک جہتی کا راز ہمارے نظریات کی استواری میں مضمر ہے۔ اور تعلیم ہی اپنے وسیع معنی میں وہ سب سے موثر ذریعہ ہے جس سے خیالات، احساسات اور معتقدات و تصورات کو استوار کیا جا سکتا ہے۔

آزادی کے بعد سے برابر تعلیم کے کاموں کی تنظیم کی جا رہی ہے۔ مختلف تبدیلیاں لائی جا چکی ہیں اور مسلسل یہ کوشش ہو رہی ہے کہ جلد از جلد تعلیم کیسے جمہوری نظام کے تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ

کر دیا جائے۔ تاہم ہم دیکھتے ہیں کہ مدرسوں سے لے کر یونیورسٹیوں تک ہر جگہ نظم وضبط کا فقدان ہے۔ شب و روز کوئی نہ کوئی ایسا حادثہ رونما ہوتا ہے جس سے قومی تذلیل ہوتی ہے اور جن نونہالانِ چمن کو دیکھ کر فرحت نصیب ہونی چاہیئے تھی اور جن سے مستقبل کی امیدیں وابستہ ہیں، وہی بے راہ روی اور خودسری میں گرفتار نظر آتے ہیں۔ انھیں سے نازیبا اور ناروا حرکات سرزد ہوتی ہیں اور ان کے دست و بازو تعمیرِ وطن کے لئے اٹھنے کے بجائے قومی عمارت کو مسمار کرنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ اس لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم معلوم کریں کہ اس صورتِ حال کے اصل اسباب کیا ہیں۔ وہ کونسے نکات ہیں جن پر ہماری نظر نہیں گئی یا اب تک ہم نے پوری توجہ ان پر نہیں کی ہے بلکہ فروعی معاملات میں ہی اُلجھے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں بہت سی باتیں کہی جا رہی ہیں لیکن درسی کتابوں کا معاملہ جیسا کہ اس قومی یک جہتی کانفرنس میں بھی کہا گیا ہے، بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس دور میں جبکہ چھپے ہوئے حروف ہی سب سے زیادہ ہمارے ذہن پر چھائے ہوئے ہیں، درسی کتابوں کے ذریعے ہی سے زیادہ موزوں اور باضابطہ طور پر مناسب رجحانات کو پیدا کیا جا سکتا ہے۔ "یونیورسٹی گرانٹس کمیشن" کی یہ تجویز کہ ایک قومی مشاورتی بورڈ قائم کیا جائے جو دیس کی تمام ریاستوں کے لئے مشترکہ طور پر درسی کتابیں تیار کرنے کے سلسلے میں مشورہ دے، فوری اور پوری توجہ کی مستحق ہے۔ یہ بھی نہایت ضروری ہے کہ مدرسوں میں پڑھائی جانے والی زبان، تاریخ، و جغرافیا اور دیگر مضامین کی درسی کتب کا جائزہ لیا جائے۔ پچھلے سو سال میں بدیسی دانشوروں نے ہماری تاریخ کو بُری طرح مسخ کیا ہے اور قومی احساس کو ہر جگہ مجروح کرنے کی سعی کی ہے۔ نفاق کے بیج کو جہاں بھی مٹی ذرا نرم اور زرخیز نظر آئی ہے، بڑی فراخ دلی کے ساتھ بویا ہے۔ ہمیں اپنی تاریخ کی کتابوں پر صرف نظرِ ثانی ہی نہیں کرنا ہے بلکہ انھیں قوم پرور اور صحت مند نظریات کے تحت از سرِ نو ترتیب دینا ہے۔ اس فریضے کو انجام دینے میں اس بات کی پوری احتیاط برتی جانی چاہیئے کہ مذہبی جوش و خروش کے ساتھ کسی تاریخی کردار کو نہ پیش کیا جائے۔ 'زبان' کی کتابوں میں بھی اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے، ہمیں کسی بھی شخصیت کو کسی خاص مذہب یا جماعت کے خلاف کسی دوسرے مذہب یا جماعت کی طرف سے ایک علمبردار بنا کر پیش نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ خامی ہماری موجودہ درسی کتابوں میں اکثر و بیشتر پائی جاتی ہے۔ اسی طرح ایسے اساطیری اور دیومالائی قصوں سے بھی گریز کرنا چاہیے جو قدامت پرستی اور رجعت پسندی

کی طرف رجوع کرتے ہوں یا تن بہ تقدیر کا مبلغ بنلاتے ہوں۔ اس طرح پھر مجموعی طور پر ہمیں اپنی درسی کتابوں کے ذریعے مشترکہ قومیت کے جذبے کو ابھارنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ بہر کیف، کتابیں ایسی ہونی چاہئیں کہ وہ ہمارے ماضی کی صحیح تصویر پیش کریں اور ہماری رنگا رنگ تہذیب کی گل کاریوں سے انھیں بخوبی واقف کرائیں اس طرح ہمارے طلبہ میں تہذیبی ہم آہنگی پیدا ہوگی اور وہ جذباتی طور پر اپنے آپ کو قوم کا ایک فرد سمجھ سکیں گے۔ ایسے اقدام ہی ہمیں تعلیم کی اس شاہراہ پر جادہ پیما کرسکیں گے۔ جو قومیت کی منزل پر پہنچاتی ہے۔

اس طرح درسی کتابوں کی طرف توجہ مبذول کرانے سے، استاد کے منصب کو کم کرنا مقصود نہیں ہے دراصل استاد ہی اس کاغذی پیراہن میں رُوح پھونکتا ہے اور اسی کی ذات کی بدولت بے جان الفاظ سے حقائق آشکارا ہوتے ہیں۔ یہ ہمارے اساتذہ ہی ہیں، خواہ ابتدائی جماعتوں میں درس دیتے ہوں یا اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں، جن پر قومیت کے صحت مند تصور کو فروغ دینے کی ذمہ داری آتی ہے۔ یہ ان ہی کا فرض ہے کہ وطنیت کا ایسا جذبہ پیدا کریں جو روح کو تڑپانے اور قلب کو گرمانے کا باعث ہو، جو تازگی بخشے اخوت اور اپنایت پیدا کرے۔

معلّم اپنے اس منصب کو اس وقت تک پورا نہیں کرسکتا جب تک کہ تعلیم کے ذریعے طلبہ میں احساسِ ذمہ داری پیدا نہیں کیا جاتا۔ یوں تو ذمہ داری کا لفظ مختلف معنی میں استعمال کیا جاتا ہے! ور بالکل نجی ضروریات کو پورا کرنے سے کر قومی رہنمائی اور انسانیت کے محسن بننے تک سب ہی کچھ اس میں شامل ہے اور اکثر ان سب کو ایک دوسرے کی راہ میں حائل بھی خیال کیا جاتا ہے لیکن ذرا ہم غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ یہ سب ہی ذمہ داری کے مدارج ہیں اور ایک دوسرے کے لیے اُن کی حیثیت پیش رو یا نقشِ اوّل کی سی ہوتی ہے۔ سب سے پہلے بچّہ کا سماجی محور اس کا گھر اور خاندان ہوا کرتا ہے۔ ہمیں اپنے متعلقین کے حقوق کا خیال رکھنا ضروری ہے پھر دیگر اعزا، اور احباب کے پاسِ خاطر کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ بعد ازیں برادری، محلہ اور شہر کے ایک فرد ہونے کا دھیان رکھنا ہے۔ اب ذرا شعور پیدا ہونے کے بعد دیس اور پھر دیس بہ دیس سے تعلق پیدا کرنے، اور اس بڑے دائرے میں اپنے آپ کو پابند اور ایک دوسرے سے منسلک سمجھنے کا سوال اٹھتا ہے۔ اس طرح بالآخر انسانیتِ عام کے مرکز سے اپنا الحاق ہو جاتا ہے۔ اور اس حیثیت سے کچھ ذمہ داریاں ہمارے اُوپر عائد ہو جاتی ہیں۔ آج کی دنیا میں تیز رفتار سواریوں نے تمام جغرافیائی

حدود کو بے معنی کر دیا ہے۔ اب مسافت دنوں کی جگہ گھنٹوں میں طے ہونے لگی ہے اور بشر کی پرواز نے نہ کوہِ فلک پیما کو گردانا ہے اور نہ قعرِ دریا اور کامِ نہنگ کا خوف باقی رکھا ہے۔ اب تو زمین کی تنابیں کچھ ایسی کھنچ گئی ہیں کہ وہ ہماری دست رس میں آ گئی ہے۔ آج بُعدِ مکانی کا معاملہ نہیں ہے۔ تاہم طبقاتی اونچ نیچ اور تہذیبی امتیازات نے خلیجیں حائل کر رکھی ہیں۔ اس بنا پر نہ صرف بین الاقوامی اشتراک و تعاون میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے بلکہ ایک قومی معاشرے میں بھی یہی عناصر ابتری پھیلاتے ہیں۔ اس تفرقے کو کم کرنے اور مٹانے کی اشد ضرورت ہے۔ تعلیم ہم سے سب سے پہلے ذاتی طور پر ہی ذمہ دار ہونے کا مطالبہ کرتی ہے اور جہالت کی تنگ نائے سے نکلنے کا مطلب ہی یہی ہوتا ہے کہ محدود عقائد کی پیروی چھوڑ کر ہم وسعتِ فکر و نظر کی اقلیم میں اُتر آئیں۔ تعلیم اپنے اس منصب کو درسی کتب اور اساتذہ کی ہی بدولت پورا کر سکتی ہے۔

اعلیٰ تعلیم کے ادارے ہر ایک دور میں اپنے دیس کے تہذیبی اور ثقافتی سرمائے کا گہوارہ رہے ہیں۔ آج ہمارے سامنے بھی اقدار کا مسئلہ درپیش ہے۔ آئینِ نو سے ڈرنے اور طرزِ کہن پر اڑنے کی منزل بلا شبہ بڑی کٹھن ہوتی ہے۔ تاہم ہمیں آگے قدم بڑھانا ہے۔ یہ مرحلہ ایک اچھا تعلیمی نظام ہی طے کر سکتا ہے۔ ہمیں اس وقت ایسے نظام کی ضرورت ہے جو صرف ذہن ہی کی نشو و نما نہ کرے بلکہ جذبات کو سُدھارے، ستھرا مذاق پیدا کرے اور اقدار کا تابع بنائے اور پھر ایسے کردار تشکیل پائیں جو ماضی کی صالح روایات کے سچّے امین کہلائیں اور عظمتِ وطن کے حقیقی علم بردار اور پاسبان۔

"مُعلّم"

تنقید و تبصرہ

چند خاص نمبر

ترجمان القرآن : منصب رسالت نمبر

ترجمان القرآن جو مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کی ادارت میں نکلتا ہے، مذہبی رسالوں میں اپنی سنجیدگی اور علمیت کے لحاظ سے ایک خاص حیثیت کا مالک ہے۔ زیر تبصرہ شمارہ میں منکرین حدیث کے خیالات پر تنقید کی گئی ہے اور ان کے اعتراضات کے جوابات دئیے گئے ہیں۔ یہ نمبر دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں ڈاکٹر عبد الودود صاحب جو غالباً پاکستان کی اس جماعت سے تعلق رکھتے ہیں، جسے منکرین حدیث کہا جاتا ہے، اور مولانا مودودی صاحب کی وہ تمام مراسلت شائع کی گئی ہے، جو سنت کی آئینی حیثیت کے بارے میں ہوئی تھی، دوسرے حصے میں مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے ایک رکن جسٹس محمد شفیع صاحب کے ایک فیصلہ کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس فیصلہ کے بارے میں مولانا مودودی صاحب کا خیال ہے کہ "یہ کلیتہً انکار سنت کی بنیاد پر صادر ہوا ہے۔" جو لوگ اس مسئلہ کے دونوں پہلوؤں کو سمجھنا چاہتے ہیں، ان کے لئے یہ نمبر بہت مفید ثابت ہوگا۔ البتہ وہ جدید ذہن، جو نہ اس جماعت سے تعلق رکھتا ہے اور نہ اس گروہ سے جو آج کل کے مسائل پر معروضی طور پر غور کرتا ہے اور جسے علمائے اسلام کی توضیحات میں عصری مسائل کا تسلی بخش حل نہیں ملتا، شاید اس نمبر کے مباحث کو اپنے لئے زیادہ مفید نہ پائے۔

شاعر ◄ ادارہ : اعجاز صدیقی - مہندر ناتھ

ماہنامہ 'شاعر' اردو کے بہت پرانے پرچوں میں سے ہے۔ پہلے آگرہ سے، اردو کے مشہور شاعر، مولانا سیماب اکبر آبادی مرحوم کی ادارت میں نکلتا تھا۔ اس کے بعد مولانا کی زندگی ہی میں ان کے صاحبزادے جناب اعجاز صدیقی صاحب اس کی ادارت کے فرائض انجام دینے لگے۔ اب یہ ماہنامہ ایک طویل عرصہ سے

بمبئی سے شائع ہوتا ہے۔

زیر تبصرہ شمارہ ۶۱ء کا خاص نمبر ہے، جس میں چند اچھے تنقیدی مضامین ہیں اور اردو کے اچھے افسانہ نگاروں اور قریب قریب سبھی اچھے شعراء کی نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔

حجم ۲۰۲ صفحات اور اس نمبر کی قیمت ایک روپیہ ۵۰ نئے پیسے ہے۔

ملنے کا پتہ: مکتبہ قصر الادب۔ پوسٹ بکس ۴۵۲۶ بمبئی ۲

افکار جوش نمبر مدیر: صہبا لکھنوی

سائز ۲۰×۳۰/۸ حجم ۶۵۵ صفحات۔ جوش کی عہد بہ عہد کی متعدد تصاویر۔ کاغذ اخباری، کتابت طباعت غنیمت۔ قیمت آٹھ روپے۔ پتہ: مکتبہ افکار، رابسن روڈ۔ کراچی۔

اب زندہ شخصیتوں کے بارے میں رسالوں کے خاص نمبر نکالنے کا رواج بڑھ رہا ہے۔ اس میں خطرے بھی ہیں اور فائدے بھی۔ فائدہ یہ کہ متعلقہ شخصیت کے بارے میں اس کی زندگی میں زیادہ آسانی اور صحت کے ساتھ مواد جمع کیا جا سکتا ہے اور اس کی خدمات کا اعتراف کر کے ملک و قوم کسی حد تک اپنے فرض سے عہدہ برآ ہو سکتی ہے۔ خطرہ اس کا ہے کہ اگر متعلقہ شخصیت متفقہ طور پر بزرگ اور محترم نہ ہوئی یا زیادہ سے زیادہ لوگوں کے نزدیک نہ ہوئی تو بحث و مباحثہ کا ایک ناخوشگوار سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ چنانچہ جوش نمبر کے بارے میں پاکستان کے بعض گوشوں سے کچھ نامناسب آوازیں اٹھی بھی ہیں۔ علاوہ ازیں جب تک ایک شخص زندہ ہے اس کی شخصیت پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچتی، اس لئے اس کے بارے میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا، جیسا کہ خود جوش نے بھی کہا ہے کہ "جب تک اس جوہر گراں مایہ کو تنگی و بستگی کے فشار سے رہائی نہیں دی جاتی اُس جوہر میں اس قدر طاقت پیدا نہیں ہوتی کہ وہ کسی شخص کی ذات کو تکمیل و اتمام کی دولت سے مالا مال کر دے"۔

بہر نوع یہ نمبر اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب ہے۔ جوش کی شخصیت اور ان کی شاعری کا بہت تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے اور ان کے کلام کا انتخاب شائع کیا گیا ہے، جس میں بہت سا غیر مطبوعہ بھی شامل ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ مضمون نگاروں کو پوری آزادی کے ساتھ اظہار خیال کا موقع دیا گیا ہے، چنانچہ بعض مضامین میں جوش کی شخصیت اور کردار پر سخت تنقید بھی کی گئی ہے۔ البتہ، جیسا کہ میں نے اس

(بقیہ صفحہ ۱۶۷ پر ملاحظہ ہو)

کوائف جامعہ

"میں مسلمان کیوں ہوں؟" ——— ایک تقریر

نومبر کے اواخر میں ورلڈ کونسل آف چرچیز کی کانفرنس نئی دہلی میں منعقد ہوئی تھی، اس میں شرکت کے لئے میک گل یونیورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے ایک پروفیسر ڈاکٹر رافع اسمٰعیل فاروقی صاحب جو اس وقت سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک ریسرچ کراچی میں ایک سال کے لئے آئے ہوئے ہیں، دہلی تشریف لائے اور جامعہ میں مقیم ہوئے، ڈاکٹر فاروقی فلسطینی عرب ہیں اور فلسفہ ان کا خاص مضمون ہے لیکن ادھر عرصہ سے وہ اسلام اور دیگر مذاہب کا گہرا مطالعہ کرتے رہے ہیں، چنانچہ ابھی حال میں انھوں نے عیسائی مذہب پر ایک معرکتہ الآرا کتاب لکھ کر میکگل یونیورسٹی کے شعبۂ الٰہیات کے سپرد کی ہے، جامعہ میں وہ تقریباً ایک ہفتہ تک مقیم رہے اور اس عرصہ میں یہاں کے ارباب ذوق کو اُن سے تبادلۂ خیال کا اچھا موقع ملا، جامعہ کالج کے حلقۂ مطالعہ میں انھوں نے ایک تقریر بھی کی جس کا عنوان تھا: "میں مسلمان کیوں ہوں"۔ موضوع کافی دلچسپ تھا اس لئے اجتماع بہت اچھا ہوا تقریر انھوں نے انگریزی میں کی، تقریر ۴ بجے سہ پہر میں شروع ہوئی اور ۵ ½ بجے ختم ہوئی، اس کے بعد سوالات و جوابات کا سلسلہ شروع ہوا جو بلا مبالغہ ۱۰ بجے تک جاری رہا، اس دوران میں ڈنر پر بھی مذاکرات جاری رہے۔

تقریر کا موضوع جیسا کہ ظاہر ہے سوانحی تھا لیکن اس کی وجہ سے تقریر میں خیالات کی گرمی اور معتقدات کا جوش بھی شامل ہو گیا تھا لیکن چونکہ دوسری طرف فلسفیانہ دلائل بھی تھے اور تحقیق اور ریسرچ کے ٹھوس نتائج بھی اس لئے سننے والوں کا خیال یہ تھا کہ عرصہ کے بعد اسلام پر اتنی اچھی تقریر سننے کو ملی ہے۔ تقریر میں انھوں نے اپنے ذہنی سفر کا حال بھی سنایا اور یہ بتایا کہ شروع میں کس طرح وہ عیسائی مشنری اسکول کے ماحول سے متاثر ہوئے اور اعلیٰ تعلیم کی ابتدائی منزلوں میں وہ کیونکر تشکک کی راہ سے گزرے، اور پھر بعد میں برطانوی استعمار اور فلسطینی عربوں کی جد و جہد آزادی نے کسی طرح ان کے دل و دماغ میں ذہنی اور مذہبی بیداری

کی لہر پیدا کی، اسرائیل کی ریاست کے قیام کے بعد وہ امریکہ چلے آئے جہاں انھوں نے مشہور یونیورسٹی ہارورڈ میں اپنی تعلیم کی تکمیل کی، امریکہ میں انھوں نے مادی ترقی کا عروج دیکھا۔ لیکن اس ترقی کو انھوں نے زندگی کی روحانی قدروں سے عام طور پر معرا دیکھا، الغرض مشاہدہ اور مطالعہ نے اُن پر یہ ثابت کیا کہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو ایک متوازن نظام حیات پیش کرتا ہے، اور جہاں "معنوی خیر" اور "مادی خیر" میں ایک حسین امتزاج ملتا ہے، انھوں نے اسلامی تعلیمات کی رجائیت پر اور اس خصوصیت پر کہ ان میں عمل اور سعی کی پر زور تلقین کی گئی ہے، بہت زور دیا، ان کے خیال کے مطابق وہ مسلمان مسلمان نہیں ہے جو "انفرادیت" کی تنگ نائیوں سے نکل کر دوسروں کے لئے کچھ نہیں کرتا، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسلام میں فرد کی بحیثیت فرد کے کوئی حیثیت نہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ اسلام اُس انفرادیت کا قائل نہیں جس کا دامن اجتماعی فلاح و خیر سے نہ وابستہ ہو، یہ توازن نہ تو سرمایہ داری نظام کی لبرل فلاسفی میں میں ملتا ہے اور نہ سوشلزم کی اجتماعی آمریت میں، انھوں نے اس کا اعتراف کیا کہ بدھ دھرم اور ہندو مت سے متعلق ان کا مطالعہ گہرا نہیں ہے لیکن جو کچھ ان مذاہب کے بارے میں انھیں معلوم ہے اس کی روشنی میں وہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ مذاہب اُس صحت مند رجائیت سے عاری ہیں جو اسلام میں ملتی ہے، عیسائی مذہب اور یہودی مذہب میں جن کا مطالعہ انھوں نے گہری نظر سے کیا ہے خیر اور مادہ کے وہ حسین امتزاج نہیں ملتا اور یہودی مذہب میں "برگزیدہ" قوم کا جو تصور ملتا ہے وہ ساری انسانیت کی وحدت کی ضد ہے لیکن اسلام کی موجودہ صورت میں انھوں نے اجتہاد کی اہمیت پر زور دیا اور کہا کہ بغیر اجتہاد کے اس زمانہ میں اسلامی تعلیمات کے صحیح خد و خال نہیں اُبھر سکتے ۔

ڈاکٹر اسمٰعیل فاروقی نے "العروبۃ" یعنی *ARABISM* پر ایک مفصل کتاب دو جلدوں میں لکھی ہے جو زیر طبع ہے، یہ کتاب انھوں نے دو تین سال کی سخت محنت کے بعد انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کی خاموش اور پرسکون فضا میں ترتیب دی ہے، اس کے علاوہ وہ اچھے مترجم بھی ہیں، اور انھوں نے کئی عربی کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ (ض، ح، ف)

طلبائے کالج کی یونین کی تنظیم نو

انجمن اتحاد جامعہ کے زمانۂ قیام سے طلبائے کالج کی یونین رہی ہے اور جامعہ کی بہت سی

سرگرمیوں میں، اس نے ممتاز حصہ لیا ہے۔ مگر چند سال ہوئے بعض مصالح کے پیش نظر رورل انسٹی ٹیوٹ اور کالج کی مشترک یونین بنائی گئی تھی، مگر چند برسوں کے تجربے کے بعد دونوں اداروں کی الگ الگ یونین بنا دی گئیں اور انجمن اتحاد کی از سر نو تنظیم عمل میں آئی۔

اس تنظیم کے بعد ۳ر دسمبر کو جناب شیخ الجامعہ کی صدارت میں اس کا پہلا جلسۂ مسند نشینی منعقد ہوا۔ ایڈہاک کمیٹی کے کنوینر ناظم محمد ادریس صاحب نے اپنی رپورٹ پیش کی، اس کے بعد انجمن کے ایک جیالے رکن عبداللطیف اعظمی نے انجمن اتحاد کی شاندار روایات پر مختصر تقریر کی اور اراکین انجمن سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "ضرورت ہے کہ انجمن کی زندگی اور اس کی سرگرمیوں میں وہ اعلیٰ قدریں پیدا کی جائیں، جو پچھلی انجمن اتحاد کی طرۂ امتیاز تھیں... زمانہ آگے بڑھ رہا ہے، جامعہ وسیع سے وسیع تر ہو رہی ہے، حالات تیزی سے بدل رہے ہیں، آپ کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ جامعہ کی اعلیٰ قدریں اور صحت مند روایات زندہ رہیں اور ان کا روزمرہ کی زندگی میں عمل دخل ہو۔" اس کے بعد منتخب نائب صدر عبدالوکیل صاحب نے اپنا خطبۂ صدارت پڑھا جس میں موصوف نے انجمن کی ذمہ داریوں کو یاد دلایا اور اپنے کام کا ایک نقشہ پیش کیا۔ انھوں نے اس پر زور دیا کہ "ہمارا اولین کام یہ ہوگا کہ طلبہ میں اتحاد اور یکجہتی کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ ہم سب اس سے واقف ہیں کہ آج ہمارے ملک اور قوم کے سامنے ایک چیلنج ہے، انتشار اور اختلاف کی قوتیں بڑی تیزی سے سر اٹھا رہی ہیں اور ملک و قوم کی یکجہتی اور ہم آہنگی کی راہ میں رکاوٹ بن رہی ہیں۔ ظاہر ہے یہ مسئلہ بڑا ہے، لیکن ہم اپنے چھوٹے سے حلقے میں، جہاں ہر مذہب و ملت کے لوگ آزاد خیالی کے ساتھ رہتے ہیں اور رواداری کی فضا میں تعلیم و تربیت پاتے ہیں، نمونے کی ایک چھوٹی سی ایسی برادری بنا سکتے ہیں، جو قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی کی اچھی مثال ہو۔"

آخر میں شیخ الجامعہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے انجمن کے نئے عہدہ داروں کو ان کے انتخاب پر مبارکباد دیتے ہوئے فرمایا کہ "مجھے آج بہت خوشی ہے کہ انجمن اتحاد جو کچھ عرصے کے لئے غروب ہو گئی تھی، پھر طلوع ہو گئی ہے۔ مگر اس خوشی کے ساتھ کچھ خوف بھی ہے۔ وہ یہ کہ آج کل کالجوں کی بزم یا انجمن اتحاد جھگڑے اور فساد کا باعث ہوتی ہے۔ یہ مسئلہ صرف تعلیم گاہوں کا ہی

نہیں ہے، بلکہ سارے ملک کی فضا ہی کچھ ایسی ہے۔ اگر یہ اختلافات ــــ چاہے طالب علموں میں ہوں یا لیڈروں، اور بزرگوں میں ــــ اصولی ہوتے تو فوری طور پر چاہے جتنا بھی نقصان ہوتا، مگر آئندہ چل کر فائدہ ہوتا۔ کیونکہ جب دو اصولوں میں ٹکر ہوتی ہے تو بہتر اصول کی جیت ہوتی ہے، مگر چونکہ یہ اختلافات ذاتی اور شخصی ہوتے ہیں، اس لئے ان سے نقصان ہی نقصان ہوتا ہے۔ ملک میں جو اختلافات کی فضا نظر آتی ہے، وہ بہت بڑا تعطل کا باعث ہے۔ اس نے ہماری تہذیبی قدروں کو تباہ کر دیا ہے۔ تہذیب شائستگی، مذہب اور اخلاق کی کوشش یہ رہی ہے کہ فطری برائیوں کو دور کیا جائے۔ ان برائیوں میں نفسانیت اور انانیت نے سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ ہماری تہذیب یہ تھی کہ خود پیچھے ہو جاتے اور دوسروں کو آگے بڑھا دیتے۔ کہا جاتا۔ پہلے آپ، پہلے آپ۔ مگر اب تمام قدروں کو روندکر آگے بڑھنے کی کوشش کی جاتی ہے اور زبان حال سے کہا جاتا ہے پہلے ہم، پہلے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ میں قدیم روایت باقی رہے گی کہ آپ پہل نہ کریں گے اور نہ دوسروں کو دکھا دے کر آگے بڑھنے کی کوشش کریں گے۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ کے انتخابات بغیر جھگڑے اور بغیر مقابلے کے ہو گئے۔ مجھے امید ہے کہ آپ کی یہ یکجہتی باقی رہے گی۔ جامعہ پر بہت بڑی ذمہ داری آنے والی ہے، اس سے جامعہ کے لوگ اسی وقت عہدہ برا ہو سکتے ہیں، جب اس کے اساتذہ، کارکنوں اور طالب علموں میں مکمل اتفاق و اتحاد ہو اور سب لوگ کاندھے سے کاندھا ملا کر کام کریں۔"

(ع ل ا)

اُستادوں کے مدرسہ میں یوم انسانی حقوق

۱۰ ردسمبر ۱۹۶۱ء کو ٹیچرس کالج کی طرف سے "یوم انسانی حقوق *Human Rights Day* منایا گیا۔ اس موقع پر شری رامچندرن جی سکریٹری گاندھی سمارک ندھی، نئی دہلی نے، مندرجہ بالا موضوع پر بصیرت افروز تقریر فرمائی۔ شری رام چندرن نے اس بات پر خاص طور سے زور دیا کہ صحیح قسم کی تعلیم سے ہی انسانی حقوق کا تحفظ یقینی طور پر کیا جا سکتا ہے۔ اس پروگرام میں انگریزی میں مضمون نویسی اور ہندوستانی میں تقریروں کا انعامی مقابلہ بھی شامل تھا۔ ہمارے کالج کے جونیر اور سینیر ڈپلوما کورس کے طلبا نے ان مقابلوں میں حصہ لیا۔ بہترین کامیابی حاصل کرنے والے تین تین امیدواروں کو ہر ایک

مقابلے میں انعام کے طور پر کتابیں پیش کی گئیں۔ تقسیم انعامات کی یہ رسم ہمارے خصوصی مہمان شری رامچندرن جی کے ہاتھوں انجام پائی۔ (س)

تقسیم سرٹیفکیٹ کی تقریب

۱۰ دسمبر کو ایک مختصر سی تقریب میں ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب، قائم مقام شیخ الجامعہ نے یوتھ فیسٹیول میں شرکت کرنے والے طلبہ اور طالبات کو سرٹیفکیٹ تقسیم کئے۔ اس کے بعد ان طالب علموں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ سرٹیفکیٹ جو آپ کو دئے گئے، ان تمغوں کے مانند ہیں، جو ہماری مشرقی سرحد، نیفا سے ہو کر آنے والے فوجی سپاہیوں کو دئے جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو فیسٹول میں شرکت کا موقع ملا۔ جو آپ کی زندگی کی سرحد کو وسعت دیتا ہے۔ یوتھ فیسٹول کا اصل مقصد یہ ہے کہ ہمارے دیش کے مختلف حصوں کے لوگ اکٹھا ہوں۔ اگرچہ آمدورفت کی سہولت کی وجہ سے میل ملاقات کی بہت سی صورتیں نکل آئی ہیں، مگر پھر بھی نوجوان طالب علموں کو اس کے مواقع بہت کم ملتے ہیں اور نئے ہندوستان میں، جہاں قومی اتحاد اور یکجہتی کی سخت ضرورت ہے، اس کے لئے یہ بہت اچھا ذریعہ ہے۔ ہمارے دیش کا کلچر اگرچہ الگ الگ ہے، مگر ان سب کی روح ایک ہے۔ چنانچہ ہندوستان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کثرت میں وحدت کا نظارہ دکھائی دیتا ہے۔ یوتھ فیسٹول کے اجتماع کا مقصد یہ ہے کہ ملک کی مختلف ریاستوں کے لوگ ایک دوسرے سے ملیں اور سوچیں کہ یہ سب تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ ایک ہی تہذیب رکھتے ہیں۔" تعلیم کے مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے موصوف نے فرمایا کہ "تعلیم کا تصور بہت وسیع ہے۔ اس میں وہ تمام مقاصد شامل ہیں جنھیں کلچرل مشاغل، ڈرامے، مباحثے وغیرہ کہتے ہیں، لیکن دوسرے مشاغل کے لئے، جو تعلیم کا اہم جزو ہیں، کوئی موقع نہیں ملتا تھا۔ یوتھ فیسٹیول کا ایک مقصد اس ضرورت کو پورا کرنا بھی ہے۔" اپنی تقریر کو ختم کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ شرکت کا مقصد صرف انعام حاصل کرنا نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اس سے بلند ہو کر پوری تیاری کے ساتھ شریک ہونا چاہیئے اور اس کی کوشش ہونی چاہیئے کہ آپ جو چیز بھی پیش کریں اس کا حاضرین پر اچھا اثر پڑے قطع نظر اس کے کہ انعام ملتا ہے یا نہیں۔ میر نے کہا ہے کہ

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میر
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

کامیابی اور ناکامی، شکست وفتح کے مختلف اسباب ہوتے ہیں بہرحال "دلِ ناتواں کو مقابلہ خوب کرنا چاہیئے"

اس سے قبل یوتھ فیسٹیول کمیٹی کے داعی جناب عبداللہ ولی بخش قادری صاحب نے شیخ الجامعہ صاحب سے سرٹیفکیٹ تقسیم کرنے کی درخواست کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "جامعہ میں کتابی تعلیم کے علاوہ غیر رسمی طور پر تعلیمی مقاصد کو پورا کرنے کی ہمیشہ کوششیں ہوتی رہی ہیں اور غیر نصابی مشاغل کی یہاں ہمیشہ ہمت افزائی کی گئی ہے اور اس پر زور دیا گیا ہے لیکن اس صورت میں افراد کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے۔ اب تک ہمارے یہاں طلبہ کی تعداد بہت زیادہ نہیں تھی، اس لئے اساتذہ کو شخصی اور خصوصی توجہ کرنے کا پورا موقع حاصل تھا، لیکن اب ان کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے، اور آئندہ اس تعداد میں بہت بڑے اضافے کی توقع ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ طلبہ کی تہذیبی زندگی کو بہتر بنانے اور تفریحی مشاغل کو زیادہ منظم اور باقاعدہ بنانے کی طرف توجہ کی جائے۔ یوتھ فیسٹول کی شرکت اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ مجھے امید ہے کہ آیندہ مزید تیاری کے ساتھ اور ایک منصوبے کے ماتحت اس میں شرکت کی جائے گی"۔

(ع ل ا)

(بقیہ تنقید وتبصرہ (صفحہ ۱۶۱)

تبصرہ کے شروع میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ کسی زندہ شخص کی زندگی ہی میں خاص نمبر نکالنے سے یہ فائدہ ہو سکتا ہے کہ غلط واقعات کی تصحیح اور بے بنیاد افواہوں کی تردید کا اچھا موقع ہوتا ہے، مگر اس نمبر میں اس طرح کی کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے، بلکہ ایک ہی واقعہ کے متعلق دو متضاد بیانات بغیر کسی اختلافی یا توضیحی نوٹ کے شائع کر دئے گئے ہیں۔ اسی طرح ۱۹۶۱ء کے شروع میں جوش صاحب ہندوستان آئے تو یہاں کے متعدد اخبارات نے لکھا کہ وہ ہندوستانی شہریت حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کے متعلق ایک روزنامہ کا اداریہ اس نمبر میں نقل کیا گیا ہے لیکن اس کی تردید یا وضاحت میں نہ تو جوش صاحب کی طرف سے کوئی چیز شائع کی گئی ہے اور نہ ادارہ کی طرف سے۔ حالانکہ ضرورت تھی کہ یا تو اس کا جواب شائع کیا جاتا یا سرے سے اس اداریہ کو شائع ہی نہ کیا جاتا ——— بہرحال اس میں شبہ نہیں کہ اس نمبر میں حضرت جوش صاحب کے بارے میں بہت کافی مواد جمع کیا گیا ہے اور جوش کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے کے لئے اسوقت اس سے بہتر کوئی اور چیز نہیں ہے۔

سنہ ۱۹۶۱ء کے اُردو ادب کا جائزہ

ہم نے اس سے قبل اعلان کیا تھا کہ رسالہ جامعہ کے سالنامہ میں سنہ ۱۹۶۱ء کے ادبی تعلیمی اور سیاسی حالات کا جائزہ لیا جائے گا، مگر رسالہ کی مالی حالت کے پیش نظر بہت ضخیم نمبر نکالنا ممکن نہیں ہے، اس لئے اب صرف اُردو ادب کی رفتار ترقی کا جائزہ لیا جائے گا۔ اس خاص نمبر کے مجوزہ مضامین اور مضمون نگار حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ پاکستان کی اردو مطبوعات پر ایک نظر	ڈاکٹر عبادت بریلوی
۲۔ تعلیمی کتابیں	ڈاکٹر سلامت اللہ
۳۔ علمی و مذہبی کتابیں	جناب ضیاء الحسن فاروقی
۴۔ تنقید و تحقیق	جناب راجندر ناتھ شیدا
۵۔ ناول و افسانے	ڈاکٹر قمر رئیس
۶۔ ڈرامے	ڈاکٹر محمد حسن
۷۔ طنز و مزاح	جناب فرقت کاکوروی
۸۔ تراجم	عبداللطیف اعظمی
۹۔ بچوں اور بالغوں کی کتابیں	جناب محمد حسین حسان
۱۰۔ اُردو شاعری	جناب رشید حسن خاں
۱۱۔ سنہ ۱۹۶۱ء میں جن ادیبوں کا انتقال ہوا	جناب عابد رضا بیدار
۱۲۔ مطبوعات سنہ ۱۹۶۱ء پر ایک نظر	ع ل ا

رُباعیاتِ حکیم عُمر خیّام

۳۱۰ صفحات پہ پھیلی ہوئی عُمرِ خیّام کی رُباعیوں اور اُن کی دلکش تصویروں کا یہ حسین وجمیل مُرقّع کسی تعریف وتحسین کا محتاج نہیں۔ طاہر ایران کمپنی (طہران) نے فارسی اور عربی زبان کے ساتھ ساتھ ان رُباعیوں کا فرنچ اور جرمن میں ترجمہ پیش کرکے عُمرِ خیّام کی خدمت میں بیش بہا ہدیۂ عقیدت پیش کیا ہے۔ اور اکبر تجویدی کی مُصوّر رباعیوں" نے تو کتاب کی خوب صورتی میں چار چاند لگا دئے ہیں۔

قیمت:۔ ۲۵ روپے

(یہ کتاب ہندوستان میں پہلی بار برائے فروخت آئی ہے)

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

Printer & Publisher : A. L. Azmi
Printed at : Union Printing Press, Delhi-6.
Only cover printed at : Dayals' Printing Press,

The Monthly JAMIA
P. O. Jamia Nagar, New Delhi-25

سالنامہ

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

خط وکتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر۔ نئی دہلی
P. O. JAMIA NAGAR, NEW DELHI-25

سالنامہ

جامعہ

قیمت سالنامہ
ایک روپیہ

سالانہ چندہ
چھے روپے

جلد ۴۶ | بابت ماہ فروری سنہ ۱۹۶۲ء | شمارہ ۴، ۵

فہرست مضامین

پاکستان کی اُردو مطبوعات پر ایک نظر

ڈاکٹر عبادت بریلوی

پاکستان میں آج کل ہر سال اردو کی بے شمار کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ ان میں معیاری اور غیر معیاری ہر قسم کی کتابیں شامل ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان میں زیادہ تعداد عام طور پر غیر معیاری کتابوں کی ہوتی ہے جو محض کاروباری مقصد سے شائع کی جاتی ہیں۔ لیکن ایسی کتابوں کی بھی کمی نہیں ہے جن کو شائع کرنے کا مقصد علمی اور ادبی ہوتا ہے۔ علمی و ادبی کتابیں کچھ تو وہ ادارے شائع کرتے ہیں جن کو خود حکومت نے قائم کیا ہے۔ یا پھر وہ ادارے ہیں جن کو حکومت کی طرف سے مالی امداد ملتی ہے۔ ان میں ادارۂ ثقافت اسلامیہ، مجلس ترقی ادب، بزم اقبال، اردو اکیڈمی، مغربی پاکستان، پنجابی اکیڈمی، پشتو اکیڈمی، اردو اکیڈمی بہاول پور، ترقیٔ اردو بورڈ کراچی، اقبال اکیڈمی پاکستان کراچی وغیرہ خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ بعض ایسے ادارے بھی ہیں جن کے پیش نظر اردو زبان کی خدمت ہے اور جو اسی جذبے سے اُردو کی علمی و ادبی کتابیں شائع کرتے ہیں۔ ان میں انجمن ترقی اُردو پاکستان کراچی اور اکادمی پنجاب لاہور خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ بعض ناشر بھی ایسے ہیں جو باوجود اپنی کاروباری مصروفیتوں کے علمی اور ادبی کتابیں شائع کرتے رہتے ہیں۔ ان میں اُردو اکیڈمی سندھ کراچی، اُردو دنیا کراچی، اُردو مرکز لاہور، مکتبۂ جدید لاہور، مکتبۂ اُردو لاہور، نیا ادارہ لاہور، فیروز سنز لاہور اور شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور وغیرہ کا نام سرِفہرست ہے۔ سنہ ۱۹۶۱ء میں بھی یہی ادارے علمی اور ادبی کتابیں شائع کرنے میں پیش پیش رہے ہیں۔ اور انھوں نے سینکڑوں کی تعداد میں ایسی علمی اور ادبی کتابیں شائع کی ہیں جن سے پاکستان کے علمی اور ادبی ماحول پر روشنی پڑتی ہے۔

گزشتہ کئی سال سے پاکستان میں کلاسیکی اور اُردو ادب کی ان کتابوں کو از سرِ نو شائع کرنے

کی ضرورت شدت سے محسوس کی جاتی رہی ہے جو عرصہ ہوا چھپی تھیں، لیکن اب نایاب ہیں۔ چنانچہ لاہور میں مجلس ترقیٔ ادب نے اور کراچی میں ترقیٔ اُردو بورڈ اور انجمن ترقیٔ اُردو پاکستان نے کلاسیکی ادب کو از سرِ نو شائع کرنے کے منصوبے بنائے۔ گزشتہ سال اس منصوبے نے عملی شکل اختیار کی اور لاہور اور کراچی دونوں مقامات سے بعض اہم کتابوں کے سستے اڈیشن شائع ہوئے۔ مجلس ترقیٔ ادب لاہور نے "مسافران لندن" کے نام سے سرسیّد کا سفرنامہ شائع کیا۔ اس کتاب میں سرسیّد کے سفرِ لندن کے حالات ہیں اور اب یہ پہلی بار کتابی صورت میں شائع ہوئے ہیں۔ ماسٹر پیارے لال آشوب اور کرنل ہالرائیڈ نے مل کر جو کتاب "رسوم ہند" کے نام سے مرتب کی تھی اور جو اس سے قبل شائع بھی ہو چکی تھی وہ اب مجلس ترقیٔ ادب لاہور سے از سرِ نو شائع ہوئی ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد کی کتاب "قصص ہند" عرصے سے نایاب تھی۔ گزشتہ سال اس کو مکمل صورت میں مجلس نے شائع کر دیا ہے۔ مولانا حالی کی حیات سعدی اور سوانح مولانا روم کے نئے اڈیشن بھی چھپ کر شائع ہوئے ہیں۔ ناولوں میں نذیر احمد کے ابن الوقت اور شرر کے فردوس بریں کو شائع کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ داغ کا دیوان مہتاب داغ اور دیوان خواجہ میر درد صحت کے ساتھ چھاپے گئے ہیں۔ مہاکوی کالی داس کا ڈرامہ وکرم اُروسی جس کا ترجمہ عزیز مرزا لکھنوی نے کیا تھا، اور جو عرصے سے نایاب تھا اب اس کا نیا اڈیشن شائع ہوا ہے۔ بزمِ اقبال لاہور نے علامہ اقبالؒ کے جاوید نامہ کا ترجمہ بھی انگریزی میں شائع کر دیا ہے۔ اس کے مترجم عبدالکریم خاں ہیں اور انھوں نے علامہ کی فارسی نظموں کو انگریزی نظم کے سانچے میں بڑی خوبی سے ڈھالا ہے۔

کراچی میں جو ترقیٔ اُردو بورڈ اُردو لغت کا کام کر رہا ہے۔ اس نے لغات کے دو حصّوں کے علاوہ گزشتہ سال اُردو کی چند نایاب کتابوں کو شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ ان میں نذیر احمد کی منتخب الحکایات اور مراۃ العروس خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ منتخب الحکایات کو شاہد احمد دہلوی نے مرتب کیا ہے۔ شروع میں مقدمہ اور آخر میں فرہنگ بھی شامل ہے۔ مراۃ العروس کو ڈاکٹر بیگم شائستہ اکرام اللہ نے مرتب کیا ہے۔ یہ کتاب بھی مقدمہ اور فرہنگ کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ راشد الخیری کی کتاب منازل السائرہ بھی ترقیٔ اُردو بورڈ کے زیرِ اہتمام شائع ہوئی ہے۔ اس کو

زاق الخیری صاحب نے مرتب کیا ہے اور اُن کے مقدمہ و فرہنگ کے ساتھ یہ بھی کراچی سے شائع ہوئی ہے۔

یہ کام اپنی جگہ اہم ہے۔ کیونکہ اس طرح اُردو کی بعض ایسی کتابیں جو عرصہ ہوا شائع ہو کر نایاب ہوگئی تھیں اب از سر نو شائع ہوگئی ہیں لیکن ابھی تک اردو شاعروں کے بہت سے دیوان اور تذکرے اور بعض داستانیں اور قصے کہانیاں غیر مطبوعہ ہیں۔ بے شمار مخطوطے ہندوستان، پاکستان اور انگلستان کے کتب خانوں میں ایسے ہیں جن کی اشاعت اردو کلاسیکی ادب کے سرمائے میں بہت بڑا اضافہ ثابت ہوسکتی ہے۔ اگر یہ ادارے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیتے تو شاید انھیں ایک اہم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کا موقع ملتا۔

گزشتہ سال علمی، ادبی اور تنقیدی کتابیں ہمارے یہاں خاصی تعداد میں شائع ہوئی ہیں انجمن ترقی اردو پاکستان اس کام میں پیش پیش رہی ہے۔ قاموس الکتب کی ترتیب و تدوین کا کام عرصے سے بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب مرحوم کی زیر نگرانی ہو رہا تھا۔ انتظام اللہ شہابی اس کام میں اُن کے دست راست کی حیثیت رکھتے تھے۔ اب یہ قاموس الکتب بڑے سائز کے کئی ہزار صفحات پر چھپ کر شائع ہوئی ہے۔ اس میں صرف اُردو کی کتابوں کا تذکرہ ہے —— ابتدا میں بابائے اُردو کا مقدمہ بھی شامل ہے —— بابائے اُردو مرحوم کی کتاب 'قدیم اُردو' بھی گزشتہ سال انجمن نے شائع کی ہے۔ اس میں ان کے وہ مقالات شامل ہیں جو انھوں نے قدیم اُردو کے شاعروں اور نثر نگاروں پر لکھے تھے۔ حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق رح، حضرت شاہ برہان الدین جانم رح حضرت شاہ امین الدین اعلیٰ رح، شاہ علی محمد جیو گام دھنی رح، میاں شیخ خوب محمد چشتی رح، حسن شوقی، قاضی محمود دریائی، مُلّا اشرفی، سید احمد ہنر، علی احسان، پُرانی اُردو میں قرآن مجید کے ترجمے اور تفسیریں دکنی اُردو میں شاہنامے کی داستانیں، اُردو زبان کا اپنا قدیم کتبہ، کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ مثنوی خالق باری، شرح تمہید ہمدانی، مثنوی وفات نامہ حضرت فاطمہ، مُلّا وجہی کی سب رس اور سب رس منظوم۔ اس مجموعے کے اہم مقالات اور تبصرے ہیں۔ اس کے علاوہ انجمن نے وحید الدین سلیم کے متفرق مضامین بھی مضامین سلیم کے نام سے یکجا کر کے شائع کئے ہیں۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری کی کتاب غالب کا فکر و فن بھی انجمن سے شائع ہوئی ہے۔ ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب

کی کتاب سرشار کی ناول نگاری بھی گزشتہ سال شائع ہوئی ہے ــــ یہ ۴۱۶ صفحے کی بسوط کتاب ہو جس میں سرشار کے فن کا تنقیدی مطالعہ ہے۔ انجمن نے نئی علمی کتابیں شائع کی ہیں ان میں کارل مارکس کی کتاب داس کیپٹل' کا اردو ترجمہ قابل ذکر ہے۔ اس کا ترجمہ سید محمد تقی صاحب نے کیا ہو اور اس پر جو محنت کی ہے اس کا اندازہ کتاب کو دیکھ کر ہی ہو سکتا ہے۔ انجمن نے گزشتہ سال اپنی بعض نایاب کتابوں کے نئے اڈیشن بھی شائع کئے ہیں۔ راقم کی کتاب اردو تنقید کا ارتقاء قیام پاکستان کے فوراً بعد انجمن سے شائع ہوئی تھی۔ بہت تھوڑے عرصے میں اس کا اڈیشن ختم ہوگیا تھا اور وہ ایک زمانے سے نایاب تھی۔ انجمن نے اس کا نیا اڈیشن شائع کر دیا ہے لیکن افسوس ہے کہ یہ کتاب نظر ثانی کے بغیر چھپی ہے۔ یہ کتاب آج سے سترہ اٹھارہ سال قبل لکھی گئی تھی۔ اس عرصہ میں اردو تنقید میں خاصہ کام ہوا ہے۔ اس لئے اس میں ترمیم و اضافہ ضروری تھا۔ اب انشاء اللہ جلد اس کا نیا اڈیشن ترمیم و اضافہ کے بعد راقم کی نگرانی میں شائع ہوگا۔ ارسطو کی بوطیقا ترجمہ عزیز احمد بھی عرصہ سے نایاب تھی۔ انجمن نے یہ کتاب بھی از سر نو شائع کردی ہے۔

اُردو دنیا کراچی نے گزشتہ سال راقم کی دو کتابیں شائع کی ہیں۔ ایک تو جدید شاعری' اور دوسری مومن اور مطالعۂ مومن' ــــ جدید شاعری بڑے سائز پر ساڑھے چھ سو صفحات کی ضخیم کتاب ہے۔ اس میں ۱۸۵۷ء سے لے کر اس وقت تک کی جدید شاعری کے رجحانات اور جدید شعرا کے کارناموں کا تنقیدی تجزیہ ہے۔ جدید شاعری کے مسائل پر بھی اس میں بحث ہے اور تمام جدید شعراء کے حالات بھی درج ہیں ــــ 'مومن اور مطالعہ مومن' میں انیسویں صدی کی دلی کے مشہور شاعر حکیم محمد مومن خاں مومن دہلوی کے حالات، ان کی شخصیت، فارسی و اردو تصانیف، غزل گوئی، مثنوی نگاری اور ادبی اہمیت کا جائزہ ہے ــــ اس کی ضخامت ساڑھے پانچ سو صفحات ہے اور یہ بھی بڑے سائز پر چھپی ہے۔

کراچی کا ایک اور ادارہ اُردو اکیڈمی سندھ بھی گزشتہ سال علمی تحقیقی اور تنقیدی کتابیں شائع کرنے میں پیش پیش رہا ــــ اس ادارے نے جو علمی کتابیں شائع کیں ان میں تذکرہ صوفیائے سندھ اور تاریخ تعلیم اہمیت رکھتی ہیں ــــ اول الذکر میں سندھ کے صوفیا کے حالات ہیں ــــ یہ اعجاز الحق ق[illegible]

کی تالیف ہے اور انھوں نے اس کتاب پر خاصی محنت کی ہے۔ آخرالذکر کتاب کے مولف خالد یار خاں صاحب ہیں۔ انھوں نے قدیم زمانے سے کر اس وقت تک کے تعلیمی نظریات کو اس کتاب میں بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے ــــ ادبی اور تنقیدی کتابوں میں دکنی ادب کی تاریخ، مکتوبات بابائے اُردو، داستان سے افسانے تک، اُردو ادب میں سوانح نگاری کا ارتقا، علمی نقوش، اُردو کی تین مثنویاں، تخلیق و تنقید اور انتخاب خطوط غالب اور مقالات یوم شبلی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ دکنی ادب کی تاریخ کوئی دو سو صفحے کی مختصر سی کتاب ہے جس کے مولف ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ہیں۔ اس میں بہمنی عہد قطب شاہی، عادل شاہی عہد اور مغلیہ عہد کی دکنی شاعری اور نثر کا تاریخی اور تنقیدی جائزہ ہے۔ مکتوبات بابائے اُردو حکیم امامی بنگلوری صاحب کی تالیف ہے۔ دو سو صفحے کی اس مختصری کتاب میں انھوں نے وہ خطوط جمع کر دئے ہیں جو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے انھیں اپنی زندگی میں لکھے تھے ــــ یہ خطوط نجی ہیں لیکن ان میں جگہ جگہ ایسے بیانات ہیں جن سے لسانی، ادبی اور تنقیدی معاملات و مسائل پر روشنی پڑتی ہے۔ داستان سے افسانے تک سید وقار عظیم صاحب کی تالیف ہے۔ بڑے سائز پر چھپی ہوئی کوئی چار سو صفحات کی یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک ہی کتاب ہے۔ اُردو ادب میں سوانح نگاری کا ارتقا، الطاف فاطمہ کا وہ مقالہ ہے جو انھوں نے ایم اے کے امتحان کے لئے لکھا تھا گزشتہ سال یہ کتابی صورت میں شائع ہوا ہے۔ اس میں اُردو سوانح نگاری کا تاریخی اور تنقیدی جائزہ ہے۔ چھوٹے سائز کے ساڑھے تین سو صفحے کی یہ کتاب اپنی جگہ مکمل ہے اور اس سے اردو سوانح نگاری کے ارتقائی مدوجزر کا پوری طرح اندازہ ہو جاتا ہے۔ علمی نقوش "ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب کے تحقیقی اور تنقیدی مقالات کا مجموعہ ہے۔ اس میں بعض مضامین مثلاً ولی ویلوری کی تین مثنویاں، ولی گجراتی کا غیر مطبوعہ کلام خاکی، حضرت شرف الدین یحییٰ "منیری کے فالنامے ملفوظات شیخ وجیہہ الدین گجراتی، اُردو املا کی تاریخ، میر کی مثنوی دریائے عشق کا ایک ماخذ عبدالحئی تاباں۔ متین برہانپوری کے اردو مرثیے اور خلاصۃ الاخیار قابل ذکر ہیں ــــ اردو کی تین مثنویاں رشید اللہ خاں صاحب کے تین مضامین کا مجموعہ ہے اس میں میر حسن کی سحرالبیان یا تنکر نسیم کی گلزار نسیم اور زہر عشق کا تنقیدی مطالعہ ہے۔ تخلیق و تنقید" عبدالسلام صاحب کے

تنقیدی مضامین کا مختصر سا مجموعہ ہے۔ اس میں ابن الوقت فردوس بریں، امراؤ جان ادا، خواجہ میر درد، رقعات غالب، غالب کا نظریۂ عشق، فسانۂ عجائب، آتش، اختر شیرانی کا مطالعہ ہے۔ یہ مضامین طالب علموں کے لئے لکھے گئے ہیں اور اس اعتبار سے مفید ہیں۔ راقم کا مرتب کیا ہوا غالب کے خطوط کا انتخاب کوئی چھ سات سال قبل اردو اکیڈمی سندھ کراچی سے شائع ہوا تھا۔ اب اس کا نیا اڈیشن شائع کیا گیا ہے۔ غالب کے خطوط کا یہ انتخاب اس طرح کیا گیا ہے کہ اس سے غالب کی زندگی کے حالات سامنے آجاتے ہیں۔ انھوں نے جو کچھ اپنے بارے میں لکھا ہے اس کو ان کے خطوط سے نکال کر اس مجموعے میں کچھ اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ یہ کتاب ان کی آپ بیتی معلوم ہوتی ہے شروع میں خطوط غالب کی اہمیت کے بارے میں ایک مفصل مقدمہ بھی شامل ہے۔

"مقالات یوم شبلی" کو اردو اکیڈمی سندھ کی شاخ اردو مرکز لاہور نے شائع کیا ہے۔ یہ کتاب بڑے سائز پر خوبصورت ٹائپ میں چھپی ہے۔ تین سو صفحے کی اس کتاب میں وہ مضامین شامل ہیں جو اسلامیہ کالج چینوٹ کے رسالے "البصیر" کے شبلی نمبر میں شائع ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ کچھ نئے مضامین کا اس مجموعے میں اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ اس کے مرتب اسلامیہ کالج چینوٹ کے استاد عبیداللہ خاں صاحب ہیں اور انھوں نے اس میں شبلی کی تصانیف، شبلی کی سیاسی شاعری شبلی کی تنقید نگاری، مقالات شبلی، شبلی اور سیرۃ النبی، علی گڑھ میں شبلی کا قیام کے ایسے اہم موضوعات پر معروف لکھنے والوں کے مقالات جمع کر دیئے ہیں۔

اردو اکیڈمی سندھ اور اردو مرکز کے علاوہ بعض دوسرے اداروں نے بھی کچھ علمی اور ادبی کتابیں شائع کی ہیں۔ کراچی کے ایک ناشر نے حکومت پاکستان کی مدد سے نوراللغات کی تمام جلدیں شائع کر دی ہیں۔ آخری جلد گزشتہ سال شائع ہوئی ہے۔ اس طرح نوراللغات اب نایاب نہیں رہی۔ پاکستان ایجوکیشنل پبلشرز کراچی نے تاریخ ادب اردو کی پہلی جلد شائع کی ہے۔ اس کو عبدالقیوم صاحب نے مرتب کی ہے اور اس میں ابتدا سے ۱۷۰۰ء تک کے اردو ادب کا تاریخی جائزہ ہے۔ انجمن مصنفین پاکستان (پاکستانی رائٹرز گلڈ) کے اشاعت گھر نے ڈاکٹر سید شاہ علی کی کتاب 'اردو میں سوانح نگاری' شائع کر دی ہے۔ یہ کتاب دراصل پی ایچ ڈی کا

مقالہ ہے جو انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی میں پیش کیا تھا۔ اب یہ کتابی صورت میں چھپا ہے۔ اس میں اُردو سوانح نگاری کا تاریخی و تنقیدی جائزہ ہے جس کو مؤلف نے محنت سے تیار کیا ہے۔

علامہ اقبالؒ کے فکر و فن پر ہمارے یہاں آج کل خاصا کام ہو رہا ہے۔ بزمِ اقبال لاہور اور اقبال اکیڈمی کراچی نے علامہ کے بارے میں اب تک بعض اہم کتابیں چھاپی ہیں۔ لاہور سے پروفیسر عابد علی عابد کی کتاب شعرِ اقبال اور سید نذیر نیازی کی کتاب تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ اس سے قبل شائع ہو چکی ہیں۔ اول الذکر علامہ کے فن کا تنقیدی جائزہ ہے اور آخر الذکر علامہ کے انگریزی لکچروں کا اردو ترجمہ ہے جس کو سید نذیر نیازی صاحب نے اُردو کا جامہ پہنایا ہے۔ گزشتہ سال جاوید نامے کے ترجمے کے علاوہ لاہور کی بزمِ اقبال نے کوئی قابلِ ذکر کتاب شائع نہیں کی۔ البتہ کراچی کی اقبال اکیڈمی نے علامہؒ کے بارے میں بعض اہم کتابیں چھاپی ہیں۔ ان میں ڈاکٹر نور الدین کی کتاب تصوف اور علامہ اقبال، ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کی کتاب اقبال کے آخری دو سال، نظر حیدر آبادی کی کتاب "اقبال اور حیدر آباد"، محمد عثمان صاحب کی "اسرار و رموز پر ایک نظر"، رئیس احمد جعفری صاحب کی "اقبال اور سیاست ملی" اور علامہ اقبال کی کتاب "علم الاقتصاد" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کتابوں سے علامہ کی زندگی ان کی شخصیت اور فن کے بعض نئے گوشے ہمارے سامنے آتے ہیں۔

تحقیق و تنقید کے ساتھ ساتھ ہلکے پھلکے مضامین، خاکے اور انشایئے بھی گزشتہ سال ہمارے یہاں خاصی تعداد میں شائع ہوئے ہیں۔ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب مرحوم کی کتاب "چند ہم عصر" کا نیا اڈیشن اس سال پھر شائع ہوا ہے۔ اس سے قبل مولوی صاحب کے یہ دلچسپ خاکے انجمن ترقیٔ اُردو سے شائع ہوئے تھے۔ اب ان کو اردو اکیڈمی سندھ کراچی نے شائع کیا ہے۔ فرحت اللہ بیگ کا خاکہ "نذیر احمد کی کہانی" بھی اسی ادارے سے شائع ہوا ہے دلی کا ایک یادگار مشاعرہ اکیڈمی لائبریری کی سیریز میں از سرِ نو چھاپا گیا ہے — جگر صاحب مرحوم کی شخصیت پر ایک مختصر سی کتاب تذکرۂ جگر کے نام سے محمود علی خاں صاحب جامعی نے لکھی ہے۔ اس لئے بہت دلچسپ ہے۔ ضیاء الدین احمد برنی صاحب کی کتاب عظمتِ رفتہ "تعلیمی مرکز کراچی

سے شائع ہوئی ہے۔ ۵۱۲ صفحے کی یہ کتاب ٹائپ میں بہت خوب صورت چھپی ہے۔ اس کتاب میں برنی صاحب نے ان شخصیتوں کے حالات لکھے ہیں جن کو انھوں نے دیکھا یا جن سے انھیں ملنے کا موقع ملا ــــ ۹۳ شخصیتوں پر انھوں نے اس کتاب میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان مضامین کو پڑھ کر ان شخصیتوں کی تصویریں سامنے آجاتی ہیں۔ شخصیتوں میں سیاسی رہنما، معلم، ادیب، شاعر، صحافی، سب ہی شامل ہیں۔ بیسویں صدی کے ہندوستان کی شاید ہی کوئی اہم شخصیت ہو جس پر برنی صاحب نے اظہار خیال نہ کیا ہو ــ ہلکے پھلکے مضمون اور انشائیوں کے تین مجموعے گزشتہ سال شائع ہوئے ہیں۔ ایک تو نظیر صدیقی کا "شہرت کی خاطر" دوسرے مشتاق احمد یوسفی کا "چراغ تلے" اور تیسرے وزیر آغا کا "خیال پارے"۔ "شہرت کی خاطر" ہلکے پھلکے مضامین کا مجموعہ ہے، جس میں جگہ جگہ مزاح کا پہلو اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ اس کو پاک کتاب گھر پلٹن لین ڈھاکہ مشرقی پاکستان نے شائع کیا ہے ــــ "چراغ تلے" مکتبۂ جدید لاہور سے شائع ہوا ہے۔ یہ بھی چند ہلکے پھلکے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے ہر مضمون کو پڑھ کر طبیعت باغ باغ ہو جاتی ہے اور ہنسنے کو جی چاہتا ہے۔ اسلوب اور انداز بیان میں بھی ایک انفرادی شان ہے۔ "خیال پارے" میں وزیر آغا صاحب کے کچھ انشائیے شامل ہیں۔ انشائیوں کے اس مختصر مجموعے کو اکیڈمی پنجاب لاہور نے شائع کیا ہے۔ یہ انشائیے انگریزی کے (LIGHT ESSAY) کے طرز پر لکھے گئے ہیں اور اردو میں ایک نیا تجربہ ہیں۔ اس لحاظ سے ان میں دلچسپی کا خاصا سامان ہے۔

ناولوں کا بازار اگرچہ اب بڑی حد تک سرد ہو گیا ہے لیکن اب بھی تاریخی یا جنسی اور رومانی ناول عام پڑھنے والوں کے لئے شائع ہو رہے ہیں۔ ان میں ایسے ناول نہ ہونے کے برابر ہیں جن میں ناول کی فنی اقدار موجود ہوں۔ گزشتہ سال بھی ایسے کئی ناول شائع ہوئے ہیں۔ قدیم ناولوں میں منشی سجاد حسین کا مزاحیہ ناول "حاجی بغلول" از سر نو شائع ہوا ہے۔ جمیل جالبی صاحب نے مقدمہ اور فرہنگ کے ساتھ اس کو کراچی سے شائع کیا ہے۔ نذیر احمد "توبۃ النصوح" اور "فسانۂ مبتلا" کے بھی نئے اڈیشن شائع ہوئے ہیں۔ مرزا محمد ہادی رسوا کے ناول "امراؤ جان ادا"، "شریف زادہ"، "ذات شریف" اور "اختری بیگم" کو بھی از سر نو شائع کیا گیا ہے ــــ ان ناولوں کے سستے اڈیشن اردو اکیڈمی سندھ کراچی نے شائع کئے ہیں اور مستحسن اقدام ہے۔ نئے لکھنے والوں کے معیاری ناول گزشتہ سال بہت کم منظر عام پر آئے ہیں۔ کر

ئے دو ناول "سڑک واپس جاتی ہے" اور "ایک عورت ہزار دیوانے" مکتبۂ افکار کراچی سے شائع ہوئے ہیں۔ ان دونوں ناولوں میں رومان و حقیقت کا حسین امتزاج موجود ہے۔ ان دونوں پہلوؤں کی دھوپ چھاؤں کو یک جا کرنا کرشن چندر کے فن کا نمایاں ترین وصف ہے۔ "سڑک واپس جاتی ہے" میں بمبئی میں فٹ پاتھ پر زندگی بسر کرنے والوں کا نقشہ بڑی خوبی سے کھینچا گیا ہے "ایک عورت ہزار دیوانے" میں خانہ بدوشوں کی زندگی کی حقیقت سے بڑی ہی بھرپور تصویر کشی ہے۔ یہ ناول دلچسپ ہیں۔ ان میں افادیت کا رنگ بھی موجود ہے لیکن ان کا کینوس بہت بڑا نہیں ہے۔ اسی لئے یہ ناول سے زیادہ ناولٹ کی تکنیک سے قریب ہیں۔ کرشن چندر کے دل موہ لینے والے انداز نے ان کو بہت دلچسپ بنا دیا ہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی کا ناول "سنگم" بھی کراچی سے شائع ہوا ہے۔ یہ ناول ایک تجربہ ہے۔ اس میں ہند و پاکستان کے تاریخی مد و جزر کے اثرات کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں فاروقی صاحب نے ورجینیا وولف کی تکنیک کو اپنے لئے شمع راہ بنایا ہے۔ ناول دلچسپ ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے ـــ "علی پور کا ایلی" ممتاز مفتی کا ضخیم ناول ہے جس کو داستان گو لاہور نے شائع کیا ہے۔ ڈیڑھ ہزار صفحے کے اس ناول میں متوسط طبقے کے ایک فرد کی زندگی کے نشیب و فراز کو بڑی خوبی سے پیش کیا گیا ہے۔ دراصل یہ مصنف کی آپ بیتی معلوم ہوتی ہے جس کو ناول کا روپ دے دیا گیا ہے۔ ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کی بہت اچھی تصویر اس ناول میں موجود ہے۔ اُردو میں اپنی نوعیت کا یہ ایک ہی ناول ہے۔ اس نے ہماری ناول نگاری کی روایت میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ جمیلہ ہاشمی کا ناول "تلاشِ بہاراں" بھی گزشتہ سال شائع ہوا ہے۔ اس میں عورتوں کے مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس میں اصلاح کا پہلو غالب ہے۔ تکنیک کے اعتبار سے اس میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ یہ اوسط درجے کا ناول ہے۔ اس موضوع پر خاصی تعداد میں ناول لکھے جا چکے ہیں۔

ادھر چند سال سے مختصر افسانوں اور ڈراموں سے دلچسپی کچھ کم ہوتی جا رہی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر سال بس گنتی کے چند مجموعے چھپ جاتے ہیں۔ گزشتہ سال افسانوں اور ڈراموں کے جو مجموعے شائع ہوئے ہیں انھیں انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ عصمت چغتائی کے

افسانوں کے جو مجموعے کلیاں' اور چوٹیں کے نام سے چھپے تھے، اب ان کے نئے اڈیشن اُردو مرکز لاہور سے شائع ہوئے ہیں۔ محمد حسن عسکری کے افسانوں کا مجموعہ جزیرے بھی آئینۂ ادب لاہور نے شائع کر دیا ہے۔ کرشن چندر کے افسانوں کا نیا مجموعہ ایک خوشبو اُڑی اُڑی سی" مکتبۂ افکار کراچی سے شائع ہوا ہے۔ اس میں کرشن چندر کے مندرجۂ ذیل افسانے شامل ہیں:۔

جنتا سے ابنتا تک، گل دان، ایک خوشبو اڑی اڑی سی، کھٹے انار میٹھے انار، چینی پنکھا، موہن جودارو کا خزانہ، پرتو، دودھ کا دودھ پانی کا پانی، بیمار باپ، بلّی اور وزیر، وزیروں کا کلب، اشوک کی موت، چور، بے داغ فولاد، دل کسی کا دوست نہیں، ہیرن ــــ ان افسانوں میں کرشن چندر کا مخصوص انداز نمایاں ہے۔ ان کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی افسانہ نگاری کا فن اب بھی شباب پر ہے ــــ انجمن مصنفین پاکستان (پاکستان رائٹرز گلڈ) کے اشاعت گھر نے گزشتہ سال افسانوں کے دو مجموعے شائع کئے ہیں۔ ایک تو ہاجرہ مسرور کا "تیسری منزل" اور دوسرا انور کا "سورج بھی تماشائی"۔ ہاجرہ مسرور کے افسانوں کا یہ چوتھا مجموعہ ہے، اور اس میں ان کے مندرجۂ ذیل پندرہ افسانے شامل ہیں:۔

"تیسری منزل، موج اور تھپیڑ، مول تول، فاصلے، نئے اور پرانے، کنیز، بھالو، صندوقچہ، بے چاری، فضل دین، ایک سفر ایک اشتہار، گائے، بھاگ بھری، موت اور دودھ، محبت اور ــــ ہاجرہ مسرور نے ہماری زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی ان افسانوں میں بڑی خوبی سے کی ہے، انور کا مجموعہ سورج بھی تماشائی' ان کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ ہے جس میں ان کے یہ بارہ افسانے شامل ہیں جنس اور جینیس، کمند، انتخاب، زرنگار، صبح کرنا شام کا، کالی انگلی، بحر ہے پایاب مجھے، دل کی گہرائیوں میں، طوفان، ہیروں کا ہار، نردان ــــ یہ افسانے دلچسپ ہیں کیونکہ ان میں زندگی اور فن کا امتزاج موجود ہے۔ فہمیدہ اختر کے افسانوں کا مجموعہ اپنے دیس میں، گزشتہ سال یونیورسٹی بک ایجنسی پشاور سے شائع ہوا ہے۔ فہمیدہ اختر نے پٹھانوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بعض بہت اچھے افسانے لکھے ہیں۔ اس مجموعے میں جو افسانے شامل ہیں، ان میں سے بیشتر میں اسی فضا کی مصوری ہے۔ فنّی اعتبار سے بھی یہ کامیاب افسانے ہیں ــــ یک بابی ڈراموں کا صرف

ایک مجموعہ 'فصیل شب' انجمن مصنفین پاکستان نے شائع کیا ہے۔ اس کے مصنف مرزا ادیب ہیں
جو متوسط طبقے کی زندگی پر ڈرامے لکھتے رہے ہیں۔ اس مجموعے میں ان کے مندرجہ ذیل نو ڈرامے شامل ہیں۔ اماں
جان، اپنا اپنا راگ، وعدہ، اندھیروں کے سائے، آقائے ولی نعمت، دروازہ، شیشے کی دیوار، جمیلہ،
کالا آدمی۔ اس کے علاوہ شیخ غلام علی اینڈ سنز نے اردو ڈراموں کا ایک انتخاب بھی دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔
اس کے مرتب کمال احمد رضوی ہیں اور اس میں ڈاکٹر عابد حسین صاحب، مجیب صاحب، کرشن چندر،
عصمت، منٹو، بیدی اور ابراہیم جلیس وغیرہ کے ڈرامے شامل ہیں۔

گزشتہ سال نظموں اور غزلوں کے بعض اہم مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ جذبات نادر، کے نام
سے نادر کاکوروی کے نظموں کا مجموعہ اُردو اکیڈمی سندھ کراچی نے شائع کیا ہے۔ اس کے علاوہ
پاکستان کے مشہور شاعر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کا مجموعہ کلام 'انجمن' مکتبۂ جدید لاہور سے شائع
ہوا ہے۔ اس میں ان کا اردو، فارسی اور پنجابی کلام یک جا کیا گیا ہے۔ صوفی صاحب پختہ مشق
شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں میں ایک دل موہ لینے والی کیفیت ہوتی ہے۔ اس مجموعے کی غزلوں
میں بھی یہی خصوصیت پائی جاتی ہے ـــ یوسف ظفر کا مجموعہ 'صدا بصحرا' انجمن مصنفین پاکستان
(پاکستان رائٹرز گلڈ) کے اشاعت گھر نے شائع کیا ہے۔ اس میں ان کی غزلیں اور نظمیں شامل
ہیں۔ یوسف ظفر صاحب کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان کا مخصوص انداز اس مجموعے میں بھی نمایاں
ہے۔ مشہور نوجوان شاعر احمد ریاض مرحوم کا مجموعہ کلام 'سرخ خون' کے نام سے مجلس یادگار ریاض
کراچی نے شائع کیا ہے۔ اس مجموعے میں نظمیں بھی ہیں غزلیں بھی ـــ احمد ریاض زندگی کا گہرا
شعور رکھتے تھے۔ ان کا زاویۂ نظر ترقی پسندانہ تھا۔ اس کی جھلک اس مجموعے میں بھی نظر
آتی ہے ـــ جمیل ملک نوجوان غزل گو شاعروں میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان کی غزلوں کا
مجموعہ 'سرد چراغاں' گزشتہ سال گوشۂ ادب لاہور نے شائع کیا ہے ـــ مشہور نوجوان شاعر
منیر نیازی کا دوسرا مجموعہ کلام "جنگل میں دھنک" نیا ادارہ لاہور نے شائع کیا ہے۔ منیر
جدت پسند شاعر ہیں۔ یہ جدت پسندی اس مجموعے کی نظموں میں بھی نمایاں ہے ـــ یہ نظمیں
بہت دل کش ہیں۔ انجم اعظمی کا مجموعہ کلام 'لہو کے چراغ' کراچی آرٹ اکیڈمی سے شائع ہوا ہے۔

اس میں انجم کی نظمیں شامل ہیں۔ ان نظموں میں ایک نیا انداز ملتا ہے ـــــ جدید شاعروں میں عبدالعزیز خالد کا نام بہت نمایاں ہے۔ گزشتہ سال ان کے کئی مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ ان میں سرود رفتہ غزل الغزلات، زنجیر رم آہو، دکان شیشہ گر اور سلومی خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔ سرود رفتہ یونانی شاعرہ سیفو.. کی نظموں کا منظوم ترجمہ ہے۔ غزل الغزلات عہدنامۂ عتیق کے نغمۂ سلیمان کا منظوم ترجمہ ہے۔ زنجیر رم آہو میں خالد کی طویل اور مختصر طبع زاد نظمیں شامل ہیں۔ دکان شیشہ گر اور سلومی منظوم ڈرامے ہیں۔ عبدالعزیز خالد جدت پسند شاعر ہیں۔ یہ جدت پسندی ان کے ان مجموعوں میں بھی نمایاں ہے ـــ ابن انشا نے چینی نظموں کا ایک مجموعہ مرتب کیا ہے جو لاہور اکیڈمی سے شائع ہوا ہے۔ اس میں قدیم و جدید چینی نظموں کے ترجمے شامل ہیں۔ ترجمہ بہت اچھا ہے۔ ابن انشاء خود اچھے شاعر ہیں، اس لیے انھوں نے اصل چینی نظموں کی شعریت کو حتی الامکان برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔

آج کل ہمارے یہاں ترجموں کا بہت زور ہے ـــ مکتبۂ فرینکلن نے بہت سی امریکی کتابوں کے اردو ترجمے شائع کیے ہیں۔ ان میں آبادی کا مسئلہ (مترجمہ شبلی ام کام) فلسفے کی نئی تشکیل (مترجمہ انتظار حسین) عجائبات کیمیا (مترجمہ محمد فاروق) سائنس باتوں باتوں میں (مترجمہ علی ناصر زیدی) عرب دنیا (مترجمہ ڈاکٹر محمود حسین)، ستاروں سے آگے (مترجمہ مولانا صلاح الدین احمد) حیوانی زندگی کا ماضی و حال (مترجمہ ڈاکٹر نذیر احمد) وغیرہ اہمیت رکھتی ہیں ـــــ ٹی ایس ایلیٹ کے مضامین کا ترجمہ "ایلیٹ کے مضامین" اردو اکیڈمی سندھ کراچی سے شائع ہوا ہے۔ اس کے مترجم جمیل جالبی صاحب ہیں، اور انھوں نے یہ ترجمہ کرکے ایک اہم ادبی خدمت انجام دی ہے۔ اس میں ایلیٹ کے دو مضامین شامل ہیں جو اس نے شاعری پر لکھے ہیں ـــ امریکی ناول کا ترجمہ سید وقار عظیم صاحب نے کیا ہے اور آئینہ ادب لاہور نے اس کو شائع کیا ہے ـــــ بعض عربی کتابوں کے ترجمے بھی لاہور اور کراچی سے شائع ہوئے ہیں۔ لیکن ان میں سے بیشتر کا مقصد کاروباری ہے ـــــــ یہ ہے مختصر جائزہ پاکستان کی ان اردو مطبوعات کا جو گزشتہ سال شائع ہوئی ہیں۔ اس سے اُس ادبی ماحول کی ایک جھلک نظر آتی ہے جو آج کل ہمارے یہاں موجود ہے، اور ان رجحانات کا اندازہ بھی ہوتا ہے جو آج ہمارے ادبی ماحول میں نمایاں ہیں۔

پچھلے دو سال کا تحقیقی اور تنقیدی ادب

جناب راجندر ناتھ شیدا

[پیش نظر مضمون جامعہ کے تعلیمی میلا منعقدہ
نومبر ۱۹۶۱ء میں پڑھا گیا تھا۔ اس میں
دو سال کے ادب کا جائزہ لیا گیا ہے،
نظر ثانی اور اضافے کے بعد سالنامہ میں
شائع کیا جا رہا ہے۔]

۱۹۶۰ء اور ۱۹۶۱ء میں اردو میں تحقیقی اور تنقیدی ادب کا جو اضافہ ہوا ہے اس پر ایک نظر ڈالنے سے پیشتر یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میرے اس مقالے کا تعلق محض ان تصانیف سے ہے جو ان برسوں میں ہندوستان میں شائع ہوئیں۔ اس میں شک نہیں کہ اسی زمانے میں پاکستان میں بھی اس طرح کی کتابیں شائع ہوئی ہیں لیکن فی الحال وہ میرے پیش نظر نہیں ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہندوستان میں شائع ہونے والی بھی کوئی واقعی اچھی کتاب نظر انداز ہو گئی ہو یا انتخاب کے معاملے میں کوئی صاحب مجھ سے متفق نہ ہوں اگر ایسا ہے تو یہ کوئی عجیب بات نہیں اس لئے اس سے قطع نظر ہمیں اپنی توجہ کو محض انہی مطبوعات پر مرکوز رکھنا چاہیئے جن کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ ان کے نام ہیں "گل کرسٹ اور اس کا عہد"۔ "غالب" "غالب کی نادر تحریریں"۔ "پردیسی کے خطوط"۔ اور "انشاء اللہ خاں، عہد اور فن"۔

تحقیق اور تنقید ادب کی دو جداگانہ شاخیں ہیں اگرچہ اکثر اوقات یہ یکجا نظر آتی ہیں۔ ان کے مقاصد میں بھی بڑا اختلاف ہے تحقیق کا کام زیادہ تر معلوم ادبی حقائق کے صحیح یا غلط ہونے کا پتہ چلانا اور نئے حقائق کی جستجو کرنا ہے جب کہ تنقید کا کام ادب کی قدروں کا تعین ہے۔ یہ دونوں چیزیں اس لئے گھل مل جاتی ہیں کہ محقق کو ادبی قدروں کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا ہوتا ہے اور نقاد حقائق سے

ورق گردانی کر کے اپنے فرض منصبی سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ بہرکیف تنقید کا کام نسبتاً زیادہ علمی نوعیت کا ہے اور تنقید کا زیادہ جانچ پرکھ کا۔ آج ادبی قدروں کا تعین محض جمالیاتی اور فنی حقائق ہی کو نظر میں رکھ کر نہیں کیا جا سکتا بلکہ نقاد کے لئے ادب کے محرکات اور اثرات کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔ اسی ادب کو سماج کے وسیع تر رجحانات کی روشنی میں دیکھنا ہوتا ہے اور تاریخ کے پراگندہ واقعات میں سے ان حقائق کو تلاش کرنا پڑتا ہے جو ادیب کے شعور پر اثر انداز ہو کر اس کے ادب کو ایک مخصوص صورت دینے کا باعث بنے۔ ایسا نہ کر سکنے کی صورت میں نقاد کی رایوں کو زیادہ قابل اعتنا قرار نہیں دیا جا سکتا یہاں ایک اور بات بھی یاد رکھنے کی ہے اور وہ یہ کہ نقاد کو واقعی اچھا نقاد بننے کے لئے انسان کے متعلق مختلف علوم کے وسیع علم ہی کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ اس کا انصاف پسندی اور دیانت داری کی خوبیوں سے متصف ہونا بھی ضروری ہے۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ عمرانی تصورات اور تاریخی حقائق اختلافی چیزیں ہیں۔ ان سے متعلق اظہار رائے کرنا اختلاف و تصادم کو دعوت دینا ہے اور ایسا صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس میں اپنے محسوسات کو بے جھجک قوم کے سامنے پیش کرنے کی اخلاقی جرات بھی موجود ہو۔

مذکورہ مطبوعات پر نظر ڈالنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگرچہ آج بھی تحقیقی کام میں اضافہ ہو رہا ہے لیکن تنقید میں ٹھہراؤ ہی نہیں انحطاط بھی پیدا ہو گیا ہے۔ اب نقاد کی نظر نہ تو زندگی اور شعور کے باہمی روابط کے بارے میں نئی گہرائیوں میں پہنچنے کی کوشش کرتی دکھائی دیتی ہے اور نہ اس میں حق گوئی کی ہمت ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ قوم کے فکری اور اخلاقی معیار کا گرنا ہے۔ سیاسی آزادی بیشک ایک بڑی نعمت ہوتی ہے اور ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ حصول آزادی سے ہمارے سیاسی حقوق میں اضافہ ہوا ہے، بین الاقوامی معاملات میں بحیثیت قوم ہماری قدر و منزلت بڑھ گئی ہے، ہمیں سامراجی استحصال سے چھٹکارا بھی مل گیا ہے، اقتصادی لحاظ سے ہم نے اپنے محدود وسائل کے باوصف بہت قلیل عرصے میں کافی ترقی بھی کی ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اخلاقی اور روحانی اعتبار سے ہم زوال آمادہ نظر آتے ہیں۔ ہمارا کردار گرتا جا رہا ہے۔ نئی نسل کوئی بھی ایسا بڑا مفکر یا رہنما پیدا نہ کر سکی جو قوم کے کردار کو گرنے سے روک سکتا اور اسے زندگی کا کوئی پُرکشش مطمح نظر دے کر اس کے حصول کے لئے سینوں میں تڑپ پیدا کر سکتا۔ سیاسی آزادی اہل قوم کو راحت اور عیش و عشرت کا سامان ہی فراہم نہیں

کرتی ان سے کچھ مطالبے بھی کرتی ہے کچھ ذمہ داریاں بھی ان پر عائد کرتی ہے۔ ہم آزادی کی عطا کردہ سہولتوں سے استفادہ کرنے کے آرزومند تو ہیں لیکن آزاد شہریوں کی ذمہ داریوں سے چشم پوشی کرتے ہیں، ہم ذاتی اغراض گروہ بندیوں، باہمی سازشوں اور سیاسی مصلحت کوشیوں کو قومی مفاد پر ترجیح دینے لگے ہیں۔ ان اندھیروں میں ہم زندگی کے اعلیٰ مقاصد کی شاہراہ سے بھٹک گئے۔ اپنے چھوٹے چھوٹے مفادات کے لئے سچائی، انصاف، اخوت، خدمت اور ایثار ایسی قدروں سے روگرداں ہوگئے۔ مطلب برآری کے لئے گھٹیا قسم کے جوڑتوڑ دانش مندی قرار دی جانے لگی۔ آدمی جن باتوں کا دوسروں کے سامنے ذکر کرتے ہوئے ہچکچاتا اور شرماتا تھا اب انہی باتوں کو وہ علانیہ اور فخریہ بیان کرنے لگا۔ اس صورت حال کا ادب کی تخلیق اور خصوصاً تنقید پر اثر پڑنا ناگزیر تھا۔ آج نقاد میں نہ تو غور وفکر کی قرار واقعی صلاحیت نظر آتی ہے اور نہ اس میں سچ بات کہنے کی اخلاقی جرأت ہے۔ وہ عافیت اسی میں سمجھتا ہے کہ معروف اور صاحب اقتدار ادیبوں اور ان کے سرپرستوں کی ہاں میں ہاں ملائے۔ ان کے محسوسات اور مفادات کو ملحوظ رکھ کر ادب کی تعبیریں اور قدریں متعین کرے، ان کا اشاعت کار بن جائے۔ سستی شہرت حاصل کرنے، مخالفتوں کے طوفان سے بچنے اور طرح طرح کے فائدے اٹھانے کا سب سے آسان، مفید اور بے خطر راستہ یہی ہے، سہل پسندی، مفاد پرستی اور پست ہمتی کے اس دور میں زیادہ تر نقادوں نے یہی راہ اختیار کرلی ہے اس لئے تنقید اگر آج ایک جسد بے روح بن کر رہ گئی ہے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔

مجھے تنقید کی یہ کمزوری اس لئے بھی زیادہ کھٹکتی ہے کہ میں سمجھتا ہوں جب قوم اخلاقی انحطاط کا شکار ہو، ناقص سیاست کی پیدا کردہ فضا میں تنگ نظری اور خود پروری کے امراض عام ہوگئے ہوں تو ادب کا فرض ہے کہ وہ قوم کو اس کی بے راہ رویوں اور غلط اندیشیوں سے آگاہ کرے اور اسی طرح اگر ادب سماج کے لئے اپنے فرض سے عہدہ برآنہ ہو رہا ہو تو نقاد کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ ادب کے نقائص بتاکر اس کی رہنمائی کرے لیکن یہ ہو کیسے؟ آج تو نقاد خود وقت کی عام رو میں بہتا نظر آتا ہے۔

میں نے اس تبصرے کے لئے جو کتابیں منتخب کی ہیں ان میں زیادہ تحقیقی ہیں لیکن جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں، تحقیق تنقید سے قطعی بے نیاز نہیں رہ سکتی۔ لہٰذا ان تحقیقی کتابوں میں بھی ضمنی طور پر

ہی ہی، تنقیدی عناصر موجود ہیں اگرچہ ان تنقیدات میں گہرائی شاذ و نادر ہی نظر آتی ہے۔

ان دو برسوں میں شائع ہونے والی اس قسم کی کتابوں میں میرے نزدیک سب سے زیادہ قابلِ توجہ محمد عتیق صدیقی کی کتاب "گل کرسٹ اور اس کا عہد" ہے جسے انجمن ترقی اردو نے علی گڑھ سے شائع کیا ہے۔ اس کتاب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ مصنف نے اصل ماخذوں کا مطالعہ کر کے معلومات فراہم کی ہیں۔ انھوں نے نیشنل آرکائیوز اور لائبریریوں میں اس سلسلے میں چھان بین کر کے جن مفید دستاویزات اور مطبوعات کا پتہ چلایا ان کا ذکر بھی کیا گیا ہے جس سے مصنف کی کاوش کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

گل کرسٹ کو پہلے بھی اردو ادب کے بڑے سرپرستوں میں شمار کیا جاتا تھا اور زیرِ نظر تصنیف سے تو ان کی ادبی دلچسپیوں اور خدمات کے اور بھی نئے پہلو نظروں کے سامنے آگئے ہیں۔ ہندوستان میں قیام کے دوران میں گل کرسٹ کی زندگی، ہندوستانی زبان سے ان کا لگاؤ، زبان سیکھنے اور اس پر عبور حاصل کرنے کے لئے ملازمت کو خیر باد کہنے، شمالی ہندوستان کے مختلف شہروں میں ان کا قیام اور وہاں لسانی اور ادبی کاموں میں مصروفیت، ان کی مالی حالت کا نشیب و فراز، ان کے کام میں کمپنی کے حکام کی اعانت اور حوصلہ افزائی یہ اور ایسی ہی باتوں کے بارے میں اب تک جو معلومات حاصل تھیں ان میں اس کتاب سے بہت کافی اضافہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ غلط فہمیاں جو گل کرسٹ کے متعلق پیدا ہو گئی تھیں وہ بھی اس کی روشنی میں دور ہو جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر گل کرسٹ کو فورٹ ولیم کالج کا پرنسپل تصور کیا جاتا رہا ہے لیکن مصنف کا کہنا ہے کہ وہ کالج کے پرنسپل نہ ہو کر محض ہندوستانی کے پروفیسر تھے، اس کے علاوہ کچھ نسبتاً کم اہم حقائق ہیں مثلاً صدیقی کی تحقیق کے مطابق گل کرسٹ ۱۷۸۳ء میں کمپنی کے ملازم ہو کر کلکتے میں وارد نہیں ہوئے بلکہ وہ ۱۷۸۲ء میں خود بخود بمبئی آئے اور اس کے بعد سورت میں کمپنی کے ایک فوجی دستے میں اسسٹنٹ سرجن مقرر ہوئے جہاں سے تبدیل ہو کر ۱۷۸۳ء کے اواخر میں فتح گڑھ آئے۔ گل کرسٹ کی آئندہ زندگی کی تفصیلات بھی دلچسپ ہیں۔

اس کتاب سے گل کرسٹ کی تالیفات کے متعلق بھی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ وہ کب کب اور کن کن حالات میں لکھی گئیں اور شائع ہو سکیں۔ ان کی قیمتیں کیا کیا تھیں اور فروخت کا طریقہ

گیا تھا نیز یہ کہ اس طرح کا کام گل کرسٹ سے پیشتر کون کون کر چکے تھے اور اس زمانے میں کون کون کر رہے تھے یہ مصنف نے گل کرسٹ کی تالیفات کے عکس بھی نمونتہً پیش کیے ہیں جن سے اصل کا اندازہ لگانے میں سہولت ہوتی ہے۔

اردو ادب کے طالب علموں کے لئے اس کتاب میں اس سے بھی زیادہ دلچسپی کا سامان ان مصنفین سے متعلق معلومات ہیں جنھوں نے فورٹ ولیم کالج میں ملازمت کرکے اردو میں کتابیں لکھیں۔ مصنف نے ان کی تصنیفات کے بھی نمونے پیش کئے ہیں اور ان میں سے کچھ کے خود نوشت سوانح حیات بھی ضمیمے کے طور پر درج کر دئے ہیں۔

غرض جس طرح پروفیسر مسعود حسن رضوی کی قیمتی تصانیف "لکھنؤ کا شاہی اسٹیج" اور "لکھنؤ کا عوامی اسٹیج" اردو ڈراما کی تاریخ کے ایک اہم دور کو روشنی میں لاتی ہیں اسی طرح محمد عتیق صدیقی کے اس کام سے اٹھارہویں صدی کے ربع آخر اور انیسویں کے اوائل میں اردو نثر کے ارتقا اور لسانی قواعد و لغات سے متعلق واقعات سے پردہ اٹھتا ہے۔

سال رواں کی مطبوعات میں ایک دلچسپ کتاب "پردیسی کے خطوط" ہے جس کے مصنف مجنوں گورکھپوری ہیں اور جسے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔ کتاب لکھنے کا مقصد کچھ ایسے موضوعات پر روشنی ڈالنا بتایا گیا ہے جو مصنف کے زیر غور رہے ہیں۔ یہ موضوعات علمی بھی ہیں اور ادبی بھی۔ اگرچہ زیادہ تر ادبیات بلکہ شاعری سے متعلق ہیں پھر بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مباحث میں تنوع کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ کیونکہ جن شاعروں اور ادیبوں سے خاص طور پر بحث کی گئی ہے ان میں اردو، فارسی، انگریزی اور روسی زبانوں کے مشاہیر شامل ہیں۔ شاد عظیم آبادی، اکبر الہ آبادی، میر تقی، مرزا بیدل، شیلی اور پاسترنک پر خاص طور پر توجہ کی گئی ہے۔ پاسترنک کو ایک بڑا شاعر تسلیم کرتے ہوئے بھی اس پر اظہار افسوس کیا گیا ہے کہ اس نے "ڈاکٹر ژیواگو" لکھ کر اپنی قوم کو رسوا کیا اس سلسلے میں انفرادیت اور اجتماعیت کی نظریاتی بحث بھی آ گئی ہے جسے معقول تصور کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کوئی فرد بھی اپنی قوم کے برسراقتدار طبقے اور جماعت کے قول و فعل کے خلاف لب کشائی کا حق نہیں رکھتا۔ اس طرح مجنوں نے انگریزی کے مشہور شاعر شیلی کی رومانی زندگی پر بحث کے ضمن میں عشق سے متعلق تصورات پر بحث

کی گنجائش نکال لی ہے۔ کچھ علمی بحثوں کے لئے ایسی صورتیں پیدا کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ یہ براہِ راست آتی ہیں مثلاً ایک موقع پر لفظ "مہربان" کے ماخذ اور ارتقائی پیچ وخم پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور ایک جگہ حضرت موسیٰ اور ان سے متعلق روایات سے مفصل بحث کی گئی ہے۔

مجنوں کو محقق قرار دینا تو دشوار ہے لیکن وہ ایک افسانہ نگار اور نقاد ضرور ہیں۔ چنانچہ زیرِ نظر کتاب میں انھوں نے ان تمام مباحث کو ایک افسانوی رشتہ میں منسلک کرکے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کالج میں پڑھنے والی ایک نوجوان طالبہ یاسمین کے نام آٹھ خطوط کی صورت میں ہے۔ یاسمین مصنف سے علمی اور ادبی امور سے متعلق استفسارات کرتی رہتی ہے کیونکہ وہ اس کی ادبی عظمت اور علمی تجربے سے مرعوب ہے اور مصنف استفسارات کے جوابات ان خطوط کی شکل میں دیتا ہے۔ مجنوں نے تمہیدی سطروں میں کچھ خطوط کے بارے میں قارئین کے تاثرات کا ذکر کرتے ہوئے علمی اور ادبی مباحث کے لئے یہ اسلوبِ بیان اختیار کرنے کی تین خاص وجہیں بتائی ہیں۔ اول تو یہ کہ وہ پہلے ہی سے سنجیدہ مضامین کو دلچسپ اسالیب میں شامل کرتے رہے ہیں تاکہ آسانی سے ذہن نشین ہو سکیں۔ دوسرے ان کا کہنا ہے کہ وہ کچھ سال سے داخلی خود کو اپنے ملک میں "غریب در وطن" محسوس کرتے رہے ہیں اس لئے انھوں نے خود کو پردیسی کے لفظ سے تعبیر کیا اور تیسرے چونکہ انھوں نے اپنی زندگی کے تقریباً تیس برس درس و تدریس میں گزارے اس لئے ان کے دل میں نوجوانوں کو معلومات فراہم کرنے کی فطری خواہش موجود ہے۔ نوجوانوں سے خطاب اس لئے کیا گیا کیونکہ ان میں بڑوں کے مقابلے میں نئی باتیں سیکھنے کی نسبتاً زیادہ صلاحیت ہوتی ہے۔

بہرکیف یہ مخصوص اسلوب بیان اختیار کرنے میں مصنف کے پیشِ نظر کوئی بھی مصلحتیں کیوں نہ رہی ہوں میری نظر میں اس کی زیادہ اہمیت نہیں۔ علمی باتوں پر مباحث کا عالمانہ اسلوب بھی اپنی جگہ اہمیت اور افادیت رکھتا ہے۔ اور ہلکے پھلکے انداز میں بھی ایسے مباحث کی مثالیں ناپید نہیں۔ اگر نیٹشے بقول زرتشت" کا مصنف ہونے کے باوصف اپنے فلسفیانہ وقار کو برقرار رکھ سکتا ہے بلکہ اس پر ہی اس کی مفکرانہ عظمت کو منحصر قرار دیا جا سکتا ہے اور مولانا آزاد کی "غبارِ خاطر" ایسے ہی خطوط پر مشتمل ہوتے ہوئے بھی مصنف کی عالمانہ وجاہت کو نقصان نہیں پہنچاتی تو اصولاً مجنوں کے لئے ایسا

اسلوب اختیار کرنا کس طرح ناقص قرار پا سکتا ہے۔ علمی باتوں کی قدر کا تعین درحقیقت سچائی اور اس کی گہرائی سے ہوتا ہے نہ کہ کوئی مخصوص اسلوب اختیار کرنے یا نہ کرنے سے۔

یہ سوال البتہ الگ ہے کہ مجنوں کے ایسا کرنے سے مباحث کے مقبول عام بننے میں واقعی کوئی اضافہ ہوا بھی ہے یا نہیں؟ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ اس قسم کی بحثوں میں دلچسپی انہی لوگوں کو ہو سکتی ہے جو علم و ادب کا اچھا ذوق رکھتے ہوں محض ہلکے پھلکے ناول پڑھنے والے ان میں زیادہ دلچسپی نہیں لے سکتے۔ اس لئے اگر مصنف نے انہیں مقالات کی صورت میں بھی پیش کیا ہوتا تب بھی ان کی مقبولیت کم و بیش انہی حلقوں میں ہوتی۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ جب ہم علمی مباحث کو افسانوی رنگ میں پیش کرتے ہیں تو پڑھنے والوں کی توجہ کلیتاً مباحث ہی پر مرکوز نہیں رہتی بلکہ قارئین کتاب میں افسانوی لوازم کو بھی تلاش کرنے لگتے ہیں اگر اس اعتبار سے کتاب میں خامیاں نظر آتی ہیں تو قدرتی طور پر ان کا ردعمل خوشگوار نہیں ہوتا۔ ویسے مجنوں گورکھپوری ایک سلجھے ہوئے ادیب اور نقاد ہیں۔ ان کا ادبی ذوق اور نکتہ رس نظر انہیں دقیق ادبی مسائل کی تہوں تک پہنچا دیتی ہے۔ ادب اور زندگی کے باہمی رشتوں کا بھی ان کا اچھا مطالعہ ہے۔ ان کی مدد سے وہ علمی اور ادبی مسائل کے متعلق اپنی نجی رائے قائم کر سکتے ہیں اس کی شہادت ہمیں پردیسی کے خطوط" میں بھی جا بجا ملتی ہے۔ ادھر غالب میں بہت دلچسپی لی گئی ہے۔ یہاں میں غالب سے متعلق دو حالیہ کتابوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ ان میں ایک ڈاکٹر خورشید الاسلام کی ہے جو "غالب" ہی کے نام سے ہے اور دوسری "غالب کی نادر تحریریں" ہے جسے خلیق انجم نے مرتب کیا ہے۔ اول الذکر انجمن ترقی اردو علی گڑھ نے شائع کی ہے اور دوسری مکتبۂ شاہراہ دہلی نے۔ دونوں کا غالب سے تعلق ہونے کے باوصف موضوعات کی نوعیت کے اعتبار سے ان میں بڑا فرق ہے۔

خورشید الاسلام نے اپنی کتاب میں غالب کے ابتدائی دور یعنی تقریباً پچیس سال کی عمر تک کی شاعری سے بحث کی ہے۔ مصنف کے قول کے بموجب اس کتاب کا مقصد یہ ہے کہ غالب کی ابتدائی شاعری میں جو اثرات کام کر رہے ہیں ان کا جائزہ لیا جائے اور پھر اس شاعر کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی جائے جن کا براہ راست اثر غالب کی ابتدائی شاعری پر پڑا۔ خورشید الاسلام ان لوگوں سے متفق نہیں ہیں جو سمجھتے ہیں کہ ابتدائی دور میں غالب کی کج روی کا اصل باعث بیدل کا اتباع ہے۔ یہ تو وہ مانتے ہیں

کہ غالب نے فارسی کے شعرائے متاخرین شوکت، اسیر، بیدل، غنی، ناصر علی، صائب اور یہاں تک کہ ناسخ کی گوناگوں خصوصیات کو اپنایا لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ غالب پر نظیری، عرفی، میر تقی میر اور سودا کے مثبت اثرات بھی ابتدا ہی سے پڑ رہے تھے جن کے باعث آئندہ زمانے میں غالب نے اپنی شخصیت کو پہچانا اور اپنی انفرادیت قائم کی۔ اس کے ثبوت میں غالب کی ایسی غزلیں نقل کی گئی ہیں جو ان اساتذہ کی زمینوں میں ہیں۔

غالب کے فکری رجحانات اور ان کے عوامل کو مصنف نے شاعر کے ذاتی اور عصری ماحول اور تاریخی روایات میں بھی تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا یہ خیال صحیح ہے کہ شاعر کا شعور اکثر و بیشتر اس کے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے اس لئے جہاں کسی مخصوص دور کے شاعروں میں طبیعتوں کا اختلاف پایا جاتا ہے وہیں ان کے یہاں کچھ مشترکہ قدریں بھی ہوتی ہیں۔ ہندوستانی سماج کا انحطاط خورشید الاسلام کے خیال میں بیدل ہی کے زمانے میں شروع ہو چکا تھا جو ایک مدت تک برقرار رہا۔ فارسی کے ہندوستانی شعرائے متاخرین کا تعلق چونکہ اس انحطاطی دور سے رہا ہے اس لئے ان میں سے ہر ایک کے یہاں اس کے اثرات نمایاں ہیں۔ ہاں اثرات کی صورتوں اور کمی بیشی میں فرق ضرور ہے۔ مصنف نے یہ بھی کہا ہے کہ غالب نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی اس میں بھی اس سماجی انحطاط کے اثرات موجود تھے پھر غالب کی ذاتی زندگی کا ماحول بھی ایسا تھا جو فطری طور پر انھیں شکست خوردگی اور بے عملی کی طرف مائل کرتا تھا اس پر فارسی کے شعرائے متاخرین کے مطالعے نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ لیکن جیسا کہ ذکر آچکا ہے یہ تصویر کا ایک رُخ ہے۔ مصنف کے قول کے بموجب غالب کی طبیعت ساتھ ہی ساتھ مثبت اثرات بھی قبول کرتی جا رہی تھی۔

خورشید الاسلام نے ہم عصر شعر و ادب پر سماجی انحطاط کے جن بُرے اثرات کا ذکر کیا ہے اس میں اگرچہ کوئی خاص جدت نظر نہیں آتی لیکن اس سے اختلاف کی بھی گنجائش بہت کم ہے۔ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ جب زندگی کے فطری بہاؤ میں ٹھہراؤ آجاتا ہے اس میں اپنی قوت سے آگے بڑھنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی، تو وہ لازمی طور پر غلط سمتوں میں بہہ نکلنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ان شعرائے متاخرین کی نظروں سے بھی زندگی اور شاعری کے اصل مقاصد اوجھل ہو گئے

تھے۔ وہ درایت کے مقابلے میں روایت کو اور خارجی کے مقابلے میں داخلی زندگی کو زیادہ اہم تصور کرنے لگے تھے۔ ان کے یہاں حسن و عشق چند بے سروپا تصورات کا مجموعہ بن کر اپنی فطری دل کشی اور حرارت کھو بیٹھے۔ اس طرح انھوں نے کچھ فنی مفروضات کو حقیقت سمجھ کر شاعری شروع کی، فن نے صناعی بن کر اپنے حسن کی قدریں بدل لیں ان مفروضہ محاسن میں خیال بندی، نکتہ آفرینی، سیدھی سادی بات کو گھما پھرا کر کہنا، رعایت لفظی اور صنائع بدائع کا کثرت سے استعمال، حسن تعلیل اور مبالغے کی بے اعتدالی، عروضی اصول کی نہایت سختی سے پابندی، زبان اور محاورے کے روایتی استعمال پر اصرار سنگلاخ زمینوں کا انتخاب - یہ اور ایسی ہی بہت سی باتیں شامل ہیں۔

ان باتوں کی وضاحت کے لئے کتاب کو چار ابواب میں منقسم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں غالب کے خاندانی حالات اور عہد عالم گیری سے اٹھارھویں صدی کے اختتام تک کے اہم رجحانات کا خاکہ پیش کیا گیا ہے، دوسرے میں شوکت بخاری، مرزا جلال، اسیر، بیدل، غنی، ناصر علی اور ناسخ کی شاعری کی ایسی خصوصیات کا ذکر ہے جو مصنف کے خیال میں غالب کے ابتدائی دور کے کلام پر اثر انداز ہوئیں۔ تیسرے باب میں ہیئتی اثرات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور آخری میں غالب کی امتیازی خصوصیات کا ذکر ہے۔ ساتھ ہی ساتھ کتاب میں دو ضمیمے بھی شامل ہیں ایک میں غالب کی غزلوں کے ساتھ نظیری، عرفی، میر اور سودا کی ہم طرح غزلیں نقل کی گئی ہیں اور دوسرے میں کچھ الفاظ سے تلازمے ہیں، غالباً یہ دکھانے کے لئے کہ ان شعراء کا غالب پر واقعی اثر پڑا اور اس دور کے شاعروں کے یہاں فکر کا اصل محور زندگی نہ ہو کر چند الفاظ اور ان کے متعلقات بن گئے تھے۔

غرض مصنف نے غالب کی شاعری کے ابتدائی دور میں ان کے شعور کا تجزیہ کرکے اس کے محرکات کی جو نشان دہی کی ہے عمومی حیثیت سے تو وہ ایک بڑی حد تک حقیقت پر مبنی نظر آتی ہے لیکن ان محرکات کی تفصیلات جس وثوق سے پیش کی گئی ہیں اس سے اتفاق کرنا دشوار ہے۔ سچ یہ ہے کہ اس دور کے شاعروں کی امتیازی خصوصیات کا تعین ان کی طبیعتوں کے رجحانات کی کمی بیشی کی بنیاد پر تو کیا جا سکتا ہے، رجحانات کے عدم و وجود کی بنیاد پر نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ کائنات اور زندگی کو بے حقیقت اور مکروہ سمجھنے اور ان سے بھاگ کر

روح کے خلوت کدے میں پناہ لینے وغیرہ کے میلانات اس انحطاطی دور ہی کی پیداوار نہیں ہیں وہ ان ادوار میں بھی موجود تھے جنھیں مورخین انحطاط کے دور قرار نہیں دیتے۔ وجہ یہ ہے کہ میلانات وقتی حالات کا نتیجہ نہیں تھے بلکہ زندگی کے عمیق تر حقائق کے زیر اثر وجود میں آئے تھے۔ یوں دیکھا جائے تو غالب پر سب سے زیادہ اثر (کم از کم ابتدائی دور میں) بیدل کا تھا۔ خود مصنف نے نکات بیدل سے جو اقتباسات نقل کئے ہیں انہی سے یہ بات بخوبی ثابت ہو جاتی ہے حالانکہ اپنی جگہ پر یہ بات بھی صحیح ہے کہ غالب کو تصوف سے بیدل کا سا لگاؤ نہیں تھا اور نہ اس کے ذہن میں بیدل کی طرح صوفیانہ نظریات ایک منضبط صورت میں موجود تھے۔ ایک بات اور۔ اس کتاب میں امثال اور اقتباسات کی اس قدر فراوانی ہے کہ اس کا تقریباً آدھا حصہ انہی کی نذر ہو گیا ہے جن میں اکثر بے مصرف ہیں۔ ان سے موضوع بحث کے سمجھنے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔

غالب سے متعلق دوسری کتاب "غالب کی نادر تحریریں" ہے۔ اس میں خلیق انجم نے غالب کی نظم و نثر کی ان چیزوں کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے جو مختلف رسائل میں تو شائع ہو چکی ہیں لیکن غالب کی مروجہ کتابوں میں سے کسی میں شامل نہیں۔ غالباً اسی لئے مرتب نے انھیں "نادر" کہا ہے۔ مگر ساتھ ہی مشمولہ تحریروں کے متعلق مقدمے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ "دو تین خطوط ایسے بھی ہیں جو خطوط غالب مرتبۂ مولوی مہیش پرشاد اور "خطوط غالب" مرتبۂ غلام رسول مہر میں آگئے ہیں۔ ان خطوط کو چند مصلحتوں کی وجہ سے اس مجموعہ میں شامل کیا گیا ہے۔ مصلحتوں کی بات تو مرتب ہی کو معلوم ہوگی ہاں یہ واضح ہے کہ اس طرح اس مجموعے میں کچھ ایسی چیزیں بھی شامل کر لی گئی ہیں جو غالب کے خطوط کے معروف مجموعوں میں پہلے ہی سے شامل تھیں۔ دوسری طرف اس میں ایک ایسا خط بھی نقل کیا گیا ہے جسے خود خلیق انجم جعلی خیال کرتے ہیں اور جس کے متعلق حاشیے میں لکھا گیا ہے کہ اسے قاضی عبدالودود نے معتبر دلائل سے جعلی ثابت کر دیا ہے۔ پھر اسے غالب کی نادر تحریروں میں شامل کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی اس کا علم بھی مرتب ہی کو ہوگا۔

اس مجموعے میں خطوط کے علاوہ لطائف غیبی، تیغ تیز اور انتخاب غالب کے دیباچے، چند مختصر مضامین، نظمیں اور لطائف، سوال و جواب اور متفرق اشعار وغیرہ ہیں۔ مرتب نے حواشی میں

پنے ماخذوں کی نشان دہی بھی کی ہے اور کتاب کے آخری حصے میں ان پر مزید روشنی ڈالی ہے جو مرتب کے احساس ذمہ داری کا پتہ دیتا ہے۔ لیکن یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ تمام چیزیں غالب کی ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرتب نے اُن لوگوں کے بیانات پر بھروسہ کیا ہے جنھوں نے انھیں رسائل میں شائع کرایا۔ بہر حال اگرچہ ان سب کی واقعیت کو مسلمہ قرار دیا جانا نامناسب ہے، پھر بھی اتنا قیاس کرنا صحیح ہوگا کہ ان میں سے اکثر تحریریں غالب ہی کی ہوں گی۔ اور بادی النظر میں معلوم بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ ان تحریروں میں زیادہ تر تو تبرکات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن کچھ واقعی دلچسپ ہیں۔ ان سے غالب سے متعلق معلومات میں کچھ نہ کچھ اضافہ ضرور ہو سکتا ہے۔

مکتبۂ شاہراہ ہی نے اسلم پرویز کی کتاب ،انشاء اللہ خاں، عہد اور فن" بھی شائع کی ہے۔ یہ بھی ایک تحقیقی مقالہ ہے جس میں کچھ قلمی اور مطبوعہ کتابوں اور کچھ رسائل میں شائع ہونے والے مقالات کی مدد سے انشاء کی زندگی، کردار، ادبی تخلیقات اور اس کے زمانے کے بارے میں مواد اخذ کر کے مرتب کیا گیا ہے۔ ماخذوں کے ضروری حوالے اس کتاب میں بھی درج ہیں۔

انشاء کو اردو شاعری کے دبستان لکھنؤ کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جن خصوصیات کو لکھنوی شاعروں کی امتیازی خصوصیات سمجھا جاتا ہے وہ امتیازی محض ان معنوں میں ہیں کہ ان پر لکھنؤ کے شاعروں نے خاص طور پر زور طبع صرف کیا اور انھیں اپنی جدت پسند طبیعتوں کے مایۂ ناز کارناموں کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ورنہ دیکھا جائے تو اردو، فارسی کے دوسرے شاعروں کے یہاں بھی یہ رجحانات ناپید نہیں ہیں۔ یہ کہنا البتہ صحیح ہوگا کہ لکھنؤ کی فضا نے ان مخصوص رجحانات کو فروغ دے کر ان کی شدت میں اضافہ کر دیا۔

انشاء کی زندگی کا بھی زیادہ حصہ تمول اور فارغ البالی میں بسر ہوا۔ وہ نواب الماس علیخاں مرزا سلیمان شکوہ اور سعادت علی خاں ایسے لوگوں کے ممتاز مصاحبین میں شامل رہے۔ مصاحبین پر انحطاط پذیر سماج اور درباداری کے اثرات پڑنا ناگزیر تھا چنانچہ انشاء پر بھی یہ اثرات پڑے۔ اس کے علاوہ انشاء کے سپاہیانہ مزاج کو میدان جنگ سے زیادہ درباروں میں ادبی معرکہ آرائیاں

کے موقعے ملے جس سے دلّی میں عظیم اور فائق سے اور لکھنؤ میں قتیل اور مصحفی وغیرہ سے ان کی جھڑپیں ہوائیں۔ یہ معرکے اردو ادب کی تاریخ کا ایک افسوسناک باب بن کر رہ گئے ہیں۔ اسلم پرویز نے بھی ان کا مجملاً ذکر کیا ہے اور اس ذکر میں انھوں نے جانب داری سے کام نہیں لیا۔ مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ مصنف نے مواد کی فراہمی، ترتیب اور نتائج اخذ کرنے میں کافی محنت کی ہے اور سلیقے سے کام کیا ہے۔

آئندہ اُردو میں ادبی تخلیق کی کیا صورت ہوگی اس کے بارے میں کوئی پیشین گوئی کرنا آسان نہیں کیونکہ یہ بہت کچھ مستقبل کے حالات پر منحصر ہوگا۔ پھر بھی اتنا کہہ دینا غلط نہ ہوگا کہ اُردو ملک کی ایک ایسی زبان ہے جسے کروڑوں آدمی سمجھتے بولتے اور طرح طرح سے استعمال میں لاتے ہیں۔ اس میں بڑا قیمتی ادب موجود ہے اور اس سے بھی بہتر ادب پیدا ہونے کا امکان ہے بشرطیکہ اچھے ادب کی تخلیق کے لئے زیادہ سازگار ماحول پیدا کیا جا سکے اور ادیب ادب تخلیق کرتے وقت اپنے وقتی مصالح اور مفادات سے زیادہ اپنے فرض منصبی اور زندگی کی اعلیٰ قدروں کو ملحوظ خاطر رکھ سکیں۔ اور نقادوں کے لئے تو اس کا خیال رکھنا اور بھی زیادہ ضروری ہے۔ اس لئے کہ ان کی رائیں ادب کی تخلیق کو اوروں کی بہ نسبت زیادہ متاثر کرتی ہیں۔

اُردو افسانہ اور ناول

ڈاکٹر قمر رئیس

صرف ایک سال ۱۹۶۱ء، کی مدت میں شائع ہونے والے افسانوی ادب کا جائزہ اور اس صنف میں نمایاں ہونے والے رجحانات اور معیاروں کی تلاش بہت نازک اور دشوار کام ہے۔ اگرچہ اعظمی صاحب مدیر جامعہ کی اس ہدایت نے یہ کام کچھ آسان کر دیا ہے کہ یہ جائزہ صرف ہندوستانی ادیبوں یا ہندوستان میں شائع ہونے والی تحریروں تک محدود ہو۔ مختصر ہو اور صرف کتابوں کو پیشِ نظر رکھا جائے۔ تاہم اس پابندی سے جہاں کچھ آسانیاں ہوئیں وہاں کچھ مشکلات بھی پیدا ہوتیں۔ پہلی بات تو یہ کہ رجحانات یا ادب میں فکر وفن کے تغیرات کیلنڈر کے پابند نہیں ہوتے۔ گزرتا ہوا وقت اتنی سرعت سے ادبی روایات پر اثر انداز نہیں ہوتا جس تیزی سے وہ سیاسی، تمدنی یا زندگی کے مادی مظاہر اور حالات کو متاثر کرتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ ہمارے ادیبوں کی تحریریں پہلے رسائل میں شائع ہوتی ہیں اور کتاب کی شکل میں ذرا دیر میں سامنے آتی ہیں اس لئے صرف کتابوں کی روشنی میں ایک سال کے افسانوی ادب کی جو تصویر بنے گی وہ بہت دھندلی بلکہ ادھوری ہوگی۔ اس لئے رسائل میں شائع ہونے والی بعض نمائندہ تحریروں کا ذکر بھی نامناسب نہ ہوگا۔

جہاں تک میری رسائی اور مطالعہ کا تعلق ہے گزشتہ سال اردو میں سب سے زیادہ اور سب سے وقیع کتابیں نظم کی شائع ہوئیں۔ اس کے بعد تنقید وتحقیق اور سب سے آخر میں افسانہ اور ناول۔ یہاں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ کہتے ہوئے ادبی لحاظ سے قابلِ ذکر تحریروں کو ہی میں نے ذہن میں رکھا ہے۔ ورنہ سستے رومانی ناول اور افسانے اس سال بھی کثرت سے شائع ہوتے رہے ہیں۔ ہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ کچھ مدت سے ہندوستانی رسالوں میں نئے اور نومشق افسانہ نگاروں کی کہانیاں ہی زیادہ نظر آتی ہیں۔ اس لئے کہ ہمارے بیشتر ممتاز اور کہنہ مشق ادیب پاکستان کے مستند ادبی پرچوں

میں ہی شایع ہونا پسند کرتے ہیں۔ بلکہ بعض ہندوستانی ادیب تو اپنی کتابیں بھی پاکستان ہی میں شائع کراتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں ان کی کچھ مجبوریاں ہوں اور کچھ فائدے۔ تاہم چونکہ پاکستانی کتب ورسائل ہندوستان میں بہت کم اور مشکل سے دستیاب ہوتے ہیں اس لئے ہندوستانی پرچوں کا پیٹ بھرنے والی ادنیٰ درجہ کی کہانیاں پڑھ کر اگر ہندوستانی قارئین یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ اردو افسانہ مائل بہ انحطاط ہے تو یہ ایسی تعجب کی بات نہیں ہوگی۔

سچ تو یہ ہے کہ قومی آزادی تک اردو افسانہ اپنے ارتقاء و عروج کی جس منزل تک پہنچ گیا تھا آزادی کے بعد پانچ چھ برسوں میں جو کچھ لکھا گیا وہ اس معیار و مرتبہ تک نہ پہنچ سکا۔ اس دور کے بعض ہنگامی اور ہیجانی واقعات کے زیر اثر اگر ایک طرف فن میں سطحیت اور بے روح جذباتیت نمایاں رہی تو دوسری طرف عشقیہ اور رومانی کہانیوں نے عارضی طور پر اپنا تسلط جما لیا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ گزشتہ چند سال کی مدت میں اردو افسانہ فن اور فکر و نظر کی نئی منزلوں کی طرف بڑھا ہے۔ اس نے نئی حقیقتوں کو جذب کیا ہے، نئی صلاحیتوں اور نئے زاویوں کی ترجمانی کی ہے۔ اس طرح اس میں تنوع تازگی اور توانائی کے نئے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ ہمارے بعض ممتاز اور معمر ادیب جیسے ماندگی کے وقفہ کے بعد دم لے کر آگے بڑھے ہیں۔ اور بڑھ رہے ہیں اس دور میں راجندر سنگھ بیدی کرشن چندر اختر اورینوی سہیل عظیم آبادی اور پریم ناتھ در نے جو کہانیاں لکھی ہیں وہ اس حقیقت کا احساس دلاتی ہیں کہ افسانہ صرف زندگی کی تصویر کشی نہیں۔ اس کی تخلیق کا عمل فی الاصل ایک فلسفیانہ اور حکیمانہ عمل ہے۔ وہ زندگی کی ترجمانی سے زیادہ اس کی تفہیم اور تنقید کا عمل ہے۔ اور اردو افسانہ اس منزل تک پہنچ گیا ہے۔ اسی دور میں بعض نئے اور نوعمر افسانہ نگاروں نے بھی کچھ چونکا دینے والی کہانیاں لکھیں اور اپنی اپج اور انفرادیت سے اپنی طرف متوجہ کیا۔ ان میں بلونت سنگھ جیلانی بانو واجدہ تبسم رتن سنگھ اور ڈاکٹر (قاضی) عبدالستار کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ بلونت سنگھ اگرچہ آزادی کے قبل سے لکھ رہے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کی بہترین کہانیاں اسی دور میں شائع ہوئی ہیں۔

۱۹۶۱ء میں بھی اردو افسانہ اسی رنگ و آہنگ اور رفتار کے ساتھ داخل ہوا۔ تاہم یہ سال اس لحاظ سے ممتاز اور اہم ہے کہ ایک مدت کے بعد اردو میں دو قابل قدر ناول شائع ہو کر

سامنے آئے۔ میری مراد قرۃ العین حیدر کے ناول "آگ کا دریا" اور شوکت صدیقی کے ناول "خدا کی بستی" سے ہے۔ قرۃ العین اور شوکت صدیقی اگرچہ پاکستانی ادیب ہیں۔ لیکن چونکہ ان کے ناولوں کے ہندوستانی ایڈیشن اسی سال شائع ہوئے ہیں۔ اس لئے یہاں ان کے ذکر کا جواز مل گیا ہے۔

اردو ناول اس فن کے عالمی معیاروں سے اتنا بچھڑ گیا ہے کہ اب ان معیاروں تک پہنچنے کے لئے تدریجی ارتقا کی نہیں جست کی ضرورت ہے۔ اور "آگ کا دریا" بلاشبہ ایک طویل جست ہے۔ اس کی صحیح تنقید اور تحسین کے لئے فن کے کلاسکی تصور سے زیادہ اس کے جدید معیاروں اور نئے سانچوں کو ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ شعور کی رَو، زمان و مکان کی قید سے آزاد ہوتی ہے۔ اس ناول میں اس آزادی کا استعمال بڑے سلیقہ توازن اور تخلیقی حسن کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ڈھائی ہزار سال کی ہندوستانی تہذیب اور تاریخ کے بے کراں سمندر میں گوتم نیلمبر، ابوالمنصور اور چمپا کی روحیں نہ جانے کتنے طوفانوں سے گزرتی ہیں اور کتنے روپ بھرتی ہیں لیکن اپنی تنہائی خاموشی اداسی اور باطنی محویت سے ایک پل کے لئے جدا نہیں ہوتیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کے وجود کی نیرنگی اور ان کے تجربات کی تازگی میں ارضیت واقعیت اور انسانی جذب و شعور کا رنگ کچھ اس طرح مل گیا ہے کہ اس مرقع کا ہر نقش اور ہر تصویر بے مثل نظر آتی ہے۔

'خدا کی بستی' میں شوکت صدیقی نے بڑی بے باکی اور بصیرت سے اس معاشرہ کا مطالعہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت پاکستان میں تشکیل پا رہا ہے۔ یہ ناول پاکستان کی شہری زندگی کے ہر گوشہ اور ہر ادارہ پر محیط ہے۔ لیکن اس میں زندگی کے تاریک گوشے زیادہ روشن ہیں۔ ناول پڑھ کر پہلا تاثر یہی ہوتا ہے جیسے افلاس جہالت سیاسی ابتری اور اہل اقتدار کی سیاہکاری نے اس زندگی کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ اس کے اندر زہر گھول دیا ہے۔ اس ناول میں حقیقت نگاری کا وہی تصور کارفرما ہے جو شوکت صدیقی کے بیشتر افسانوں میں نظر آتا ہے۔ سماجی اعتبار سے مظلوم پامال مجہول اور منفی کردار انھیں عزیز ہیں۔ پیشہ ور مجرم جیب کترے لیٹرے گداگر رنگے سیار اور فٹ پاتھ پر سونے والے بے روزگار اور آوارہ نوجوان ان کے فن کا محرک اور موضوع ہیں۔ اس ناول میں بھی ایسے کرداروں کی کثرت ہے۔ راجہ نوشا شاہی نیاز ڈاکٹر موٹو کالے صاحب

اور خان بہادر فرزند علی سب جیتے جاگتے کردار ہیں۔ یہ ایسے کہنہ ناسور ہیں جن کی عفونت سے اس سماج میں مہلک وبائیں پھوٹ رہی ہیں۔ یہاں تک کہ سلمان صفدر بشیر احمد علی اور سلطانہ جیسے معصوم نوجوان بھی اس مسموم اور گھٹے گھٹے مریضانہ ماحول میں دم توڑتے نظر آتے ہیں۔ اپنی پُرجوش انسانیت اور بے پناہ عملی قوت کے باوجود وہ قدم قدم پر شکست کھاتے ہیں اور ان کے سماجی اصلاح کے منصوبے خاک میں مل جاتے ہیں۔

فنّی اعتبار سے اس ناول میں بعض اہم خامیاں بھی ہیں۔ ناول نگار کا نقطۂ نظر سلجھا ہوا اور صاف نہیں۔ تاریخی اور سماجی اعتبار سے اس نے زندگی کے بعض بنیادی حقائق کو نظرانداز کیا اور بعض کو بے جا اہمیت دی ہے۔ حقیقت نگاری میں ہمواری نہیں۔ فلک پیما کی سرگرمیاں کہیں کہیں ایک تخیّلی اور تمثیلی رنگ اختیار کر لیتی ہیں لیکن ان کوتاہیوں کے باوجود اس ناول کو اردو کے چند معیاری ناولوں کے ساتھ جگہ دی جائے گی۔ یہ ناول 'گئودان' کی عظمت کو نہ پہنچ سکا لیکن اس کا مصنف یقیناً 'گئودان' سے بلند تر ناول لکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

ناول کے باب میں خواجہ احمد عباس کے ناولٹ 'سیاہ سورج، سفید سائے' کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا۔ موضوع اور تکنیک کے اعتبار سے یہ ایک اچھوتی تخلیق ہے۔ اس کا موضوع افریقہ کی حریت پسند رہنما لومبا کی شہادت ہے اور اس کی تکنیک میں علامتی اور ایمائی رنگ غالب ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر قومی ادب کی اصطلاح صحیح ہے تو اس ناولٹ کو بین الاقوامی یا آفاقی ادب کا نمایندہ کہا جا سکتا ہے۔ حریت کے اس دیوتا کی موت پر ساری دنیا کی حریت پسند قوموں نے جو ماتم کیا اور اس کے نتیجہ میں سامراجی درندوں کے خلاف نفرت کے جو شعلے بھڑکے اس ناول میں ایک اچھوتے اور حسن کارانہ ڈھنگ سے اس کی مصوّری کی گئی ہے۔

افسانوی ادب میں اس سال سب سے قابلِ ذکر حصّہ خواجہ احمد عباس، کرشن چندر اور سہیل عظیم آبادی کی نگارشات کا ہے۔ خواجہ صاحب ادھر بڑی تیزی سے لکھ رہے ہیں۔ دانے کی کہانی سے لے کر 'واپسی کا ٹکٹ' تک انھوں نے کئی دلکش کہانیاں لکھی ہیں۔ ان کی کہانیوں میں وہ فلسفیانہ گہرائی تو نہیں جس کے بارے میں بعض ناقدین کا خیال ہے کہ انسان اور کائنات کے ابدی مسائل پر

غور و فکر کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ لیکن اگر انسان کی معاشی اور معاشرتی غلامی کے مسائل کچھ اہمیت رکھتے ہیں تو خواجہ صاحب کی کہانیوں میں ان کے بارے میں ہمدردانہ غور و فکر کے آثار واضح طور پر نظر آئیں گے۔ خطابت بلند آہنگی سیاسی اشارے اور سماجی انقلاب کا عزم لیسے پہلو ہیں جو ان کے افسانوں میں کہیں تو بلا کا تاثر پیدا کر دیتے ہیں اور کہیں محض صحافت بن جاتے ہیں۔

کرشن چندر نے متعدد کہانیوں کے علاوہ اس سال بچوں کے لیئے بھی دو قصے" خرگوش کا سپنا" اور ستاروں کی سیر" لکھے ہیں۔ خرگوش کا سپنا" لوک کہانیوں کے انداز پر لکھا گیا ہے۔ ایک غریب اور نحیف خرگوش کس طرح اپنی عقل حوصلہ اور ہمت سے دوسرے خوفناک اور چالاک جانوروں کے جبر و ظلم کا مقابلہ کرتا ہے۔ یہی اس کا موضوع اور مرکزی خیال ہے۔"ستاروں کی سیر" ایک سائنسی ناول کہا جا سکتا ہے۔ یہ دونوں کتابیں اتنی دلچسپ واقعات اتنے بامزہ اور انداز تحریر اتنا دلنشیں ہے کہ صرف بچے ہی نہیں ہر عمر کے لوگ انھیں ذوق و شوق سے پڑھیں گے۔ کرشن چندر نے ان سیدھی سادی کہانیوں میں معنویت کی کئی تہیں پیدا کی ہیں اور ایک علامتی رنگ میں دور حاضر کی زندگی کے بعض بنیادی مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے علاوہ کرشن چندر نے "تائی ایسری" شہزادہ" اور جولی" جیسی کامیاب کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ اور اس طرح اردو افسانہ کو کچھ جیتے جاگتے موثر اور حقیقت سے معمور کردار بھی دئے ہیں۔ یہی وہ کہانیاں ہیں جن میں کرشن چندر اپنے فن کی بعض روایات کو برقرار رکھ سکے ہیں۔ ورنہ 'پھول کی تنہائی' 'دو چور' اور 'چوراہے کا کنواں' جیسی کہانیاں عام لوگوں کے لئے دلچسپ اور دلکش سہی فنی اعتبار سے زیادہ قابل قدر نہیں ان میں واقعیت پسندی کے بجائے تخئیلی، تمثیلی اور ظریفانہ انداز رنگ غالب ہے۔

سہیل عظیم آبادی نے ایک طویل وقفہ کے بعد پھر قلم اٹھایا ہے۔ اس سال ان کی متعدد کہانیاں ہند و پاک کے رسالوں میں شائع ہوئی ہیں۔ 'دل کا کانٹا' اور 'یوں بھی ہوتا ہے زمانہ میں' ایسی کہانیاں ہیں جن میں ان کے فن کی سلامت روی تنقیدی بصیرت اور انفرادیت نمایاں ہے۔ ان کی کہانیوں میں خلوص، انسانی دردمندی، سادگی اور سچائی کے وہی عناصر ملتے ہیں جو منشی پریم چند کا سب سے قیمتی ورثہ ہیں۔ سماجی بے انصافی اور دولت کی غیر منصفانہ تقسیم سے پیدا ہونے والی آلودگیاں

ان کا خاص موضوع ہے۔ تاہم ان کی تازہ کہانیاں پڑھ کر یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ آزاد ہندستان میں پیدا ہونے والے اہم مسائل نے ابھی ان کی توجہ کو جذب نہیں کیا ہے۔

اس سال افسانوں کے جو مجموعے شائع ہوئے ان میں واجدہ تبسم کا 'شہر ممنوع' اور ایک نئے افسانہ نگار جوگیندر پال کا مجموعہ 'دھرتی کا کال' خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ واجدہ تبسم کی کہانیوں نے گزشتہ چند سال میں اردو افسانہ کو ایک نئی سمت ہی نہیں نئی سطح بھی دی ہے۔ 'حوا کا گناہ'۔ اے رود موسیٰ اور 'باندان' خوبصورتی نزاکت اور فنی مہارت سے تراشی ہوئی کہانیاں ہیں۔ سماج میں عورت کی پامالی، متوسط طبقہ کی معاشی زبوں حالی اور گھریلو زندگی میں پیدا ہونے والی الجھنیں کش مکش اور گھٹن ان کی کہانیوں کے خاص محرکات ہیں۔ وہ اردگرد کی مانوس چیزوں سے ایسی فضا پیدا کرتی ہیں کہ قاری اس میں ڈوب جاتا ہے اور تاثرات کی دھیمی دھیمی لہروں کے سہارے حقائق کی تہ تک پہنچتا ہے۔

جوگیندر پال کی کہانیوں کا موضوع افریقہ کی زندگی ہے۔ وہ ایک مدت سے افریقہ میں رہ رہے ہیں وہاں کی تہذیب و معاشرت، عوام کی معاشی حالت اور قومی آزادی کی تحریک کا مطالعہ انھوں نے بہت قریب سے کیا ہے۔ ان کہانیوں میں بھی انھوں نے افریقہ کی سرزمین پر گوروں اور کالوں کی کش مکش اور ان کی زندگی کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جوگیندر پال کا مطالعہ وسیع ہے مغربی ادیبوں میں وہ موپساں اور اس کے مقلدین کے فن سے متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کی اکثر کہانیوں کا طلسم آخر میں کھلتا ہے۔ اشخاص سے زیادہ حیرت زا اور نتیجہ خیز واقعات پر ان کی نظر رہتی ہے۔ اس مجموعہ میں معجزہ، سب کا سوال۔ اور دھرتی کا کال ان کی نمائندہ کہانیاں ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ابھی ان کی کہانیوں میں ایک آنچ کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن ان کہانیوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ جلد ہی ان کے فن میں زیادہ پختگی صفائی اور دلکشی پیدا ہوگی۔

اس سال کے افسانوی ادب پر نظر ڈالتے ہوئے اس بات کا بھی احساس ہوا کہ چند نوجوان اور ہونہار افسانہ نگار جنھوں نے ۵۵ء کے بعد کچھ کامیاب کہانیاں لکھی تھیں۔ اس سال خاموش رہے۔ ان میں مسیح الحسن قیصر تمکین اور ظفر پیامی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ یہاں تک کہ جیلانی بانو جیسی

باشعور اور ذہین افسانہ نگار کا قلم بھی اب کچھ تھکا تھکا سا نظر آتا ہے۔ اس کا ثبوت ان کا افسانہ "نیا حاتم طائی" ہے۔ جو کسی طرح ان کے پچھلے دور کے افسانوں "ڈریم لینڈ" اور "موم کی مریم" کے مقابل نہیں رکھا جا سکتا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس سال پرانے افسانہ نگاروں کی تحریریں اور کاوشیں غالب ہیں۔ نئے افسانہ نگار اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے باوصف محنت فنی ریاضت مطالعہ اور غور و فکر سے گریز کر رہے ہیں جبکہ پرانے فنکار نئے حوصلوں سے لکھنے اور نئے تقاضوں کو پورا کرنے کی جد و جہد کر رہے ہیں۔ صالحہ عابد حسین نے بھی اس سال 'محرومی' اور 'فنکار' جیسی دو موثر اور دلکش کہانیاں لکھی ہیں جن میں ٹیگور کا اثر نمایاں ہے۔ 'محرومی' میں ممتا کا جذبہ بڑے لطیف اور شدید تاثراتی رنگ میں نمایاں ہوا ہے۔ اس کے علاوہ پرانے افسانہ نگاروں میں علی عباس حسینی، بلونت سنگھ اور رام لال کی چند کہانیاں بھی اس سال کے افسانوی ادب کا قابل قدر حصہ ہیں۔

جہاں تک اردو افسانوی ادب کے نئے رجحانات کا تعلق ہے اس کے لئے ذرا تفصیلی تجزیہ کی ضرورت ہے اور اس کا یہاں موقع نہیں۔ اس کے علاوہ اس مطالعہ کے لئے زمان و مکاں کی قید بھی مناسب نہیں تاہم یہاں مختصر الفاظ میں ان میلانات کا ایک اجمالی خاکہ دیا جا سکتا ہے جو اس دور میں نمایاں رہے۔ یا نمایاں نظر آئے۔

(۱) یوں تو ہر دور میں سنجیدہ ادب کے مقابلہ میں غیر سنجیدہ یا تفریحی اور سستے رومانی ادب کی کثرت رہی ہے لیکن اس دور میں شائع ہونے والے تفریحی ناولوں اور افسانوں کے سیلاب نے سنجیدہ ادبی تخلیقات کی رفتار اور کردار کو کئی پہلوؤں سے نقصان پہنچایا ہے۔ (۲) واقعیت پسندی اور حقیقت نگاری کے نئے امکانات کی تلاش کے بجائے فضا کے اعتبار سے غیر ارضی اور تخئیلی کہانیاں لکھنے کے تجربے ہو رہے ہیں لیکن کوشش یہ ہے کہ ایسی کہانیوں کو ایک علامتی رنگ دے کر معنویت پیدا کی جائے۔ (۳) نئی پود کے ادیب اب دوسری زبانوں کے ادب ان کے میلانات اور معیاروں سے باخبر رہنے اور ان سے استفادہ کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ اس کے بجائے وہ اپنے ادب کی اعلیٰ روایات کے زیر اثر — اپنے مشاہدہ اور تجربہ کی حدوں میں رہ کر اعتماد سے لکھ رہے ہیں۔ ان کے افسانے نقش گر حادثات نہیں ان میں معمولات کا گہرا رنگ جزئیات کا دبیز اور تحلیل نفسی کی روشنی ہے۔ تاہم یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ رنگ نکھر کر کیا رُخ اختیار کرے۔

۶۱-۱۹۶۰ء کا مزاحیہ ادب

جناب غلام احمد فرقت کاکوروی

طنز و مزاح کے گل بوٹے اور شگوفے صرف ایسی فضا میں چٹکنے اور آنکھ کھولنے کے عادی ہوتے ہیں جو تموّل، اطمینان اور سکون میں رچی بسی ہو اس لئے ۶۰ء اور ۶۱ء کے بحرانی دور میں اگر اردو ادب میں مزاحیہ مضامین کے صرف گنے چنے مجموعے شائع ہوئے ہوں تو اس پر حیرت و استعجاب سے آنکھیں پھاڑنے دیدے نکالنے یا بوٹیاں نوچنے کی چنداں ضرورت نہیں بلکہ ان لوگوں کے دل گردوں پر ضرور حیرت کرنا چاہئے جنھوں نے اس سنگ لاخ دور میں پتھر میں جونک لگا کر اور مزاحیہ مضامین لکھ کر ہماری اور آپ کی دلبستگی کا سامان فراہم کیا۔

۶۱-۱۹۶۰ء میں احمد جمال پاشا کے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کا مجموعہ اندیشۂ شہر تخلص بھوپالی کے مزاحیہ خاکوں کا مجموعہ پوسٹ مارٹم، فکر تونسوی کا ناول پروفیسر بدھو، چودھری وجاہت علی سندیلوی کے مزاحیہ مضامین اور کہانیوں کا مجموعہ بے ساختہ اور بے ضابطہ، کنہیا لال کپور کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ گرد کارواں اور راقم الحروف کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ "مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں" شائع ہو سکے یا ان نثری مجموعوں کے علاوہ پروفیسر دلاور فگار صاحب کی مزاحیہ اور طنزیہ نظموں اور غزلوں کا مجموعہ 'ستم ظریفان'۔

جمال پاشا ہمارے ان نوجوان مزاح نگاروں میں ہیں جنھوں نے گزشتہ آٹھ دس سال کے عرصہ میں بعض ایسے طنزیہ مضامین لکھے ہیں جنھیں اردو کے مزاحیہ ادب میں ایک اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے بالخصوص ادب میں پوسٹ مارٹم اور مرزا ظاہر دار بیگ کافی ہاؤس میں، ان کے انداز بیان میں بڑا ٹھہراؤ اور سنجیدگی ہے ان کے یہاں ایک اچھے مزاح نگار کا سلیقہ اور ایک خوش فکر طنز نگار کا شعور ملتا ہے۔ موضوعات کی تلاش سے ان کے غیر معمولی ذہین

ہونے کا اندازہ ہوتا ہے وہ بغیر فقرہ بازیوں کے بھی اپنے طنز میں مزاح کی چاشنی پیدا کرنے کا پورا پورا سلیقہ رکھتے ہیں۔ وہ دوسروں کی کمزوریوں پر ہنستے ہیں مگر اس ہنسی میں اس کا لحاظ بھی رکھتے ہیں کہ جس پر وہ ہنس رہے ہیں اس کے ماتھے پر شکن تو نہیں پڑ رہی ہے اور ایک طنز نگار کی یہی سب سے بڑی خوبی ہے کہ وہ جس پر طنز کرے اُسے بھی اپنے مزاح میں شریک کرلے ان میں نثر کی پیروی کرنے کا غیر معمولی سلیقہ ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے ان کی اس کتاب پر جو مقدمہ لکھا ہے اس میں اگرچہ انھوں نے جمال صاحب کو طنز نگار سے زیادہ مزاح نگار قرار دیا ہے۔ مگر راقم الحروف کو ان کی اس رائے سے اتفاق نہیں۔ راقم الحروف ان کو مزاح نگار سے زیادہ طنز نگار سمجھتا ہے۔

ان کا یہ مجموعہ غالباً پہلا مجموعہ ہے جو زمانۂ طالب علمی سے اس وقت تک کے تمام مضامین پر مشتمل ہے اسی لئے اس میں نرم گرم ہر قسم کے مضامین شامل ہیں۔ ان کے بعض مضامین ان کے درخشاں مستقبل پر روشنی ڈالتے چلتے ہیں۔

دوسرا مزاحیہ خاکوں کا مجموعہ عبدالاحد خاں تخلص بھوپالی مدیر بھوپال پنچ کا ہے جو پوسٹ مارٹم کے نام سے شائع ہوا ہے اس میں کچھ بھوپالی اور کچھ غیر بھوپالی حضرات شامل ہیں جن سے تخلص صاحب کی یا تو یاد اللہ ہے یا غیر معمولی بے تکلفی۔ تخلص صاحب اگرچہ اس کوچہ کے نو واردوں میں ہیں مگر خدا جانے کیوں وہ اس وقت تک اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی پال ڈالے پڑے رہے اور ان کا خمیر اتنی دیر میں کیوں پھولا۔ ان کی تحریروں میں بلا کا رکھ رکھاؤ اور قیامت کا طنز ہوتا ہے۔ ان سے اگرچہ راقم الحروف کا تعارف محض تحریری ہے مگر ان کے طنز میں اس بلا کی شوخی ہے کہ ان کی تحریر پڑھ کر اُن سے ملنے کو دل چاہتا ہے۔ ان کے مضامین پڑھ کر زلیخا کی جوانی کا بھی قائل ہی ہونا پڑتا ہے کیونکہ انھوں نے زلیخا کی تجدید جوانی کے لگ بھگ زمانہ گمنامی میں بسر کیا ہے ان کے فقروں میں ہم کو ایک ماندر زادانہ طنز ملتا ہے۔

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ان کی تحریریں بڑی، شوخی، رنگینی اور مٹھاس ہے وہ جگہ جگہ فقرے بھی چست کرتے چلتے ہیں یہ اعتبار عمر خواہ ان کے قویٰ کمزور ہو گئے ہوں مگر ان کے قلم میں وہ زندگی اور جان ملتی ہے کہ پڑھنے والے کے

سامنے ایک ایسے گبرو جوان کی تصویر آجاتی ہے جو جوان بھی ہے اور گرگِ باراں دیدہ بھی ان کے خاکوں کا مجموعہ جوان کے کہنے کے مطابق نقشِ اول ہے بہتوں کے نقشِ دوم اور ششم کو ماند کر دینے کی بدرجۂ اتم صلاحیت رکھتا ہے۔ یارب اس ساغرِ لبریز کی مے کیا ہوگی

تخلص کے طنز میں توازن، گہرائی اور سلیقہ مندی کے ساتھ ساتھ روزمرہ بھی شامل ہے جس پر انہیں بڑی قدرت ہے۔ جب وہ عورتوں کی زبان استعمال کرتے ہیں تو بعض اوقات ان کے عبدالاحد خاں ہونے میں شک ہونے لگتا ہے۔ وہ ہنس ہنس کر اس انداز میں نشترزنی کرتے ہیں کہ مریض ان کی ہنسی میں گم ہو کر اپنی تکلیف بھول جاتا ہے۔ وہ ایک کامیاب طنز نگار صحافی بھی ہیں اس کوچہ میں آنے کے بعد اگرچہ طنز نگار کی عزت و آبرو خطرہ میں پڑ جاتی ہے مگر وہ صحافت کے داؤں پیچ بھی پیٹ سے لے کر آئے ہیں۔ ان کے اخبار بھوپال پنچ کے سیاسی اور طنزیہ مضامین پڑھ کر اودھ پنچ والے منشی سجاد حسین کاکوردی مرحوم کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ موجودہ سیاست کے اُتار چڑھاؤ اور پریس ایکٹ کی دفعات کے داؤں پیچ بھی سمجھتے ہیں اور ان کو خالی دینے کے گُر سے بھی واقف ہیں۔ وہ ایک ایسے شاعر کے بارے میں جو غالباً داڑھی زدہ اشتراکی ہے ایک جگہ لکھتے ہیں:

"جب "رب کا شکر ادا کر بھائی" سے متاثر ہوئے تو کلام مجید کو منظوم کرنا شروع کر دیا۔ بیک وقت ماسکو اور مکہ شریف پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ دونوں کے شاعر ہیں اور دونوں سے دور۔"

جوہر قریشی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"حضرت آصف شاہمیری نے بہ بانگ دہل آواز دی — بھائیو۔ مٹی دو چاروں طرف سے پبلک پل پڑی اور دیکھتے ہی دیکھتے مرحوم منوں مٹی کے نیچے خاموشی سے دب گئے مٹی اس قدر کثرت سے دی گئی کہ آس پاس کی دوسری لاوارث قبریں مرحوم کی قبر میں ضم ہو کر پہاڑ گنج کی صورت اختیار کر گئیں۔ اور اس طرح ہزاروں من مٹی میں بھوپال کے شہنشاہ طنز و مزاح پناہ کو داب دیا کہ مبادا پھر نہ نکل آئیں۔ قبرستانی رجسٹر میں "وجہ موت" کے خانہ میں مرض طنز و مزاح لکھ دیا گیا۔ قبر کے سرہانے ایک دیوالیہ اردو پریس کا پتھر جس کو کباڑیوں نے

جزائے خیر کے لئے فی سبیل اللہ دیا تھا۔ تاریخ وفات حسرت آیات اور سن وفات کا نصف قطعہ ـــــ جوہر پیوند زمیں شد۔ لکھ کر آخری تکمیل بھی کر دی گئی"

ایک مشہور ادیب کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے۔

"مقدمہ چلا ـــ صفائی کا موقع دیا گیا ـــ آپ نے مدعی کو منہ توڑ جواب دیا کہ ـــ حضور! مدعی پیدائشی بے عزت ہے غیر ملکیوں نے بارہا اس کو گرفتار کر کے ذلیل کیا ہے"

"نادم صاحب نے اس تحریک میں حصہ لینے سے صاف انکار کر دیا۔ اور وجہ اختلاف یہ بتائی کہ قصبہ سیتاپور میں کوئی انگریز نہیں ہے اور اگر ہے تو ایک بوڑھا پادری جو امروز و فردا میں ہندوستان تو ہندوستان دنیا ہی چھوڑ دے گا۔ ہائی کمانڈ نے ہدایت کی کہ آپ بمبئی یا کلکتہ جاکر اس تحریک کو چلاؤ تو آپ نے صاف کہہ دیا کہ بمبئی اور کلکتہ کے رہنے والے انگریزوں سے میں قطعاً ناواقف ہوں اور مجھے اتنی دوری پر رہنے والے انگریزوں سے کوئی ذاتی پرخاش بھی نہیں۔ نیز انگریزی زبان سے بھی ناواقف ہوں پھر کس طرح انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنے پر ہموار کر سکوں گا"

فکر تونسوی کے یوں تو طنزیہ مضامین کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں مگر پروفیسر بدھو ان کا پہلا طنزیہ ناول ہے جو جنوری ۱۹۶۲ء میں چھپ کر منظر عام پر آیا ہے۔ چونکہ ۱۹۶۱ء کا پورا سال اس کو کتابت اور طباعت کے قید و بند میں گذارنا پڑا اس لئے اس کی لکھائی چھپائی پر وہ رونق اور شادابی آپ کو نظر آنے گی جو اصل ناول میں ہے۔ اس ناول میں فکر تونسوی نے اپنے مخصوص انداز میں سماج کی بہت سی دکھتی رگوں کو چھیڑ کر طنز کی ضربیں لگائی ہیں۔ پروفیسر بدھو جو اس ناول کے ہیرو ہیں ان کے کندھوں پر رکھ کر فکر صاحب نے بندوق چلائی ہے اور بعض جگہ تو موجودہ سیاست اور نظام حکومت پر ایسے فنی وار کئے ہیں کہ پڑھنے والا لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے۔ فکر صاحب صحافتی طنز نگاری میں جواب نہیں رکھتے۔ وہ ایک کہنہ مشق ترقی پسند ہیں۔ ملاپ کے مزاحیہ کالم میں وہ پیاز کے چھلکوں کی طرح سماجی کمزوریوں کو ادھیڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ وہ ادب میں ایک صحافی اور صحافت میں ایک ادیب کی حیثیت رکھتے ہیں پروفیسر بدھو میں ایک جگہ وہ کس درجہ لطیف انداز میں سیاست پر طنز کرتے ہیں۔

"آخر وہ کون لوگ تھے جو ماضی میں لافانی عشق کر گئے۔ مثلاً ایک فرہاد تھا جو پہاڑ کھود کر نہر نکال لایا تھا۔ پہاڑ آج کل بھی موجود ہیں۔ مگر نہریں نکالنے کا کام فرہاد کے بجائے گورنمنٹوں نے سنبھال لیا ہے اور شاید کوئی فرہاد اگر پہاڑ کاٹنے کے لئے جائے بھی تو اُسے سرکاری جائداد کو نقصان پہنچانے کے جرم میں دھر لیا جائے۔"

اگلے زمانہ کی گورنمنٹیں کچھ زیادہ فراخ دل ہوا کرتی تھیں مگر آج کل کی گورنمنٹیں ......؟ آہ.... عشق کو بھی سرکاری جائداد سمجھتی ہیں۔"

فکر کا دماغ معلومات کا ایک اچھا بھلا مال گودام ہے جس میں ارسطو کے وقت سے اب تک کے نئے اور پرانے اقوال، ضرب الامثال، محاورات اور لطائف بھرے پڑے ہیں صحافت نگاری میں ادیب کو قدم قدم پر باادب باملاحظہ ہوشیار کے نعرے بلند کرنا پڑتے ہیں مگر اب وہ اس قدر مشاق ہو گئے ہیں کہ وہ بغیر کسی جھجک مسکرا مسکرا کر انھیں پھینکتے جاتے ہیں اور لوگ انھیں گل سمجھ کر اپنے دل کے دامن میں جمع کرتے رہتے ہیں۔

چودھری وجاہت علی سندیلوی کے مزاحیہ مضامین اور افسانوں کا مجموعہ 'بے ساختہ اور بے ضابطہ' کے نام سے ۱۹۶۰ء کے آخر میں شائع ہوا ہے وجاہت صاحب ہمارے ادب میں ایک سنجیدہ افسانہ نگار کی حیثیت سے خاصی شہرت کے مالک ہیں۔ حالات کی ستم ظریفی نے ان کو وکالت کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا ورنہ وہ ایک محقق کا دماغ، ایک ادیب کا مزاج، ایک طنز نگار کا شعور اور انگریزی اور اُردو کے بلند پایہ صحافی کی صلاحیتیں لے کر پیدا ہوئے تھے۔ 'بے ضابطہ اور بے ساختہ' ان کے کم و بیش چوبیس پچیس مزاحیہ مضامین، خاکوں اور کہانیوں کا مجموعہ ہے جس میں سنجیدہ مزاح اور سماج پر گہرا طنز ملتا ہے۔ ان کے انداز بیان میں مغربی طنز نگارش کی شوخی اور مسکراہٹیں ملتی ہیں ان کی زبان شگفتہ ہے وہ اس دنیا میں بھی ہارے ہوئے مقدمات کی اس طرح وکالت کرتے ہیں کہ آخر میں فتح اور کامرانی ان کے قلم کا منہ چومتی نظر آتی ہے۔ ان کو روزمرہ اور زبان پر بڑی قدرت ہے۔ سندیلے میں اب لے دے کر کوئی چیز مشہور ہے تو اول سندیلے کے لڈو، دوسرے وہاں کے ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، اور تیسرے وجاہت سندیلوی۔ اور سیاسی دنیا میں بیگم اعزاز رسول جن کے بارے میں سنا جاتا ہے کہ وہ اپنی

کی غیر معمولی شہرت سے اس درجہ متاثر ہیں کہ خود اپنا تعارف اِن الفاظ میں کراتے ہیں میں ہوں بیگم رسول کا شوہر۔

اس دو سال کے عرصہ میں موجودہ مزاح نگاروں کا کنہیا یعنی جناب کنہیا لال کپور کے مزاحیہ مضامین کا بھی ایک نیا مجموعہ گرد کارواں کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس مجموعہ کا نام جس قدر شاعرانہ ہے اسی قدر اس کے تمام تر مضامین طنزیہ ادب کا شاہکار ہیں۔ یہ مجموعہ چودہ پندرہ خاکوں، افسانوں، کہانیوں اور تجزیوں پر مشتمل ہے۔ جس میں ترقی پسند غالب، سامع اور اندیشۂ شہر بی جمالو۔ اور مقبل صاحب کے عنوان سے جو مضامین شامل ہیں وہ ہمارے ادب میں ایک اضافہ ہیں۔ ان مضامین کو لکھ کر کپور صاحب نے ہمارے ادب میں نئے تجربوں کا آغاز کیا ہے۔ ترقی پسند غالب کے عنوان سے جو مضمون ہے اس میں مصنف نے غالب ہی کے اشعار کے ایک ہی بحر کی دو غزلوں سے دو علیحدہ علیحدہ مصرعے لے کر ایسا مزاح پیدا کیا ہے کہ زبان بے اختیار چٹخارے لیتی ہے۔ ان اشعار کے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
اب کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

موت کا ایک دن معیّن ہے
اور درویش کی صدا کیا ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی
حیران ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں

دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

اسی مضمون میں ایک طنزیہ نظم بھی ہے جو اشتراکی اور ترقی پسند شاعروں پر ہے جو ادب سے سیاسی پروپیگنڈے کا کام لینے لگے ہیں۔

کبھی قلم ہاتھ میں تھا میرے
غزل بھی کہہ لیتا تھا میں خاصی
نہ جانے کیا میرے دل میں آئی
کہ توڑ ڈالا قلم کو ساتھی
پکڑ کے ہاتھوں میں اک ہتھوڑا
ادب کی تخلیق کر رہا ہوں
ہتھوڑے سے یعنی لکھ رہا ہوں
ادب برائے یہ ماسکو ہے
نہیں ادب یہ برائے دلّی
میں صاف اعلان کر رہا ہوں
کہ بن گئی ہے مرکھنی گائے
ہوا جو کرتی تھی بھیگی بلّی
قسم مجھے گورکی کی ساتھی
ادب کو رہنے ادب نہ دوں گا
قسم مجھے ایلیا کی ساتھی
میں شاعری تو نہیں کروں گا
لگاؤں گا میں ادب میں نعرے
کہ آ رہا ہے نیا سویرا
کہ شاعری ختم ہو چکی ہے
درانتیاں گیت گا رہی ہیں

اسی مجموعہ میں "نور کا تڑکا ہوا" کے عنوان سے ایک مضمون ہے جس میں سویرے سویرے جو بوڑھے اور ازکار رفتہ اپنی صحت درست کرنے کی غرض سے پارکوں اور میدانوں میں ٹہلنے نکلتے ہیں اُن کی بات چیت کا انداز نہایت

ہو لطیف انداز میں بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ دوسرے نے جواب دیا: "اجی آپ ہماری توند کی فکر میں سوکھ کر کانٹا ہوگئے ہیں نناوے کے پھیر سے نکلئے اور کچھ کھایا پیا کیجئے"۔ اس تمہید کے بعد جو دوسری دلچسپ باتیں ہوئیں وہ اس قسم کی تھیں۔

کہیئے خارش کا کیا حال ہے ؟
ایک پل چین نہیں لینے دیتی
جوڑوں کے درد سے کچھ افاقہ ہوا
اجی کہاں ہڈی ہڈی دکھتی ہے
آپ کی آنکھ کا کیا حال ہے
جب سے آپریشن کرایا ہے نگاہ کمزور ہوگئی ہے
سُنا ہے آپ نے بھینس فروخت کردی
جی ہاں اب مرغیاں پالنے کا خیال ہے
پیاز اوپر جارہے ہیں سٹاک کرنے کا بہت اچھا موقع ہے
آپ کے پاس کھٹی ڈکاروں کا نسخہ تھا وہ ہمیں بھی دیجئے۔

ان ہی مزاحیہ مجموعوں میں ایک مجموعہ راقم الحروف کے مزاحیہ مضامین کا بھی ہے جو "مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں" کے عنوان سے نسیم بک ڈپو لکھنؤ نے ۱۹۶۱ء میں شائع کیا ہے۔ اس کی ایک جلد راقم الحروف نے قومی آواز لکھنؤ کو بغرض ریویو بھیجی تھی مگر خدا جانے کس غلط فہمی کے تحت اس کے تبصرہ نگار مولانا رضا انصاری نے بجائے کتاب کے ناشر کی ذات پر ریویو کردیا اور کتاب اپنی جگہ اُسی طرح بے داغ رہی اس سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ میری مزاح نگاری کس درجہ انفرادیت سے پُر ہے اور خاکسار دوسرے مزاح نگاروں سے کس درجہ پست یا بلند درجہ کا انسان ہے۔ بہر صورت جہاں تک طنز و مزاح کے موضوع کا تعلق ہے میں اُس خاکہ، فیچر یا مضمون کو کسی قیمت پر طنزیہ یا مزاحیہ ماننے کو تیار نہیں جس میں کسی قسم کی دلآزاری کا پہلو ہو اور جس سے پڑھنے والے کے ماتھے پر شکن آجائے۔ میں نے اب تک جس قدر مزاحیہ مضامین یا فیچر لکھے ان میں اس اصول کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھا چنانچہ اس مجموعہ میں

بھی آپ کو اِسی نوعیت کا مزاح یا طنز ملے گا۔

مجھے تو پسند اور مجنوں کو لیلیٰ
نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی

پروفیسر دلاور فگار جو ابھی ڈال کے ٹوٹے مزاحیہ شاعر ہیں ان کی غزلوں، نظموں اور قطعات کا ایک مجموعہ "ستم ظریفیاں" کے نام سے ابھی حال میں شائع ہوا ہے۔ ان کے طنزیہ اور مزاحیہ کلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اسے پڑھ کر ہر شخص اُن کی جوانی کا منکر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ان کی نظموں کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

ان کی ایک نظم انٹرویو کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کوئی لڑکا؟ ایک وہ بھی ناخلف	گر قبول افتد زہے عز و شرف
جائے پیدائش؟ کھگڑتی پور حضور	رچھورہ سے صرف بارہ کوس دور
ایک یعنی عمر؟ پورے تیس سال	اور سرکاری سند سے بیس سال
کوئی والی ہے تمہارا نزد و دُور	جو بھی کچھ ہیں اوّل و آخر حضور
کیا کوئی اونچی سفارش لائے ہو؟	جی نہیں۔ تو پھر یہاں کیوں آئے ہو؟

کرکٹ میچ بھی ان کی ایک مزاحیہ اور طنزیہ نظم ہے اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

یہاں کچھ ایسے بھی کپتان پائے جاتے ہیں
جو رن بناتے نہیں ہٹ لگائے جاتے ہیں
ادب نوازوں میں شاؤٹ یہاں بھی ہوتے ہیں
یہ بدنصیب رن آؤٹ یہاں بھی ہوتے ہیں
بجائے فضل کے سکسر یہ مرحبا کہنا
مگر فراق کی باؤنڈری کا کیا کہنا
حفیظ بھی کوئی بوگس کریکٹر تو نہیں
مگر عدم سے زیادہ فری ہٹر تو نہیں

میرے خیال کو اہل نظر کریں گے کیچ
مشاعرہ بھی ہے اک طرح کا کرکٹ میچ

ان کی ایک نظم "اے خامۂ خاصانِ ادب" جو مسدس حالی کے رنگ میں ہے بہت ہی اچھی ہے۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اب شعر ہے ہر جملۂ بے معنی و موزوں
لیلیٰ کی کہانی ہے نہ افسانۂ مجنوں
تشریح کرے اس کی کوئی یوں تو کوئی یوں
مطلب مگر اس کا نہ سمجھ پائے فلاطوں
مطلب ہی نکل آئے تو پھر شعر ہی کیا ہے
اے خامۂ خاصانِ ادب وقتِ دعا ہے

ان کی ایک نظم مشاعرہ کے عنوان سے ہے جو غالباً ان کی سب سے زیادہ کامیاب نظم ہے افسوس کہ اس وقت ان کی اس نظم کا کوئی بند مجھے یاد نہیں۔

ان کا کلام پڑھنے سے ان کے عربی النسل ہونے کا ثبوت بھی ملتا ہے جہاں لڑکیاں سن بلوغ کو پہنچنے سے قبل ہی بالغ ہو جاتی ہیں۔ اس عمر میں جب ان کے کلام میں یہ پختگی ہے تو آئندہ ان کی پختگی اگر طلب میار اور تاج محل کو شرمائے تو چنداں حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔

تراجم

عبداللطیف اعظمی

ہر زبان کی نشوونما اور اس کی ترقی میں ترجموں کو بہت دخل ہے۔ یہ دور اردو ادب میں بھی آیا اور اس میں شبہ نہیں کہ ترجموں سے، بالخصوص مغربی ادب کے ترجموں سے اردو ادب کو بہت کافی فائدہ پہنچا ہے۔ آج بھی جبکہ اردو ادب بہت کافی ترقی کر چکا ہے، ترجموں سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔

آزادیٔ وطن سے قبل جن اداروں نے ترجموں کے ذریعہ اردو ادب کی قابلِ ذکر خدمت ہے، ان کی تعداد اچھی خاصی ہے لیکن آخری دور کے اداروں میں دارالترجمہ حیدرآباد اور مکتبہ جامعہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اول الذکر کے ترجموں کی زبان مشکل اور ان کے اسلوب میں پیچیدگی اور الجھاؤ ہے، اس لئے وہ زیادہ مقبول نہ ہو سکے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی کوششوں سے اردو کے خزانے میں بڑا قیمتی سرمایہ منتقل ہوا ہے مگر افسوس کہ یہ ادارہ نئے حالات میں جاری نہ رہ سکا۔ مکتبہ جامعہ کے ترجمے سلیس اور عام فہم ہیں اور انھیں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، مگر اب اس ادارہ کی توجہ اس طرف بہت کم ہو گئی ہے۔ اس وقت جو ادارے ٹھوس علمی اور کلاسیکی ادب کے اردو میں ترجمے شائع کر رہے ہیں، ان میں دو نیم سرکاری ادارے — ساہتیہ اکیڈمی اور نیشنل بک ٹرسٹ کو بہت اہمیت حاصل ہے اور دراصل اس وقت ان ہی کی بدولت اردو ترجمے کی آبرو قائم ہے۔

سنہ ۶۱ء میں اردو ترجموں کی تعداد اچھی خاصی ہے، مگر میری جن ترجموں تک رسائی ہو سکی ہے ان میں کلاسیکی ادب کا کوئی ترجمہ نہیں ہے۔ ساہتیہ اکیڈمی کے پروگرام میں مختلف زبانوں کے کلاسیکی ادب کے اردو ترجمے شامل ہیں اور پچھلے برسوں میں، ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے گوئٹے کے مشہور ناول ولہیلم مائسٹر کی جلد اول کا ترجمہ براہِ راست جرمن زبان سے کیا ہے، جو دو جلدوں میں

شائع ہوچکا ہے۔ اب وہ اصل کتاب کی دوسری جلد کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ غالباً یہ ترجمہ بھی اردو میں دو جلدوں میں شائع ہوگا۔ اسی طرح سجاد ظہیر صاحب نے فرانسیسی کے مشہور ادیب والتیر کے طویل افسانے کا ترجمہ کیا ہے، جو کاندید کے نام سے شائع ہوا ہے۔ مگر زیر تبصرہ سال میں ساہتیہ اکیڈمی کی تمام تر توجہ ٹیگور کے ڈراموں، ناولوں اور نظموں کی طرف رہی۔ یہ کام بھی بہرحال اہم ہے اور اکیڈمی نے ہندوستان کے شاعر اعظم کے علمی کارناموں سے اردو خواں طبقہ کو روشناس کر کے بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ ٹیگور کے ڈراموں، افسانوں، ناولوں اور نظموں کے ترجمے اُردو میں پہلے سے موجود ہیں، مگر عام طور پر یہ ترجمے انگریزی کے نقطۂ نظر سے کئے گئے ہیں اور ایک دو کے علاوہ تمام تر غیر مستند ادیبوں کے کئے ہوئے ہیں۔ ساہتیہ اکیڈمی یقیناً شکریہ کی مستحق ہے کہ اس نے اُردو کے بہترین مترجمین کی خدمات حاصل کر کے ٹیگور کی نمائندہ چیزیں اُردو میں منتقل کیں۔ ان مترجمین میں ڈاکٹر سید عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب، اور فراق گورکھپوری جیسے ادیب و شاعر شامل ہیں۔ ڈاکٹر سید عابد صاحب نے ٹیگور کے ایک ناول چوکھیر بالی کا ترجمہ کیا ہے۔ موصوف اُردو کے ان چند بلند پایہ مترجمین میں سے ہیں، جن کے ترجمے اور خالص تخلیق میں کوئی فرق نہیں ہوتا اور جنھیں اپنی زبان اور دوسری زبان پر یکساں عبور حاصل ہوتا ہے اور دوسری زبان کے مطلب کو پوری صحت کے ساتھ ادا کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ پروفیسر مجیب صاحب نے ٹیگور کے تین مشہور ڈراموں ــ ڈاکگھر، راجہ اور ڈاک خانہ ــــ کے ترجمے کئے ہیں۔ مجیب صاحب کو ڈراموں سے فطری لگاؤ ہے اور خود نہ صرف یہ کہ کئی ڈراموں کے مصنف ہیں، بلکہ ٹیگور کی طرح ڈرامے کے فن اور اسٹیج کی ٹکنیک سے بخوبی واقف ہیں، اس لئے ان ڈراموں کے ترجمے کے لئے ان سے زیادہ اور کوئی شخص موزوں نہیں ہوسکتا تھا۔ پروفیسر فراق گورکھپوری انگریزی ادب کے استاد رہ چکے ہیں اور اردو کے بہترین شاعروں میں سے ہیں، اس لئے ایک طرف ادب کے رمز شناس ہیں، دوسری طرف شاعری ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے، لہذا ان سے یہ توقع رکھنا بے جا نہ ہوگا کہ انھوں نے ٹیگور کے شاعرانہ کمال کو بڑی حد تک اردو ترجمے میں باقی رکھا ہوگا۔ اس ترجمے کے کچھ نمونے "آجکل" کے ٹیگور نمبر میں شائع ہوئے تھے۔ اس ترجمے پر ایک تنقیدی مضمون بھی شائع ہوا ہے، جس میں ترجمے کی خامیاں بیان کی گئی ہیں

مگر جب تک پوری کتاب چھپ کر سامنے نہ آجائے فی الحال کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔

ٹیگور کے یہ ترجمے جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے، زیر تبصرہ سال میں کئے گئے ہیں، مگر ابھی کتابی صورت میں مکمل ہو کر شائع نہیں ہوئے ہیں۔ شاید ابھی کچھ وقت لگے گا۔ البتہ حسب ذیل کتابیں سنہ ۶۱ء میں شائع ہو چکی ہیں:-

(۱) INDIA WINS FREEDOM از مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم۔

(۲) EDUCATIONAL RECONSTRUCTION IN INDIA از ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب

(۳) KALKI OR THE FUTURE OF CIVILISATION از رادھا کرشنن

(۴) INDIA: TODAY & TOMORROW از پنڈت جواہر لال نہرو۔

(۵) امریکی ناول اور اس کی روایات۔ از رچرڈ چیز۔

(۶) مسالک الابصار فی ممالک الامصار۔ مولف ابن فضل اللہ عمیری

(۷) تفسیر مظہری، مولف قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی مجددی پانی پتی مرحوم۔

(۸) آتم کتھا۔ از ڈاکٹر راجندر پرشاد۔

(۹) شکنتلا از کالی داس۔

(۱۰) ASPECTS OF SCIENCE از سی، وی رامن

مولانا آزاد مرحوم کی کتاب اپنے دور کی مقبول ترین اور اہم ترین کتاب ہے ترجمہ "ہماری آزادی" کے نام سے پروفیسر محمد مجیب صاحب نے کیا ہے۔ یہ کتاب جتنی اہم ہے، اس کا تقاضا تھا کہ اتنا ہی اہم مترجم بھی ہو۔ مجیب صاحب کا خاص مضمون "تاریخ اور سیاست" ہے اور جن لوگوں نے پچھلے دور کے رسالہ جامعہ کا پابندی اور غائر نگاہ سے مطالعہ کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ سیاست حاضرہ پر مجیب صاحب کے ماہانہ تبصرے کتنے متوازن اور ان کی رائیں کتنی معروضی ہوتی تھیں۔ اس کتاب کے لئے ایک ایسے ہی مترجم کی ضرورت تھی۔ البتہ مجیب صاحب کے طرز تحریر پر مغربی اسلوب کا بہت اثر پڑا ہے۔ وہ جرمن، فرانسیسی، اور روسی سے بھی بخوبی واقف ہیں اور ان سب کی خوبیوں کو بڑی فیاضی سے اپنایا ہے۔ اس کی وجہ سے کبھی کبھی ان کی تحریروں میں مغربی اسلوب نمایاں ہو جاتا

اور ترجمے میں تو اس کا احساس اکثر ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ اردو کی طرح انگریزی کے بھی بہترین مصنفین میں سے ہیں اوسان کا انگریزی طرز نگارش بھی بڑا دل کش ہوتا ہے، اس لئے ان کے ترجموں میں انگریزی کی نزاکتیں اور باریکیاں بھی اسی خوبی کے ساتھ منتقل ہوجاتی ہیں۔

دوسری کتاب کا ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے کیا ہے، جو نیشنل بک ٹرسٹ کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کے مصنف ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اردو کے صاحب اسلوب ادیب ہیں۔ اگر انھوں نے اسے اردو میں لکھا ہوتا یا خود ان ہی نے اس کا ترجمہ کیا ہوتا، تو یہ کتاب زبان اور طرز تحریر کے لحاظ سے بھی اردو ادب میں ایک مستقل جگہ کی مالک ہوتی، لیکن ان کے علاوہ اگر کوئی اور مترجم ذاکر صاحب کی خوبیوں کو باقی رکھ سکتا تھا، تو وہ صرف ڈاکٹر عابد صاحب ہیں۔ عابد صاحب ذاکر صاحب کے نہ صرف یہ کہ ہمدم دیرینہ ہیں، بلکہ تعلیم کا بھی وسیع تجربہ اور گہرا مطالعہ رکھتے ہیں، اس لئے ایک طرف وہ ذاکر صاحب کی اداؤں کو سمجھتے ہیں، دوسری طرف تعلیم کے پیچ وخم سے بھی خوب واقف ہیں، اس لئے اس ترجمے میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں، جو ایک خالص تخلیقی کتاب میں ہوتی ہیں۔

تیسری کتاب کا ترجمہ بھی کلکی یا تہذیب کا مستقبل کے نام سے نیشنل بک ٹرسٹ سے شائع ہوا ہے۔ اس کا ترجمہ اردو کے مشہور اور مستند ادیب پروفیسر سید احتشام حسین صاحب نے کیا ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے احتشام صاحب کا یہ پہلا ترجمہ ہے۔ ترجمہ ایک مستقل فن ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جو شخص اپنی زبان میں اچھا لکھتا ہے، وہ دوسری زبان سے اچھا ترجمہ بھی کرسکتا ہے۔ مگر احتشام صاحب کا ترجمہ دیکھنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جتنا اچھا وہ لکھتے ہیں، اتنا اچھا ترجمہ بھی کرسکتے ہیں۔ اس کتاب کو پڑھتے وقت بہت کم محسوس ہوتا ہے کہ ہم ترجمہ پڑھ رہے ہیں۔ البتہ کہیں کہیں بعض چیزیں کھٹکتی ہیں، تو بظاہر اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک تو ہمارے یہاں اصطلاحات کے متعین ترجمے نہیں ہیں، اس لئے کبھی کبھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مترجم نے یہاں انگریزی کی کس اصطلاح کا ترجمہ کیا ہے۔ اس ابہام یا الجھاؤ کی وجہ سے مفہوم کے تعین میں دقت ہوتی ہے۔ مثلاً ایک جگہ احتشام صاحب نے ترجمہ کیا ہے۔ "وہ نئی قدروں اور مطابقتوں کو قبول کرلیں"۔ یہاں اردو خواں کو "مطابقتوں" کے مفہوم کے تعین میں بڑی دقت پیش آئے گی۔ اسی طرح ایک جگہ (ص۱) "خود اظہاری" کا لفظ

استعمال کیا گیا ہے، جو مناسب نہیں ہے۔ دوسری بات میں نے یہ محسوس کی کہ ہر جگہ لفظ کی جگہ لفظ نہیں رکھنا چاہیئے۔ بلکہ اُردو خواں طبقہ کی مناسبت اور اس کے ماحول کے لحاظ سے اس مفہوم کو ادا کرنا چاہیئے۔ مثلاً ایک جگہ احتشام صاحب نے ترجمہ کیا ہے: "سماجی انتشار کا واحد حل" آزمائشی شادیاں" ہی معلوم ہوتی ہیں" صـ۱۱۱ میرا خیال ہے کہ ہندوستان کے لوگ آزمائشی شادیوں سے واقف نہیں ہیں۔ احتشام صاحب نے اردو خواں طبقہ کی مناسبت سے جابجا مفید فٹ نوٹ دئے ہیں۔ اگر اس کی بھی وضاحت کر دیتے تو اچھا تھا۔

اس ضمن میں ایک بات اور کہنی چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اگر کسی مفہوم کو ادا کرنے کے لئے اُردو میں پہلے سے کوئی لفظ یا محاورہ موجود ہے، تو لفظی ترجمہ کے بجائے اُردو کے مروّج لفظ کو ترجیح دینا چاہیئے۔ مثلاً ایک جگہ احتشام صاحب نے ترجمہ کیا ہے: "....عجیب عجیب باتوں کے متعلق: "غیر منہضم" معلومات اکٹھا کر دی ہیں" (صـ۲) غیر منہضم "Undigested" کا لفظی ترجمہ ہے۔ یہ لفظ جب فیکٹس (Facts) کے ساتھ استعمال ہوتا ہے تو اس کے معنی غیر مرتب یا غیر مربوط کے ہوتے ہیں۔ یہی ترجمہ یہاں مناسب تھا۔ "غیر منہضم" معلومات اُردو محاورے کے خلاف ہے۔ ان چھوٹی چھوٹی خامیوں کے علاوہ یہ ترجمہ ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہے۔

چوتھی کتاب کا ترجمہ راقم الحروف نے کیا ہے، جو نیشنل بک ٹرسٹ سے "بھارت — آج اور کل" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ مجھے ترجمہ سے دلچسپی ہے، اور چاہتا ہوں کہ ترجمے کے مسائل کو اصحاب فکر و نظر کی مدد سے حل کیا جائے۔ جامعہ ملّیہ میں اس کے مواقع بھی ہیں۔ رسالہ جامعہ میں بھی اصطلاحات کے ترجمے کا آغاز کرنے کا خیال آیا، مگر ابھی اس خیال کو عملی شکل دینے کی صورت پیدا نہیں ہوسکی۔ یہ ترجمہ چوں کہ خود میرا ہے، اس لئے ظاہر ہے اس کی خامیوں کا اندازہ دوسرے حضرات ہی کر سکتے ہیں، اس لئے اس پر تبصرہ ان کے لئے چھوڑتا ہوں۔

پانچویں کتاب کا ترجمہ اُردو کے مشہور نقاد سید وقار عظیم صاحب نے کیا ہے۔ مجھے یہ کتاب مضمون لکھنے کے بعد اتفاق سے ایک دوکان پر نظر آئی، اس لئے غور سے پڑھنے کا موقع نہیں ملا۔ مترجم نے مصنف اور کتاب کے بارے میں لکھا ہے کہ "ڈاکٹر رچرڈ چیز کولمبیا یونیورسٹی میں انگریزی کے اُستاد ہیں اور ان کا شمار امریکہ کے ممتاز نقادوں میں ہوتا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے امریکی ناول

کی بعض بنیادی اور امتیازی خصوصیات کی نشان دہی کی ہے۔ ان کی رائے میں امریکی ناول تاریخ نگاری اور ان کے امتزاج و عروج کی تاریخ ہے اور اس میں غالب عنصر رومان کا ہے۔" (ص۷)

چھٹی کتاب کا ترجمہ مولانا خورشید احمد فارق صاحب نے عربی سے کیا ہے، جو تاریخ ہند پر نئی روشنی کے نام سے شائع ہوا ہے۔ فارق صاحب اس سے پہلے بھی عربی سے کافی ترجمے کر چکے ہیں ان کے ترجمے سلیس اور شگفتہ ہوتے ہیں۔ کتاب پر تبصرہ تنقید و تبصرہ کے ماتحت کیا جائے گا۔

ساتویں کتاب بھی عربی سے ترجمہ کی گئی ہے، مگر ٹائیٹل کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ حسب ضرورت تشریح اور اضافے بھی کیے گئے ہیں۔ یہ پہلی جلد ہے جو ابتدائی دو پاروں کی تفسیر پر مشتمل ہے۔ تفسیر کا انداز پرانا ہے اور ترجمے کی زبان بھی وہ ہے جو عام طور پر قدیم مذہبی مدارس میں بولی اور لکھی جاتی ہے۔

آٹھویں کتاب کا ترجمہ ہندی سے جناب گوپی ناتھ امن نے کیا ہے، جو "اپنی کہانی" کے نام سے ساہتیہ اکیڈیمی سے شائع ہوا ہے۔ امن صاحب تجربہ کار جرنلسٹ اور اچھے ادیب ہیں۔ موصوف اردو ہندی دونوں زبانوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں اور قومی تحریکوں میں ہمیشہ شریک رہے ہیں۔ اس لئے ہندی کی اس کتاب کی، زبان، مواد اور جذبات کے لحاظ سے، ترجمانی ان سے بہتر اور کون کر سکتا تھا، لہذا امن صاحب کا انتخاب ہر لحاظ سے موزوں اور مناسب ہے لیکن تعجب ہے کہ بعض مواقع پر ترجمہ بری طرح کھٹکتا ہے بعض جگہ زبان میں وہ روانی اور سلاست نہیں ہے جس کی امن صاحب سے توقع کی جاتی ہے، اس کے علاوہ کہیں کہیں عربی کے ناموزوں اور ہندی کے نامانوس الفاظ اور عامی محاورے ذوق پر بہت گراں گزرتے ہیں مثال کے طور پر ذیل کے جملوں میں خط کشیدہ الفاظ ملاحظہ ہوں۔

"یہ انتخاب کہیں زیادہ بسیط تھا (ص۸۰) "سب جھگڑوں کا وہی نبٹارہ کرتے" (ص۸۴) وہ عہد و پیمان کی توثیق رکھتے تھے۔ (ص۸۷) "انھوں نے ان شن (ترک غذا) شروع کر دیا۔ (ص۸۹) "مشرجی سے ست سنگھ رہا۔ (ص۱۰۵)۔

پورا ترجمہ یکساں نہیں ہے۔ شروع میں بہت رواں اور سلیس ہے لیکن آخر میں کچھ زیادہ

اچھا نہیں۔ اس کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔ کانگریس کے منشور کا تذکرہ ہے :۔

"مزدوروں کی حالت سدھارنے کا وعدہ تھا۔ ان کی نوکری مستقل بناکر، ان کے رہن سہن کا معقول تدارک کراکر اور ان کی مزدوری میں ترقی دلاکر ساتھ ہی مزدور جماعتوں کو قائم و منظم کرکے حقوق دلوانے اور دوسرے طریقے سے ان کی حالت سدھارنے کی بات بھی کہی گئی تھی۔" (ص ۶۹)

اس خامی کی وجہ اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ شاید موصوف کو اپنی روزمرہ کی مصروفیات کی وجہ سے ترجمے میں جس ریاض کی ضرورت ہوتی ہے اس کا موقع نہیں ملا۔

نویں کتاب سنسکرت کے زندہ جاوید شاعر کالی داس کی مشہور و معروف کتاب شکنتلا کا منظوم ترجمہ ہے، جسے اردو کے مقبول ترین شاعر حضرت ساغر نظامی نے انجام دیا ہے۔ کتاب ظاہری حسن کے لحاظ سے بڑی دیدہ زیب اور ساغر صاحب کے ستھرے ذوق کی آئینہ دار ہے ۱۹۶۱ء میں ہندوستان و پاکستان میں حسن و خوب صورتی میں اس کے مقابلہ میں کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی ہے۔ لیکن اس کو صحیح معنی میں ترجمہ کہنا مشکل ہے ۔ اولاً تو نظم میں مصنف کے خیالات، اسلوب اور الفاظ کی پابندی ممکن ہے ہی نہیں۔ دوسرے اصل زبان سے جب تک براہِ راست گہری واقفیت نہ ہو، مصنف کے جذبات و خیالات کو بے کم و کاست ترجمہ میں ادا کرنا مشکل ہے۔ خود مترجم نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے ترجمہ میں اصل کی پوری پابندی نہیں کی ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں :۔

"یہ ترجمہ کہیں اصل کا ڈائرکٹ (پابند ؟) ترجمہ ہے، کہیں کالیداس کے جذبات اور مقاصد کو ایک مختار اسلوب میں ظاہر کیا ہے اور کہیں کہیں اپنی تخلیقی اہلیت سے کام لے کر ان کے دائرہ مطالب و مفاہیم میں لطیف اضافے کئے ہیں۔ یہ اضافے کالیداس کے مقاصد منجلی (؟) کرنے کے لئے ہیں۔ (صفحہ ۹۸)۔

فن شاعری کے لحاظ سے اس ترجمے پر ایک اعتراض یہ ہے کہ قدم قدم پر اس کی بحریں بدل جاتی ہیں۔ کہیں کہیں نظم معریٰ بھی شروع ہو جاتی ہے۔ اس "بدعت" کی حمایت یا توجیہہ میں ساغر

نے مقدمہ میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ "ادبی مغنی" اس وضاحت کے بعد اس بدعت کو جائز سمجھیں گے یا نہیں، مجھے تو بحروں کی یہ تبدیلی ذوق پر بہت گراں گزرتی ہے اور ذہن میں ایک جھٹکا سا محسوس ہوتا ہے۔

ساغر صاحب نے ایک طویل اور مبسوط مقدمہ بھی لکھا ہے، جو واقعی بڑی محنت اور تلاش و جستجو کے بعد لکھا گیا ہے۔ اس میں انھوں نے یہ الفاظ خود "سنسکرت زبان کے آغاز وارتقا، اس کی تاریخ اور مدارج، اس کے ادب، ناٹک، اس کی تاریخ آغاز و ترقی اور جملہ متعلقات پر اجمالی طریقے سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔" (ص۱۲) میرے خیال میں اس موضوع پر اس قدر بسط و تفصیل سے اردو میں کسی نے نہیں لکھا ہے اور واقعی ساغر صاحب کی سعی و کوشش تعریف کی مستحق ہے لیکن اس کو پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ساغر صاحب بہترین ادب اسے سمجھتے ہیں، جس میں بڑے بڑے الفاظ استعمال کئے گئے ہوں۔ ان کے اس شوق نے مقدمہ کی سلاست اور روانی کو بری طرح مجروح کیا ہے اور کہیں کہیں عبارت آرائی میں مطلب بالکل خبط ہو کر رہ گیا ہے۔ موصوف نے ان بوجھل الفاظ کے استعمال کی حسب ذیل توجیہہ کی ہے:-

> "لیکن خالص اردو ہندی کے الفاظ کے استعمال کے ساتھ میں اس کا قائل نہیں کہ فارسی کے پر شکوہ اور خوش آہنگ لفظوں سے ارادتاً بچا جائے جیسے ان کی سموم ہوائیں ہمارے جذبہ و خیال کو جھلسا دیں گی۔ صدیوں میں اردو کا جو سانچہ بنا ہے اس میں فارسی کی شیرینی اور قوت اس کی زندگی کا تازہ خون بن کر حل ہوئی ہے۔ یہ قوت برسوں کی مسلسل کوششوں کے بعد ایک کارگر عنصر بن سکی ہے، اس سے بچنا قوت سے محروم ہو جانے کے مترادف ہے۔ (صفحہ ۸۱)۔

ساغر صاحب کے اس خیال سے اختلاف کی گنجائش نہیں کہ خوش آہنگ الفاظ سے ارادتاً بچنا مناسب نہیں لیکن ساغر صاحب کے یہاں تو پرشکوہ الفاظ کے شوق میں عبارت کا آہنگ بگڑ گیا ہے اور الفاظ کے معنی غلط ہو گئے ہیں۔ مثلاً موصوف نے ایک جگہ لکھا ہے: "سنسکرت کرداروں کی تشکیل گو بہت فنکارانہ ہوتی ہے مگر مشخص نہیں بلکہ تمثیلی ہوتے ہیں۔" (۳۸) یہاں "مشخص" کا استعمال

نظمی غلط ہے۔ ڈاکٹر اقبال نے اپنی شاعری میں نفس گرم" بہت استعمال کیا ہے۔ ساغر صاحب کے اس ترجمے میں گرم نفس" ہو گیا ہے۔ (۴۶) موصوف نے کئی جگہ لفظ "امتداد" تنہا استعمال کیا ہے۔ (۴۶) مقصد ہے امتداد زمانہ۔ ایک جگہ ساغر صاحب نے لکھا ہے "ہماری زبان کی امارت اور انجذابی اہلیت مصدق ہوگی (۸۵) انجذاب" لازم ہے متعدی نہیں۔ میں نے اوپر ایک جگہ ساغر صاحب کا ایک مختصر اقتباس نقل کیا ہے۔ اس میں موصوف نے "منجلی" استعمال کیا ہے۔ اردو میں جلا لکھتے اور بولتے ہیں۔ عبارت میں شکوہ پیدا کرنے کیلئے جلا سے انجلاء اور انجلاء سے منجلی بنایا گیا۔ انجلاء بھی لازم ہے جس کے معنی ہیں روشن اور نمایاں ہونا۔ منجلی اسم فاعل ہے، جس کے معنی ہوئے روشن ہونے والا۔ ظاہر ہے یہاں یہ لفظ غلط ہے۔ ایک روزمرہ ہے "عوام کالانعام"۔ اسے ساغر صاحب نے "عوام کالعنام" کر دیا۔ معلوم نہیں موصوف نے عنام کے کیا معنی لئے ہیں اور کیا سمجھ کر استعمال کیا ہے۔ ایک جگہ موصوف نے لکھا ہے "نئی بحروں کی تخلیق، الفاظ کی تال اور سُر اور متعارفہ الفاظ سے غریب الفاظ کی عقدہ کا ذمہ دار ہے" (صـ۹۱) اگر "الفاظ" کی رعایت نے متعارفہ" لکھا گیا ہے تو بیچارے "غریب" نے کیا قصور کیا تھا کہ اسے "ۃ" سے محروم رکھا گیا؟ اگر "متعارفہ" لکھنا تھا تو صحیح ترکیب ہوتی "الفاظِ متعارفہ اور الفاظِ غریبہ" لیکن زیادہ بہتر یہ ہوتا کہ "معروف الفاظ اور غریب الفاظ لکھا جاتا۔

دسواں ترجمہ نیشنل بک ٹرسٹ سے "سائنس کے چند پہلو" کے نام سے شائع ہوا ہے اس کے مترجم کوئی سید حسین صاحب ہیں۔ سائنس کے ترجمے عام طور پر اچھے نہیں ہوتے میرے خیال میں اس کی دو خاص وجہیں ہیں۔ ایک یہ کہ سائنس کے استاد عام طور پر ادیب اور زبان داں نہیں ہوتے، اس لئے انھیں ترجمہ پر پوری قدرت نہیں ہوتی، دوسری وجہ یہ ہے کہ اردو میں اصطلاحات کا ترجمہ نہیں ہوا ہے، اس لئے بھانت بھانت کے ترجمے کئے جاتے ہیں۔ اصطلاحات کے انفرادی ترجمے یوں بھی سب کے لئے قابل قبول مشکل ہی سے ہو سکتے ہیں، لیکن اگر مترجم یا مترجمین عربی سے اچھی واقفیت نہ رکھتے ہوں تو ان کے ترجمے اکثر مضحکہ خیز ہو جاتے ہیں۔ زیر تبصرہ ترجمہ "سائنس کے چند پہلو" کی زبان اور اسلوب میں بڑا الجھاؤ ہے، متعدد مقامات پر غور کرنے پر بھی آسانی سے

مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ اصطلاحات کے بارے میں بھی اختلاف کی بہت کافی گنجائش ہے۔

ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے جن کو میرے نزدیک اردو کے مترجمین میں ترجمے کی کمیت اور کیفیت دونوں کے لحاظ سے سب سے بلند مرتبہ حاصل ہے۔ اچھے اور برے ترجمے کی بہت مناسب تعریف کی ہے۔ موصوف نے "تخلیقی ادب" کے نام سے ایک مختصر مضمون لکھا ہے، جس میں اچھے ترجمے کے بارے میں فرماتے ہیں: "ایک شخص جو اپنی زبان کا مانا ہوا ادیب ہے اپنی زبان پر پوری قدرت اور دوسری زبان سے گہری واقفیت رکھتا ہے، اس زبان کے ادبی شہ پاروں کے مطالعے میں ڈوب کر تہ تک پہنچ جاتا ہے اور ان کے مطلب کو صحت اور وضاحت، روانی اور بے تکلفی کے ساتھ اپنی زبان میں ڈھال دیتا ہے، تو یہ ترکیبی ادب نہیں بلکہ بڑی حد تک تخلیقی ادب ہے جسے خالص تخلیق سے الگ کرنے کے لئے ترجمہ کہہ دیتے ہیں۔" ایسے ترجمے جو مذکورہ بالا تعریف پر پورے اترتے ہیں شاذو نادر ہوتے ہیں اور جو لوگ ایسے ترجمے کر سکتے ہیں، ان کی خدمات حاصل کرنا آسان نہیں، لیکن کلاسیکی کتابوں کے ترجمے ادب کے لئے مفید اور اس میں اضافہ اسی وقت سمجھے جائیں گے، جب مذکورہ بالا معیار کے مطابق ترجمے کئے جائیں۔

برے ترجمے کی تعریف ڈاکٹر صاحب نے یہ کی ہے کہ "دوسری زبانوں کی کتاب سامنے رکھ کر، ڈکشنری کی مدد سے لفظ کے مقابلے میں لفظ ٹانکتے چلے گئے تو یہ ترجمہ نہیں بلکہ اندھادھند نقل ہے جسے محاورے میں مکھی پر مکھی مارنا کہتے ہیں۔ کسی خیال یا مضمون کو ایک زبان سے دوسری زبان میں اکھڑی اکھڑی، ناہموار، الجھی ہوئی عبارت میں ادا کرنا جسے عام طور پر ترجمہ کہا جاتا ہے، ترکیبی ادب کا سب سے سہل نسخہ اور اس کی سب سے بھدی صورت ہے۔" [illegible] کی ترجمے ۱۹۶۱ء کے ترجموں میں بھی بہت سی مثالیں مل جائیں گی۔ میں نے اس مضمون میں ان ترجموں پر تبصرہ کیا ہے، جو مجھے مل سکے عام طور پر ترجمے بہت کثرت سے ہوتے رہتے ہیں۔ بیرونی ممالک کے سفارتخانوں کی سیاسی ضرورتوں نے ترجمے کے معاوضے کو کافی اونچا اور ترجمے کے معیار کو کافی پست کر دیا ہے، جس کی وجہ سے سفارت خانوں میں مترجمین کی قطار در قطار نظر آئے گی، جس میں اگر اتفاق سے کوئی "اہل نظر" پھنس جائے تو غالب کا مشہور شعر "ہر بوالہوس . . . . پڑھتا ہوا واپس جاتا نظر آئے گا۔ اگر اصل سے ملا کر دیکھا جائے تو ایسے ترجمے بہت مل جائیں گے، جنھیں ڈاکٹر عابد حسین صاحب کی اصطلاح میں ترکیبی ادب کہتے ہیں۔ ایسے ترجموں سے اردو ادب کو فائدہ پہنچنے کے بجائے نقصان پہنچے گا۔ اردو میں بہت سی غلط ترجمے رائج ہو گئے

ہیں، مثلاً Co-existence کا ترجمہ بقائے باہم اور Vested Interest کا مفاد پرست اور ان میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ ترجمہ کا کوئی معیار نہیں ہے۔ علمی و ادبی اصطلاحوں کا کوئی مستند ترجمہ نہ ہونے کی وجہ سے ایک ہی اصطلاح کے مختلف ترجمے کئے جاتے ہیں مثلاً Satire کا ترجمہ کوئی ہجو کرتا ہے کوئی طنز۔ Irony کا ترجمہ کوئی رمز کرتا ہے، کوئی طنز۔ نیز ایک ہی ترجمہ کئی اصطلاحوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، مثلاً ایمائیت یا اشاریت Suggestiveness اور Symbolism دونوں کا ترجمہ کیا جاتا ہے، اسی طرح مزاح Humour کا بھی ترجمہ کرتے ہیں اور WIT کا بھی۔ ایک ادیب نے تضاد Incongruity کا ترجمہ کیا ہے اور ایک استاد سائنس نے Contrast کا ـــــ ضرورت ہے کہ اردو کے علمی و ادبی ادارے اس طرف فوری توجہ کریں اور وضع اصطلاحات کا اہم کام شروع کریں۔ ورنہ ہمارے بیشتر ترجمے مصنوعی ادب میں اضافہ تو کریں گے، اچھا ادب پیدا نہ کر سکیں گے۔

نوٹ :

اس مضمون کی کتابت ہو چکی تھی، اس وقت ایک کتاب "ہندوستان کا دستور اور اس کی شرح" موصول ہوئی۔ یہ ہندوستان کے دستور کا انگریزی سے ترجمہ ہے اور جہاں تہاں مترجم نے وضاحت اور تشریح بھی کر دی ہے۔ یہ ترجمہ بھی سنہ ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا ہے۔ اس پر تبصرہ "تنقید و تبصرہ" کے صفحات میں ملاحظہ ہو۔

بچّوں اور بالغوں کی کتابیں

جناب محمد حسین حسان

اُردو زبان میں بچّوں کا ادب اور بالغوں کا ادب دونوں ہمیشہ بے توجہی کا شکار رہے۔ انھیں اتنی اہمیت کبھی حاصل نہ ہوئی جتنی اہمیت کے یہ مستحق ہیں۔

بالغوں کی تعلیم کا مسئلہ تو اب سے کوئی ۲۵، ۳۰ برس پہلے سامنے آیا ہے، اس سے پہلے ہندوستان کی بیشتر آبادی کے اَن پڑھ ہونے کا احساس ضرور تھا مگر اسے دور کرنے کے لئے عملی قدم اٹھانے کی نوبت بعد ہی آئی۔ ۱۹۳۷ء میں جب انگریزوں کی بنائی ہوئی اسمبلیوں اور کونسلوں میں قومی رہنماؤں نے شرکت کی تو اور مفید کاموں کے ساتھ انھوں نے ادھر بھی توجہ کی اور لوگوں میں خاصا جوش پیدا کر دیا اردو پڑھانے کے لئے قاعدے بھی تیار ہو گئے 'ہل' کے نام سے ایک رسالہ بھی جاری ہو گیا۔ لکھنؤ (صدیق بک ڈپو) سے بھی ایک رسالہ اسی مقصد سے نکلنے لگا۔

مگر یہ سب ابتدائی کوششیں تھیں کام کرنے والوں کے سامنے ایک لق ودق میدان تھا مگر کوئی صحیح راہ متعین نہیں ہوئی تھی کوئی عملی واقفیت نہیں تھی کوئی تجربہ نہ تھا۔ نہ دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کے تجربات نظر کے سامنے تھے۔ ملک میں جگہ جگہ بالغوں کے لئے شبینہ مدرسے قائم ہو گئے تھے مگر پڑھانے کے لئے موزوں کتابیں نہیں ملتی تھیں، اور یہ اس راستے میں بڑی رکاوٹ تھی۔

اَن پڑھ بالغوں کی تعلیم کی طرف جامعہ نے بھی توجہ کی۔ بہت دنوں تک شبینہ مدرسے چلتے رہے مگر اس اسکیم نے منظم شکل اس وقت اختیار کی جب شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم نے اسے اپنے ہاتھ میں لیا۔ انھوں نے اس سلسلے میں ایک جامع اسکیم بنائی اور بالغوں کے لئے کتابوں کی تیاری کو اس اسکیم میں خاص اہمیت دی۔ خود کتابیں لکھیں، اپنے ساتھیوں اور اس وقت کے منجھے ہوئے ادیبوں سے لکھوائیں اور دیکھتے دیکھتے بالغوں کے ادب کا ایک قابلِ قدر ذخیرہ سامنے آگیا۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے لگ بھگ

۹۲ کتابیں شائع ہو چکی تھیں اور بہت سی کتابیں اشاعت کی منتظر تھیں۔ اتنے میں ملک کی تقسیم کے سلسلے میں ایک طوفان آیا اور ادارۂ تعلیم و ترقی کا سارا کام درہم برہم ہوگیا لیکن شفیق صاحب ہار ماننے والے نہیں تھے انھوں نے دلّی میں پوری طرح حالات سازگار ہونے کا بھی انتظار نہیں کیا اور اپنے کام میں لگ گئے۔ اسی ہمت اسی تندہی اور اسی لگن کے ساتھ۔ اس مرتبہ دیس کی آزاد حکومت نے بھی ان کی ہمت افزائی کی اور کتابوں کی تیاری کے لئے ایک بڑی رقم تعلیم و ترقی جامعہ کو مرحمت کی لیکن یہ رقم ہندی کتابوں کی اشاعت کے لئے تھی۔ تاہم شفیق صاحب نے بہت سی ہندی کتابوں کے اردو اڈیشن بھی مکتبہ جامعہ سے شائع کرائے۔ اور اس طرح اردو میں بھی بالغوں کے ادب کا ذخیرہ کچھ نہ کچھ بڑھتا رہا۔ یہ بات ذہن میں رکھیے کہ شروع سے اب تک بالغوں کے ادب کی تیاری کرنے والا ہندوستان میں لے دے کے یہی ایک ادارہ ہے۔ اسی لئے اس کی ذمّے داری اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

۱۹۴۷ء کے بعد کچھ عجیب ہمّت شکن فضا پیدا ہوگئی تھی۔ اردو میں بالغوں کے ادب کی تیاری بس ایک سہانا خواب معلوم ہوتی تھی۔ بارے خدا کا شکر ہے کہ شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب کی دُور اندیشی اور کارکنوں کی سوجھ بوجھ سے اب یہ فضا پھٹ گئی ہے اور اُردو میں بھی اس ادب کی تیاری کو غیر معمولی اہمیت دی جارہی ہے۔ ادارہ تعلیم و ترقی نے سائنس، جغرافیہ، اور دوسرے اہم، مفید اور کارآمد عنوانات کے تحت کافی کتابیں مرتب کرلی ہیں۔ ان میں سے چند چھپ گئی ہیں کچھ زیر طبع ہیں۔ سرمایے کی کمی ان کتابوں کی اشاعت میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

کئی سال سے بالغوں کی کتابیں لکھنے والوں کی ہمّت افزائی کے لئے مرکزی حکومت انعام بھی دیتی ہے۔ یہ انعام چودہ زبانوں کے لئے ہے۔ انھی میں اردو بھی ہے۔ اردو میں اس طرح کی بہت سی کتابیں نکل چکی ہیں یہ کتابیں لکھائی، چھپائی، کاغذ اور ظاہری خوشنمائی کے اعتبار سے بہت دیدہ زیب ہوتی ہیں۔ اس سال ان دو انعامی کتابوں کے علاوہ صالحہ عابد حسین صاحبہ کی "پریم اور سیوا کی جیت" بھی چھپی ہے۔ اردو ادب میں صالحہ عابد حسین کا نام محتاج تعارف نہیں ہے۔ شروع شروع میں ایک عرصے تک آپ نے پیامِ تعلیم کی بھی سرپرستی فرمائی ہے۔ پھر بڑوں کے لئے لکھنے لگیں۔ اب خیر سے بالغوں کی طرف بھی آپ نے توجہ فرمائی ہے۔ "پریم اور سیوا کی جیت" بہت آسان اور سادہ زبان میں ایک چھوٹا سا ناول یا ناولچہ ہے انداز بیان

ی بہت ولولہ انگیز ہے۔ محترمہ صالحہ عابد حسین نے کتاب میں ہندی الفاظ بھی بڑی فراخدلی سے کھپائے ہیں۔ ہندی الفاظ موقع موقع سے استعمال کئے جائیں تو مزہ دے جاتے ہیں ورنہ خواہ مخواہ کی ٹھوس ٹھانس معلوم ہوتی ہے اسے چاری اردو زبان کی درگت بن جاتی ہے۔ یہ کتاب بہت اہتمام سے چھپی ہے سوائے کاغذ کے لکھائی چھپائی ٹائیٹل ہر چیز معیاری ہے۔ اندر کی عبارت دو رنگوں میں چھپی ہے۔

بالغوں کے ادب کے مقابلے میں بچوں کے ادب کی حالت کچھ غنیمت ہے۔ اسے شروع سے اردو کے بڑے ادیبوں کی سرپرستی حاصل رہی ہے۔ ان میں مولانا اسمٰعیل میرٹھی کا نام سرفہرست ہے پھر شمس العلماء مولانا نذیر علی کا نام آتا ہے۔ آپ کی بدولت بچوں کا بہت صاف ستھرا اور مفید لٹریچر وجود میں آیا اور آپ کی سرپرستی کی بدولت بچوں کے اچھے اچھے ادیب اور شاعر پیدا ہوئے۔ ان کے علاوہ بعض شخصی اور انفرادی کوششوں سے بھی اسے سہارا ملا، اور بچوں کا ادب دھیمی رفتار سے سہی کچھ نہ کچھ ترقی کرتا رہا۔

بچوں کے ادب کی ترقی میں جامعہ نے بھی اپنے بس بھر کوشش کی ہے۔ جامعہ کے دارالاشاعت مکتبہ جامعہ نے بڑوں کی کتابوں کے ساتھ ساتھ بچوں کی کتابوں کی اشاعت کو بھی پیش نظر رکھا۔ ڈاکٹر صاحب عابد صاحب، پروفیسر محمد مجیب صاحب نے اس طرف خاص توجہ کی، خود کہانیاں لکھیں، ڈرامے لکھے، اور معلوماتی مضمون لکھے۔ یہ بچوں کے ادب کے لئے گویا ایک نیا موڑ تھا۔ مکتبہ سے پیام تعلیم بھی بچوں کے لئے نکلتا تھا۔ اس رسالے کے ذریعے اس کام کو آگے بڑھانے میں بہت مدد ملی۔ اس نے بہت سے اچھے لکھنے والوں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالا بہت سے اچھے لکھنے والے پیدا کئے۔ ان کوششوں کی بدولت خود پیام تعلیم بہترین مضامین کا گلدستہ بن گیا۔ بچوں کے لئے اچھے لکھنے والوں کا ایک حلقہ پیدا ہو گیا۔ بہت سی اچھی اچھی کتابیں وجود میں آگئیں۔ مکتبہ جامعہ کے علاوہ دارالاشاعت (لاہور، فیروز سنز لاہور، انڈین پریس الہ آباد) وغیرہ چند لے دے کے ادارے نسبتاً سلیقے سے یہ کام انجام دے رہے تھے۔

لیکن ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں نے اردو زبان اور اردو کا کام کرنے والے اداروں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ مکتبہ جامعہ خصوصاً بری طرح ہنگامے کا شکار ہوا۔ ساری کتابیں آگ کی نذر ہو گئیں۔ کارکن منتشر اور بچوں کے لئے لکھنے والے تتر بتر ہو گئے۔ ادارہ تعلیم و ترقی کی طرح جامعہ نے اس کی بھی

از سرِ نو تنظیم کی۔ اللہ شکر ہے کہ بڑی جدوجہد کے بعد اب وہ اپنی اصلی حالت پر آ رہا ہے۔

خوشی کی بات یہ ہے کہ اسے اس مرتبہ بھی بچوں کے لئے خاص طور پر چند اچھے اچھے لکھنے والے مل گئے۔ ان میں کرشن چندر، عصمت چغتائی، اور قدسیہ زیدی (مرحومہ) کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ہمیشہ کی طرح اب بھی مکتبہ جامعہ کی کوشش یہ ہے کہ معیاری قصے کہانیوں کے ساتھ بچوں کے لئے معلوماتی مواد فراہم کیا جا تاکہ ایک طرح کا توازن رہے۔

اس سال اس نے پچھلی چھ سات کتابوں کے نئے ایڈیشن شائع کئے ہیں۔ تین نئی کتابیں شائع کی ہیں۔ ۱۔ خرگوش کا سپنا۔ ۲۔ ستاروں کی سیر۔ ۳۔ نہرو دادا۔

"خرگوش کا سپنا" میں یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح ایک خرگوش جس کے چاروں طرف اس کے دشمنوں کا حلقہ سا بنا ہوا تھا محض اپنی سوجھ بوجھ اور عقل کی بدولت ان کی زد سے محفوظ رہا۔ نہ صرف محفوظ رہا بلکہ بہت سے دشمنوں کو اپنی چالوں سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اصل میں خرگوش سے متعلق بہت سی کہانیوں کو کرشن چندر نے کچھ اس ڈھب سے جوڑا ہے کہ کتاب نے ناول کی شکل اختیار کر لی ہے۔ پھر اس میں انھوں نے اخلاقی قدروں کو بڑی خوبی سے سمویا ہے۔ کتاب شروع سے آخر تک بڑی دلچسپ ہے اور ہمیں یقین ہے کہ لکھتے لکھتے کرشن چندر کو "بچوں والی" زبان لکھنے پر پورا عبور ہو جائے گا۔ دوسری کتاب ستاروں کی سیر بھی بچوں کا ناول ہے۔ یہ اب سے پچاس برس بعد کا قصہ ہے: آپس کی ایٹمی لڑائیوں کی بدولت دنیا تباہ ہو چکی ہے۔ ایک سائنس داں نے ان حالات سے بددل ہو کر ایک پہاڑ پر پناہ لی ہے۔ وہ امن کی فاختہ کی تلاش میں ستاروں میں جانا چاہتا ہے۔ اس کے لئے اس نے ایک راکٹ تیار کیا تھا۔ وہ اس راکٹ میں بیٹھ کر اڑنا ہی چاہتا تھا کہ پولس نے آکر اسے گرفتار کر لیا۔ اس نے اپنے بچوں کو راکٹ چلانا سکھا دیا تھا۔ گرفتار ہونے سے پہلے اس نے اپنے بچوں کو تاکید کر دی کہ وہ اکیلے اس پر سوار ہو کر جائیں اور امن کی فاختہ کو تلاش کر کے لائیں۔ چنانچہ بچے اس مہم پر نکل کھڑے ہوئے اور طرح طرح کی مصیبتیں اٹھانے اور کئی ستاروں میں گھومنے کے بعد آخر انھیں امن کی فاختہ مل گئی اور بڑی ردوکد کے بعد اپنے بچوں کو بھیجنے پر راضی ہو گئی۔ ان بچوں کے زمین پر پہنچتے ہی یہ برباد دنیا پھر آباد ہونے لگی یہ ایک سائنسی کہانی ہے اور بڑے ہی اچھے انداز میں لکھی گئی ہے۔ البتہ زبان دو چار جگہ کھڑی

آمرزی ہوئی معلوم مگر بس دو چار جگہ۔ اس کہانی میں بھی جگہ جگہ اخلاقی قدروں کو بڑی خوبصورتی سے سمویا گیا ہے
دادا نہرو پنڈت موتی لال نہرو کی مختصر سوانح حیات ہے۔ ان کی صد سالہ جینتی کی تقریب پر حضرت منور لکھنوی سے لکھوائی گئی ہے۔ پنڈت موتی لال نہرو دیش کی آزادی کی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی باوقار اور بھاری بھرکم شخصیت، ہوش مندی، سیاسی بصیرت، جرأت و بے باکی سے ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں نئی زندگی پیدا کر دی تھی۔ ہندوستان کے لئے یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ اس کے غلامی کے دور میں ایسے بڑے لوگ پیدا ہوئے اب اس آزادی کے دور میں ایسی مخلص اور باوقار شخصیتوں کو آنکھیں ڈھونڈھتی ہیں۔ کتاب کی زبان بہت سادہ اور آسان ہے۔ اندازِ بیان بھی بچوں کے لئے بہت موزوں ہے۔ منوّر صاحب نے بڑی خوبی سے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے ایک سو چار صفحے کی اس مختصر کتاب میں پنڈت موتی لال نہرو کی شخصیت اُبھر کر سامنے آگئی ہے۔ ان تینوں کتابوں کی ظاہری خوشنمائی بھی مکتبے کے معیار کے مطابق ہے۔

کچھ عرصے سے اطہر پرویز صاحب نے بھی بچوں کی کتابوں کے سلسلے میں ایک اردو اشاعت گھر (علی گڑھ) کی بنیاد ڈالی ہے۔ پرویز صاحب خود بھی بچوں کے لئے لکھتے ہیں دوسروں سے بھی لکھواتے ہیں اس مرتبہ اپنے اردو گھر سے انھوں نے تین قیمتی کتابیں شائع کی ہیں (۱) کاغذ کی کہانی (۲) ہماری سائنس (۳) سائنس کے کرشمے۔ کاغذ کی کہانی محمد آفاق صاحب نے لکھی ہے۔ اس میں انھوں نے بڑے دلچسپ انداز میں کاغذ کی پوری تاریخ بیان کر دی ہے۔ کتاب کی تمہید بھی بچوں کے لئے مزے دار پہیلی ہے مصنف نے اس کی زبان بھی بہت سادہ اور آسان رکھی ہے۔ لیتھو کی اور بلاک کی تشریحی تصویریں بھی فراوانی کے ساتھ ہیں۔ غالباً اسی لئے کتاب کی تیاری کی لاگت بڑھ گئی ہے اور اڑتالیس صفحے کی کتاب کی قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے رکھنا پڑی ہے۔

ہماری سائنس اور سائنس کے کرشمے دونوں کتابیں وزارت حسین صاحب (استاد مسلم یونیورسٹی ہائی اسکول) نے لکھی ہیں۔ ان کی ترتیب کے وقت ساتویں آٹھویں نویں درجے کے تعلیمی معیار کا خیال رکھا گیا ہے۔ دونوں کتابوں میں سائنس کے نصابی اور غیر نصابی مسئلوں کو بہت سادہ زبان میں سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ وزارت حسین صاحب استاد بھی ہیں اور بچوں کے معیار، فہم اور ان کی نفسیات کو

باخبر ہیں. اس لئے انھیں اس سلسلے میں بہت کامیابی ہوئی ہے۔ دونوں میں تشریحی تصاویر بھی بے شمار ہیں۔ ان دونوں کتابوں کی کتابت نسبتاً خفی اور ضخامت ڈیڑھ سو صفحات سے زیادہ ہے۔ ان تینوں کتابوں کی ظاہری زیب و زینت پر بھی اردو گھر نے پوری توجہ کی ہے۔

یہاں ہندوستان کی صرف ان چند کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے جو ہمیں بڑی کوششوں کے بعد مل سکیں ہمیں یقین ہے کہ اتنے بڑے ملک میں بچوں کے لئے کتابیں اور بھی لکھی گئی ہوں گی۔ لیکن افسوس ہے کہ اس سلسلے میں ہمیں زیادہ معلومات حاصل نہ ہوسکیں۔ بعض اداروں نے خطوط کے جواب کی زحمت بھی نہ کی۔ ایک ادارے کی طرف سے یہ جواب ملا "ہم دوسروں کی کتابوں پر تبصرہ کرتے ہیں نہ اپنی کتابیں تبصرے کے لئے بھیجتے ہیں۔" اس ایک مثال سے اپنے اردو کے پبلیشرز کی خوش اخلاقی کا آپ کو اندازہ ہوسکتا ہے۔

مجموعی حیثیت سے دیکھئے تو اردو میں بچوں کے ادب کی ترقی کی رفتار خود ملک کی بہت سی زبانوں کے مقابلہ میں بہت سست ہے۔ یورپ کی زبانوں کے مقابلے میں تو یہ منزلوں پیچھے ہے۔ صورت حال یہی رہی تو شاید سو پچاس برس میں بھی ہم اس معیار تک نہ پہنچ پائیں۔

اس سست رفتاری کے بہت سے اسباب ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ ۱۹۴۷ء کے بعد عام اردو ادب کی ترقی پر نمایاں اثر پڑا۔ بچوں کا ادب خاص طور پر کس مپرسی کا شکار رہا۔ دوسرے ملک میں بچوں کے ادب اور ادیبوں کی قدر و قیمت کبھی صحیح طور پر محسوس نہیں کی گئی۔ بچوں کے بہت سے چوٹی کے ادیب گمنامی کی موت مر گئے اور کوئی ان کے ناموں سے بھی واقف نہیں۔ مرزا فہیم بیگ چغتائی اور سید ابو طاہر داؤد کے نام مثال کے طور پر پیش کئے جاسکتے ہیں۔ (۲) بچوں کے رسالے مضامین کا معاوضہ نہیں دیتے نہ پبلشر کتابوں کا اتنا معاوضہ دے پاتے ہیں کہ لکھنے والا اطمینان و آرام سے زندگی گزار سکے اور اسی کام کو اوڑھنا بچھونا بنالے۔ اس لئے بہت سے لکھنے والے محض اپنے شوق کی بنا پر فرصت کے مشغلے کے طور پر یہ کام کرتے ہیں اور جب زندگی کے دوسرے مشاغل میں گھر جاتے ہیں تو یہ غیر ضروری شغل آپ سے آپ ان سے چھوٹ جاتا ہے۔

بچوں کے ادیبوں کی حوصلہ افزائی کے لئے مرکزی حکومت اچھی کتابوں پر سالانہ انعام بھی دیتی ہے۔ اردو کا بھی اس میں حصہ ہے۔ اس انعام کی بدولت دو ایک اچھی کتابیں شائع ہوجاتی ہیں

گران کی حیثیت یوں سمجھئے کہ آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔ ضرورت ہے کہ لوگوں میں بچوں کے ادب کی قدر شناسی عام ہو۔ نیز عام لوگوں کو اس اہمیت کا احساس پیدا ہو۔ یہ کام مکتبہ جامعہ کا ہے۔ وہ اب بھی اپنی بساط کے مطابق یہ کام کر رہا ہے۔ پر اب قدم کو تیز کرنے کی ضرورت ہے۔ انجمن ترقی اردو نے اب تک بڑوں کے ادب کے لئے اپنے کو مخصوص کر رکھا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ انجمن کے ارباب حل وعقد اس ضروری مسئلے پر بھی سنجیدگی سے غور کریں گے اور بچوں کے ادب کی ترقی کے لئے بھی نئی راہیں نکالیں گے۔

نظم

۱۹۶۰ء اور ۱۹۶۱ء میں شائع ہونے والے مجموعے

جناب رشید حسن خاں

پیش نظر مضمون جامعہ کے تعلیمی میلا منعقدہ نومبر ۱۹۶۱ء میں پڑھا گیا تھا۔ فاضل مضمون نگار نے نظر ثانی اور اضافے کے بعد سالنامے کے لئے عنایت فرمایا ہے۔ (مرتب)

۱۹۶۰ء سے اب تک نظم کے بہت سے مجموعے سامنے آئے ہیں۔ پرانے اور معروف شاعروں کے دوش بدوش، نوواردانِ بساطِ ہوائے دل نے بھی، جرأتِ عرضِ ہنر سے کام لیا ہے۔ بعض مجموعے ہندوستان کے ایسے دور دراز گوشوں سے شائع ہوئے ہیں کہ اردو کی ہمہ گیری پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ جیسے اڑیسہ سے امجد نجمی کی نظموں کا مجموعہ "طلوعِ سحر" اور ناسک سے ادیب مالیگانوی کی غزلوں کا مجموعہ "تبسم"۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بے حد ناموافق حالات کے باوجود، ہر گوشۂ بساط پر شعر و ادب کی شمعیں جل رہی ہیں۔

۲۰، ۲۲ ماہ کی اِس مدت میں شائع ہونے والے بیش تر مجموعوں میں، شعرا کی دس پندرہ سال کی ذہنی کاوشیں محفوظ ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد، شاعری میں کئی میلانات اُبھرے اور کئی عنوانات عمرِ برق و شرار کے حریف ثابت ہوئے۔ یہ مجموعے شاعری کے موجودہ معیار، مزاج اور میلانات کے عکاس بھی ہیں، اور پچھلے پندرہ بیس سال کے ادبی انتشار کے آئینہ دار بھی — میں یہاں پر یہ بات واضح کردوں کہ محرکات یا میلانات، کیلنڈر کی طرح ہر سال نہیں بدلتے ہیں، لیکن اُن کے تہ نشین اثرات کام کرتے رہتے ہیں۔ پس منظر کو سمجھنے کے لیے، اُن کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

جن لوگوں نے ۴۷ء سے پہلے اور اُس کے بعد کی شاعری کا مطالعہ کیا ہے، اُن کو اندازہ ہوگا کہ ۴۷ء تک ایجی ٹیشنل شاعری، معراج پر پہنچ چکی تھی۔ طویل سیاسی جد و جہد اور مختلف پرشور

تحریکات کے سبب سے، ذہن بے انتہا مشتعل رہتے تھے۔ اس لیے ایسی نظمیں بہت پسند کی جاتی تھیں۔ تقسیم ہند کے ہنگامۂ خون نے، ہیجانی موضوعات کے ختم ہوتے ہوئے ذخیرے میں، کئی تلخ و تند عناصر کا اضافہ کر دیا اور پھر چند سال کے لیے، موضوعات کا ایک چھوٹا سا سرمایہ ہاتھ آگیا۔ ۵۰ء کے بعد جب سیاسی اور ہنگامی موضوعات، یا تو دم توڑ چکے تھے، یا اُن کی تکرار وبالِ ہوش و گوش ہو کر رہ گئی تھی، ہمارے ادیبوں اور شاعروں کو یہ یک وقت عظیم خلا کا احساس ہوا، جس کو جمود سے تعبیر کیا گیا۔ ۱۵، ۲۰ سال کی لمبی مدت میں، اِس وسیع کائنات کے ان گنت مناظر و مظاہر اور غیر محدود جذبات انسانی کی عکاسی سے کچھ زیادہ ربط نہیں رکھا گیا تھا۔ غم و آلام کو سیاسی نظریوں کی عینک سے دیکھنا اور بنے بنائے فارمولوں کے سانچے میں ڈھال لینا، فنی رکھ رکھاؤ، طرز ادا کے آداب اور خیال یا حادثے کے ردِّ عمل کو، فکر کی آنچ میں تپا کر اس طرح پیش کرنا، کہ وہ خلوص فکر اور تاثیر سے مرکب ہو جائے، اِن باتوں سے بہت دور کا تعلق رہ گیا تھا —— اس لیے ہنگامی موضوعات کے ختم ہوتے ہی اُس برجستہ نگاری پر بھی زوال آگیا۔ ڈیڑھ دو سال کی اس مدت میں جو مجموعے شائع ہوئے ہیں، اُن میں اچھی نظمیں کم ہیں، لیکن یہ ضرور اندازہ ہوتا ہے، کہ ماندگی کے اس وقفے کے بعد، کچھ نئے شاعروں نے قدم بڑھانا شروع کیا ہے، اُن کے یہاں موضوعات کا تنوع بھی ہے اور انداز بیان میں بھی وہ تلخی نہیں ہے۔ یہ بات لائقِ تحسین ہے۔ اچھے رسالوں کی ورق گردانی کی جائے تو ہر ماہ ایسی ایک دو نظمیں مل جائیں گی۔

ترقی پسند تحریک کے آغاز کے ۴، ۶ سال بعد ہی، اس کے دائرۂ اثر میں اتنی توسیع ہوئی کہ چند سخت جانوں کے سوا، سب ہی اس کے زیر سایہ آگئے۔ کچھ لوگ اس کو دینِ حق سمجھ کر، اور کچھ لوگ محض اس ڈر سے کہ رجعت پرست نہ کہلائیں —— موضوعات کو ترقی پسندی اور رجعت پرستی کے خانوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ حقیقت نگار اور باشعور ہونے کے لیے لازمی تھا کہ اس شریعت کے مبلغین کی سریات کو آیت و حدیث سمجھا جائے۔ دس بارہ سال تک یہ جہادِ کم نظری جاری رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاعری چند ہنگامی موضوعات میں محصور ہو کر رہ گئی۔ دوسری طرف اسلوب کا حشر اِس سے بھی برا ہوا۔ مطالعہ، مشق، قدرت کلام، صحت زبان، غرض ہر معقول بات کو

نظرانداز کردینا، لازمۂ ترقی پسندی سمجھا جاتا تھا۔ اس کے فیض سے، حسنِ بیان، دل کشی اور تاثیر معدوم ہوگئی تھی۔

لیکن اب محسوس ہوتا ہے، کہ مفروضات کا وہ طلسم ٹوٹ چکا ہے، اور شاعری اس پنچایتی عدالت کی عطا کی ہوئی قیدِ بے میعاد سے آزاد ہو چکی ہے۔ اب موضوعات کو ترقی پسندی یا رجعت پرستی کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ حسن ادا، اور صحت زبان کی طرف بھی توجہ کی جا رہی ہے۔ یہ فالِ نیک ہے۔

دو سال کی اس مدت میں جو مجموعے شائع ہوئے ہیں، ان کا بہ غور مطالعہ کیا جائے، تو محسوس ہوگا، کہ نئے شاعروں میں جلد سے جلد صاحب کتاب بن جانے کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ شہرت کی خواہش اور مصنف بن جانے کی ہوس نے بہت سی برائیوں کے دروازے کھول دیے ہیں۔ شاعری ایسی چیز نہیں، جس میں "کاتا اور لے دوڑی" کی گنجایش ہو۔ شعر کہہ لینا کوئی قابلِ ذکر بات نہیں مشق و مطالعہ، اور قدرت کلام سے، جب تک ذہن و فکر پر جلا نہ ہو، اور ہر مصرعے پر حسن و تاثیر کی مہر نہ لگ جائے، اس وقت تک بات نہیں بنتی۔ کئی مجموعوں میں یہ بات کھٹکتی ہے کہ سہل پسندی یا عجلت پسندی نے، خوب سے خوب تر کی منزل پر پہنچنے سے ہی باز نہیں رکھا ہے، کلام کی خوبی پر بھی حرف آگیا ہے۔

مشہور ناقدین کے مقدمات نے اس کج خرامی کو بڑا سہارا دے رکھا ہے۔ اس غلط نوازش سے بے راہ روی اور بے جا خود اعتمادی کو برابر شہ ملتی رہتی ہے۔ اور شاعر دوسروں کی صحیح بات سننے اور سمجھنے سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاتا ہے۔ ستم یہ ہے کہ بعض سنجیدہ حضرات بھی اس بدمذاقی میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ جس طرح الکشن کے زمانے میں کمزور امیدوار، کسی بڑے لیڈر کو بلانا اور اس سے کلمات خیر کہلانا ضروری سمجھتا ہے، اسی طرح بعض شاعر کسی مشہور ناقد سے مقدمہ لکھوانا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس کی سب سے بری مثال خورشید الاسلام کے مجموعے "رگِ جاں" پر جناب مجنوں گورکھپوری کا دیباچہ ہے۔ مجنوں صاحب نے اس مجموعے میں وہ ساری خوبیاں بتائی ہیں، جو کئی واقعی اچھے شاعروں کے یہاں الگ الگ ملیں گی۔ جب کہ اس مجموعے میں بہ مشکل ایک یا دو نظمیں ایسی ہیں، جن کا

ذکر کیا جا سکے، اور غزل کے چار، چھ شعر ایسے ہیں، جن کو گوارا کیا جا سکے۔

ایک زمانے میں نظم آزاد کا بہت چرچا تھا۔ سلیقے سے کام لیا جاتا تو یہ بھی ایک اضافہ ہوتا، لیکن یہ بری طرح مشق ناز کا شکار رہوئی، یہاں تک نظم اور نثر کا فرق ختم ہوتا ہوا نظر آیا۔ جو مجموعے اس دور میں شائع ہوئے ہیں، ان میں آزاد نظمیں نسبتہً کم ہیں۔ اور جو ہیں، وہ دل کشی سے معرا ہیں۔ رسالوں میں بھی یہ عجیب الخلقت مخلوق کم دیکھنے میں آتی ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ نظم آزاد ہماری شاعری کو ابھی تک راس نہیں آئی ہے۔

میراجی اور ان کے بعض ساتھیوں کے اثر سے نظم میں ابہام کا رواج اس حد تک بڑھا تھا کہ اہمال اور ابہام پر بے معنی لفظ ہونے کا گمان گزرتا تھا۔ پاکستان میں کچھ شاعر پھر اس جادہ پر پیچ و خم پر تیزی کر رہے ہیں۔ لیکن ہندوستان میں اس کی مثالیں کم یاب ہیں۔ کبھی کبھی کسی رسالہ میں اس ذہنی ورزش کا مظاہرہ دیکھنے میں آجاتا ہے۔ البتہ یہ رجحان ایک اور شکل میں ظاہر ہو رہا ہے۔ اور وہ ہے بے حد مختصر نظمیں کہنا۔ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ تسلسل فکر، اور نظم کے وسیع کینوس پر گل کاری بہت سے شعرا کے بس کی بات نہیں۔ اس لیے چند لائنیں لکھ کر فرض کفایہ ادا کر دیا جاتا ہے۔ ایسی نظموں میں غیر ضروری یا کم الفاظ میں، غیر فطری اختصار سے وہی الجھاو پیدا ہو جاتا ہے، جو ابہام پسندی کا خاصہ ہے۔ (خورشید الاسلام کی بعض نظمیں صرف تین مصرعوں پر مشتمل ہیں) بعض نوجوان شاعر اس مرض کا بری طرح شکار ہیں۔ ان کی ایسی اعجوبہ زائیاں کبھی کبھی رسائل کے صفحات پر نظر آجاتی ہیں۔

ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ بعض نہایت معروف شاعروں کے مجموعے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے پچھلے سرمایے میں مطلق اضافہ نہیں کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ٹھٹک کر رہ گئے ہیں گویا ساری متاع شوق صرف رہ گزر کر چکے ہیں، اب نہ ہاتھوں میں جنبش ہے نہ آنکھوں میں دم۔ جذبی کا مجموعہ "سخن مختصر" اس کی سب سے اچھی مثال ہے۔ اور بعض نئے شاعروں نے اس محفل میں اس انداز سے قدم رکھا ہے کہ ان کی ہوش مندی گراں مایگی مستقبل کی بشارت دیتی ہوئی نظر آتی ہے۔

منظومات

اس زمانے میں اردو کے بزرگ شاعر، تلوک چند محروم کی نظموں کے تین مجموعے شائع ہوئے ہیں

۱۔ کاروانِ وطن ۲۔ نیرنگِ معانی ۳۔ بہارِ طفلی ۔۔۔ بہارِ طفلی بچوں کے لیے مرتب کی گئی ہے۔ یہ مجموعہ اس لحاظ سے قابلِ قدر ہے کہ ایسے مجموعے اردو میں کم ہیں۔ کتاب میں جگہ جگہ تصویریں بھی ہیں جن سے اس کی دلکشی بڑھ گئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ چھٹے ساتویں درجے کے بچوں کے لیے اس مجموعے کی بیشتر نظمیں نہایت مفید ہیں۔ یہ کتاب بہت معمولی کاغذ پر چھپی ہے۔ یہی اس کا سب سے بڑا عیب ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس کی بعض نظمیں یقیناً بچوں کے معیار پر پوری نہیں اتریں گی۔ مثلاً ایک نظم ہے "نرم گفتاری" اس کا پہلا بند ہے۔

کرو کلام بہ نرمی کہ نرم گفتاری ہزار سخت کلامی سے کارگر ہے سوا
کرو کلام بہ نرمی کہ تیز و تند کلام نہ کارِ خیر کو کر دے ذلیل اور رسوا

اچھا تھا کہ اس کا بھی لحاظ رکھا جاتا۔

"کاروانِ وطن" اس لحاظ سے قابلِ قدر ہے کہ یہ آزادی کی لمبی جد و جہد کی مختلف شخصیتوں، تحریکوں اور حادثوں کی آئینہ دار ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس کی بیشتر نظموں میں شعریت اور فکرِ بلیغ کا وہ رنگ نہیں ہے جو آج پسندیدہ بھی ہے اور مقبول بھی۔ لیکن یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ اس کی ہر نظم سے ہندوستان کی سرزمین اور اس کی ترقی سے بے پناہ شغف کا اظہار ہوتا ہے۔ تقسیمِ ہند کے بعد کئی سال تک آزادی کا ماتم کرنا، اور ایک نئے انقلاب کی بشارت دینا فریضۂ شاعری رہا۔ اس اندازِ فکر اور طرزِ سخن نے وطن دوستی اور تعمیر و ترقی کی طرف توجہ کو مبذول نہیں ہونے دیا۔ اسی طرزِ فکر کا یہ اثر ہے کہ آج بھی ہماری شاعری میں نشاطِ کار کی جھلکیاں بہت کم دکھائی دیتی ہیں۔ کئی سال تک مسلسل اس شد و مد کے ساتھ بہت سی مفروضہ مصیبتوں کا رونا رویا گیا، اور اس حد تک کہ شاعری پر یاسیت کے پہرے بیٹھ گئے۔ ایک مفروضہ نئی صبح کے انتظار نے اس طرزِ فکر کو اور دو آتشہ کر دیا۔ جس کے کچھ اثرات آج تک کارفرما ہیں۔

"نیرنگِ معانی" غیر سیاسی نظموں کا مجموعہ ہے۔ محروم صاحب بڑے قادر الکلام شاعر ہیں مشق اور قدرتِ کلام ان کے ایک ایک مصرع سے نمایاں ہے۔ لیکن اس بات کا شدت کے ساتھ احساس ہوتا ہے کہ ان مجموعوں میں اصولِ انتخاب کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ آدمی دن بھر جتنی باتیں کرتا ہے وہ سب درجِ گزٹ ہونے کے لائق نہیں ہوتیں۔

علی جواد زیدی کا مجموعہ "دیارِ سحر" نظموں اور غزلوں کا ملا جلا مجموعہ ہے۔ موضوعات کے تنوع کے لحاظ سے یہ مجموعہ ضرور قابلِ لحاظ ہے۔ لیکن اثر انگیزی کی کمی بری طرح محسوس ہوتی ہے۔ جو نظمیں خالص سیاسی موضوعات پر کہی گئی ہیں، ان میں برہنہ گوئی کا انداز پیدا ہو گیا ہے۔ جو آدابِ شاعری کے خلاف ہے۔

ساحر لدھیانوی کا مجموعہ "تلخیاں" چودھویں بار شائع ہوا ہے۔ یہ مقبولیت شاید ہی کسی نئے شاعر کے مجموعے کو حاصل ہوئی ہو۔ اس میں رومانی نظمیں بھی ہیں اور خالص سیاسی نظمیں بھی ہیں بہت سے نئے نظم گو شعرا کے مقابلے میں، ساحر حسنِ ادا اور طرزِ اظہار پر زیادہ توجہ صرف کرتے ہیں۔ اُن کے یہاں نہ لفظوں کی بازی گری ہے نہ اندازِ بیان کا پیچ و خم۔ لیکن فکر کی گہرائی اور گیرائی کم سے کم ہے۔ خالص رومانی نظموں میں، ان کا حسنِ بیان کچھ اس طرح چمک اٹھا ہے کہ یہ چمک نوجوان نگاہوں کو بے طرح خیرہ کر دیتی ہے۔ مثلاً ان کی ایک مشہور نظم کے یہ دو بند دیکھیے۔

میں سلگتے ہوئے رازوں کو عیاں تو کر دوں — لیکن ان رازوں کی تشہیر سے جی ڈرتا ہے
رات کے خواب اجالے میں بیاں تو کر دوں — لیکن ان خوابوں کی تعبیر سے جی ڈرتا ہے

تیری سانسوں کی تھکن تیری نگاہوں کا سکوت — در حقیقت کوئی رنگین شرارت ہی نہ ہو
میں جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا ہوں — وہ تبسم وہ تکلم تری عادت ہی نہ ہو

یہ انداز عام نوجوانوں خصوصاً طالب علموں اور طالبات کو بے طرح متاثر کر سکتا ہے اور کرتا ہے یہی اس مجموعے کی مقبولیت کی بڑی وجہ ہے۔ اس مجموعے کی سیاسی نظمیں، رومانی نظموں سے بھی کہیں کم رتبہ ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حوادث کو فکر و خیال کی آنچ میں تپائے بغیر نظم کر دیا گیا ہے۔ واقعات یا حوادث کو اس طرح نظم کر دینا، کہ محض کچھ دیر کے لیے دل کی دھڑکن بڑھ جانے کا احتمال ہو، وقتی مقبولیت کا ذریعہ تو بن سکتا ہے، مستقل قدر و قیمت کا نہیں۔ یہ مجموعہ نہایت نفیس کاغذ پر شائع ہوا ہے۔ لیکن لیتھو کی چھپائی نے اس کے حسن کو محدود

۱۔ کاروانِ وطن ۲۔ نیرنگِ معانی ۳۔ بہارِ طفلی۔ — بہارِ طفلی بچّوں کے لیے مرتب کی گئی ہے۔ یہ مجموعہ اس لحاظ سے قابلِ قدر ہے کہ ایسے مجموعے اردو میں کم ہیں۔ کتاب میں جگہ جگہ تصویریں بھی ہیں جن سے اس کی دلکشی بڑھ گئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ چھٹے ساتویں درجے کے بچّوں کے لیے اس مجموعے کی بیشتر نظمیں نہایت مفید ہیں۔ یہ کتاب بہت معمولی کاغذ پر چھپی ہے۔ یہی اس کا سب سے بڑا عیب ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس کی بعض نظمیں یقیناً بچّوں کے معیار پر پوری نہیں اتریں گی۔ مثلاً ایک نظم ہے "نرم گفتاری" اس کا پہلا بند ہے۔

کرو کلام بہ نرمی کہ نرم گفتاری — ہزار سخت کلامی سے کارگر ہے سوا
کرو کلام بہ نرمی کہ تیز و تند کلام — نہ کارِ خیر کو کر دے ذلیل اور رسوا

اچھا تھا کہ اس کا بھی لحاظ رکھا جاتا۔

"کاروانِ وطن" اس لحاظ سے قابلِ قدر ہے کہ یہ آزادی کی لمبی جد و جہد کی مختلف شخصیتوں تحریکوں اور حادثوں کی آئینہ دار ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس کی بیشتر نظموں میں شعریت اور فکرِ بلیغ کا وہ رنگ نہیں ہے جو آج پسندیدہ بھی ہے اور ضروری بھی۔ لیکن یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ اس کی ہر نظم سے ہندوستان کی سرزمین اور اس کی ترقی سے بے پناہ شغف کا اظہار ہوتا ہے۔ تقسیمِ ہند کے بعد کئی سال تک آزادی کا ماتم کرنا، اور ایک نئے انقلاب کی بشارت دینا فریضۂ شاعری رہا۔ اس اندازِ فکر اور طرزِ سخن نے وطن دوستی اور تعمیر و ترقی کی طرف توجہ کو مبذول نہیں ہونے دیا۔ اسی طرزِ فکر کا یہ اثر ہے کہ آج بھی ہماری شاعری میں نشاطِ کار کی جھلکیاں بہت کم دکھائی دیتی ہیں۔ کئی سال تک مسلسل اس شدّ و مد کے ساتھ کچھ مفروضہ مصیبتوں کا رونا رویا گیا، اور اس حد تک کہ شاعری پر یاسیت کے پہرے بیٹھ گئے۔ ایک موہوم سی نئی صبح کے انتظار نے اس طرزِ فکر کو اور دو آتشہ کر دیا۔ جس کے کچھ اثرات آج تک کارفرما ہیں۔

"نیرنگِ معانی" غیر سیاسی نظموں کا مجموعہ ہے۔ محروم صاحب بڑے قادر الکلام شاعر ہیں جن کی قدرتِ کلام ان کے ایک ایک مصرع سے نمایاں ہے۔ لیکن اس بات کا شدت کے ساتھ احساس ہوتا ہے کہ ان مجموعوں میں اصولِ انتخاب کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ آدمی دن بھر جتنی باتیں کرتا ہے وہ سب درج گزٹ ہونے کے لائق نہیں ہوتیں۔

علی جواد زیدی کا مجموعہ "دیارِ سحر" نظموں اور غزلوں کا مِلا جُلا مجموعہ ہے۔ موضوعات کے تنوع کے لحاظ سے یہ مجموعہ ضرور قابلِ لحاظ ہے۔ لیکن اثر انگیزی کی کمی بری طرح محسوس ہوتی ہے۔ جو نظمیں خالص سیاسی موضوعات پر کہی گئی ہیں، ان میں برہنہ گوئی کا انداز پیدا ہو گیا ہے۔ جو آدابِ شاعری کے خلاف ہے۔

ساحر لدھیانوی کا مجموعہ "تلخیاں" چودھویں بار شائع ہوا ہے۔ یہ مقبولیت شاید ہی کسی نئے شاعر کے مجموعے کو حاصل ہوئی ہو۔ اس میں رومانی نظمیں بھی ہیں اور خالص سیاسی نظمیں بھی ہیں بہت سے نئے نظم گو شعرا کے مقابلے میں، ساحر حسنِ ادا اور طرزِ اظہار پر زیادہ توجہ صرف کرتے ہیں۔ اُن کے یہاں نہ لفظوں کی بازی گری ہے نہ اندازِ بیان کا پیچ و خم۔ لیکن فکر کی گہرائی اور گیرائی کم سے کم ہے۔ خالص رومانی نظموں میں، ان کا حسنِ بیان کچھ اس طرح چمک اٹھا ہے کہ یہ چمک نوجوان نگاہوں کو بے طرح خیرہ کر دیتی ہے۔ مثلاً ان کی ایک مشہور نظم کے یہ دو بند دیکھیے۔

میں سلگتے ہوئے رازوں کو عیاں تو کر دوں　　لیکن ان رازوں کی تشہیر سے جی ڈرتا ہے
رات کے خواب اجالے میں بیاں تو کر دوں　　لیکن ان خوابوں کی تعبیر سے جی ڈرتا ہے

تیری سانسوں کی تھکن تیری نگاہوں کا سکوت　　درحقیقت کوئی رنگین شرارت ہی نہ ہو
میں جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا ہوں　　وہ تبسم وہ تکلم تری عادت ہی نہ ہو

یہ انداز عام نوجوانوں خصوصاً طالب علموں اور طالبات کو بے طرح متاثر کر سکتا ہے اور کرتا ہے یہی اس مجموعے کی مقبولیت کی بڑی وجہ ہے۔ اس مجموعے کی سیاسی نظمیں، رومانی نظموں سے بھی کہیں کم رتبہ ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حوادث کو فکر و خیال کی آنچ میں تپائے بغیر نظم کر دیا گیا ہے۔ واقعات یا حوادث کو اس طرح نظم کر دینا، کہ محض کچھ دیر کے لیے دل کی دھڑکن تیز ہو جانے کا احتمال ہو، وقتی مقبولیت کا ذریعہ تو بن سکتا ہے، مستقل قدر و قیمت کا نہیں۔ یہ مجموعہ نہایت نفیس کاغذ پر شائع ہوا ہے۔ لیکن لیتھو کی چھپائی نے اس کے حسن کو محدود

کر دیا ہے اور کہیں مجروح ۔ اس اشاعت میں کچھ نئی نظمیں بھی شامل ہیں۔

جذبی کے تازہ مجموعے "سخن مختصر" میں کئی نظمیں ہیں، اور مختلف موضوعات پر، ان میں دو نظمیں "احساس" اور "تیرے سوا" قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں رومانیت کی جھلکیاں اور تغزل کی لہریں تہ نشین ہیں۔ جن کے فیض سے ان میں حسن بیان بھی ہے اور دل کشی بھی، لیکن باقی نظمیں تلخی بیان سے معمور ہیں۔ ان نظموں میں تقسیم، آل احمد سرور کی خدمت میں، میری شاعری اور نقاد، میرا ماحول خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ جذبی بنیادی طور سے رومانی شاعر ہیں۔ اس لیے ویسے بھی اس سے دامن چھڑا کر نظم کہنا ان کے بس کی بات نہیں۔ خصوصًا جبکہ ہر مصرع پر تلخی بیان کی مہر لگی ہوئی ہو۔ یہ المیہ کئی شاعروں کے ساتھ ہوا ہے کہ وہ صرف رومانی شاعری کے لیے پیدا ہوئے تھے، لیکن انھوں نے اپنی صلاحیتوں کو پہچانا نہیں، اور دوسرے متضاد موضوعات میں الجھ کر اپنی صلاحیتوں کو ضائع کرتے رہے۔ جذبی کی ان نظموں میں جو تلخی ہے وہ ایک عجیب گھٹن، احساسِ کمتری اور گھٹے گھٹے سے احساس نفرت کی پیدا کردہ ہے۔ یہ کوئی خوبی نہیں ہے ـــــ جذبی کی نظم نگاری میں ایک اور عیب ہے اور وہ ہے عدم توازن! ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی طویل نظم کو تناسب بیان اور نظم کی تکنیک کے لحاظ سے مکمل کرنا، یا مناسب نہیں سمجھتے ہیں یا اس پر انھیں قدرت نہیں ہے۔ اس کی سب سے اچھی مثال وہ مشہور نظم ہے، جو انھوں نے مجاز کی موت پر کہی ہے۔ اس کا پہلا بند خوب ہے۔ لیکن دوسرا بند پہلے بند کے مقابلے میں کمزور اور بے ربط باتوں کا مجموعہ ہے۔

خورشید الاسلام کے مجموعے "رگِ جاں" کا ذکر اس سے پہلے بھی آچکا ہے۔ کچھ نظموں پر حد سے بڑھی ہوئی مختصر نویسی کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ مثلاً ایک نظم "انقلاب" صرف چار مصرعوں پر مشتمل ہے اور نظم "ایک تاثر" صرف تین مصرعوں پر۔ ان کو پڑھ کر ناتمامی کا شدید احساس پیدا ہوتا ہے۔ یہ انداز تقلید کرنے والوں کے لیے بھی خطرناک ہے اور خود شاعر کے لیے بھی۔ اردو میں قطعہ اور رباعی بھی اصناف سخن میں شامل ہیں، اور مختصر گوئی کے کام آتے ہیں۔ ایک اور بات یہ ہے کہ کئی نظمیں غزل اور نظم کے درمیان معلق نظر آتی ہیں نیز زبان و بیان پر مکمل قدرت حاصل نہ ہونے کے نتیجے میں جگہ جگہ سخت ناہمواری کا احساس ہوتا ہے۔ آل احمد سرور اور مجنوں گورکھپوری نے جی کھول کر اس مجموعے کی تعریف کی ہے۔ اس مجموعے میں بعض

مگر خوش مذاقی کے دل چسپ نمونے دیکھنے میں آتے ہیں ۔ صرف ایک نمونے کی طرف اشارہ کرتا ہوں ۔ اس مجموعے کا انتساب جان بہار قدسیہ آپا ؒ کے نام کیا گیا ہے قدسیہ آپا ؒ کے نام کے نیچے یہ مصرع بھی درج ہے ؎

اے دریغا نیست معشوقے سزاوار غزل

اس خوش ذوقی کی داد بھی سرور صاحب ہی دے سکتے ہیں مجموعی طور سے ان کی نظمیں فکر کی گہرائی اور انداز بیان کے حسن سے محروم ہیں ۔ مشق کی کمی نے اس عیب کو اور زیادہ نمایاں کر دیا ہے ۔

باقر مہدی کا مجموعہ "شہر آرزو" پہلی بار ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا تھا ۔ دوسرا اڈیشن ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا ۔ اس میں رباعیاں ، غزلیں اور نظمیں سب ہیں ۔ باقر مہدی کی نظموں کا بڑا حصہ کراہتے ہوئے انسان کی کرب آمیز پکار بن گیا ہے ۔ جس میں ذاتی غم کی ایسی آمیزش ہے کہ اکثر جگہ تلخی بہت بڑھ گئی ہے ۔ اس سے دائرہ اثر اور حسن نظم دونوں پر برا اثر پڑا ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص ضبط غم کی منزل سے قصداً دور دور رہنے کی کوشش کر رہا ہے ۔ ذاتی غم کا بیان کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے ۔ لیکن اس میں اس حد تک تلخی کا پیدا ہو جانا کہ حسن بیان اور تاثیر دونوں مجروح ہو جائیں ، مناسب نہیں فریاد کی کوئی مقررہ لے نہ سہی ۔ لیکن اس کو آداب فریاد کی حدوں میں ضرور رہنا چاہیے ـــــ البتہ جو نظمیں اس رنگ سے ہٹ کر کہی گئی ہیں ۔ ان میں وہ ساری خوبیاں ہیں جو ہونا چاہیے مثلاً "خط" ، "ایک ملاقات" باقر مہدی میں شاعرانہ صلاحیتوں کی کمی نہیں معلوم ہوتی ، ہاں ان کی خود ساختہ ذہنی یا جذباتی حد بندی نے ان کی شاعری کا دائرہ بہت محدود کر دیا ہے ۔

نوجوان شاعروں میں مخمور سعیدی کا مجموعہ "گفتنی" خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے ۔ اس کا پہلا اڈیشن ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا تھا اور دوسرا اڈیشن ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا ہے ۔ اس میں غزلیں نظمیں رباعیاں سب ہی ہیں ۔ موضوعات کے تنوع ، فکر ، اور حسن ادا کے اعتبار سے اس مجموعے کی کئی نظمیں نظم کے معیار پر پوری اترتی ہیں ۔ ایسی نظموں میں ناستک ، ماضی ، ایک لڑکی ، زندانی ، خرابے میں ، اعتراف ، سرراہ ، زیادہ قابل توجہ ہیں ۔ ان نظموں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے ، کہ شاعر میں نظم کہنے کا سلیقہ ہے ۔ ان نظموں میں فکر اور جذبے کی آمیزش اور ترتیب ، اس خوبی کے ساتھ عمل میں آئی ہے ، اور حسن ادا کا اس حد تک لحاظ رکھا گیا ہے ۔ کہ گہرائی کے باوجود نہ اشکال ہے نہ ابہام ۔ شاعر نے محض جدت پسندی کے زعم میں ، یا صرف چونکا دینے والا انداز پیدا کرنے کے لیے

کہیں غیر شاعرانہ دراز دستی سے کام نہیں لیا ہے ۔ اس کے ساتھ ساتھ فرسودگی کی جھلک بھی نظر نہیں آتی ۔ موضوعات کے تنوع سے شاعر کی دیدہ وری اور فکر پسندی کا اندازہ ہوتا ہے ـــــ اس مجموعے میں چند نظمیں خالص سیاست زدہ ہیں، ان کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ محض "ضد" میں لکھی گئی ہیں ۔ اسی لیے یہ حسنِ بیان اور تاثیر، دونوں سے معرا ہیں ۔ کسی نقطۂ نظر کی خواہ مخواہ تردید، یا اس کے اعلان اشتہار کے لیے جو کچھ کہا جائے گا، اس میں اگر حسن و تاثیر نہ ہو، تو یہ کوئی قابلِ تعجب بات نہیں ہوگی ۔

مخدوم محی الدین کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ "گلِ تر" اسی سال شائع ہوا ہے ۔ اس میں نظمیں زیادہ ہیں ۔ اس مجموعے کو پڑھ کر مخدوم کی شاعری کے متعلق کوئی اچھی رائے قائم کرنا مشکل ہو جاتا ہے 'ماسکو' 'تلنگانہ' 'نیا چین'، 'گگارن'، کے عنوان سے جو نظمیں ہیں، ان کو تو نظم کہنا، نظم کی جان پر ستم کرنا ہے ان میں وہی نعرہ زنی اور بے کیفی بیان ہے، جو ایک زمانے میں حاصل شاعری سمجھی جاتی تھی ۔ دوسری نظمیں بھی، شاعری سے زیادہ "سطر نگاری" کا مجموعہ ہیں ۔

سلیمان اریب کے مجموعے "پاس گریباں" میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی ۔ انھوں نے مقدمہ میں خود لکھا ہے: "میں اگرچہ ۴۲ء سے شعر کہتا ہوں لیکن "پاس گریباں" میں جو تخلیقات شامل ہیں وہ ۴۴ء سے ہیں ۔ اس سے پہلے میں نے جو کچھ کہا تھا، یا ۱۹۶۰ء تک جو کچھ کہا بالخصوص ۱۹۵۱ء تک جو نظمیں لکھیں، ان کا بڑا حصہ میں نے خارج کر دیا ہے ۔ اس لیے کہ ان میں سے اکثر نظمیں مسائلی اور سیاسی ہیں، شاعری مقصدی ہو یا غیر مقصدی ..... اسے پہلے ادب ہونا چاہیے اور میں نے جو نظمیں اور اشعار قلم زد کر دیے ہیں وہ اس بنا پر کہ ان میں نعرہ بازی زیادہ آگئی تھی ۔ اور ادب کا تناسب کم ہو گیا تھا ۔"

اریب نے جس وضاحت کے ساتھ اپنے خیال کا اظہار کیا ہے وہ قابلِ تعریف ہے اور نئے شعرا کے لیے قابلِ توجہ ۔ اس مجموعے میں اس احتیاط کے باوجود، کئی نظمیں ایسی ہیں، جن پر غیر شاعرانہ مقصدی ادب کی چھاپ لگی ہوئی ہے ۔ ان میں شعریت بالکل نہیں ہے ۔ رومانی نظموں میں تازہ بیانی تو نہیں ہے لیکن حسنِ بیان کا نکھار بھی نہیں ہے ۔ یہ نتیجہ ہے برسوں تک شعریت سے معرا نظم گوئی کی مشق کا ۔ کہ اس اندازِ فکر سے دامن کش ہو جانے کے باوصف، ابھی تک لہجے اور طرزِ اظہار پر قدرت

کلام اور حسن بیان کی چھوٹ نہیں پڑی ہے۔ جگہ جگہ غیر مناسب تشبیہیں، تعبیریں۔ اور غیر مانوس طرز کلام بھی حسن کلام کے راستے میں سنگ گراں بن گیا ہے۔ مثلاً ؎

آگ اور خون کے بپھرے ہوئے اندھے دھارے
؎ کتنے پائل کی چھما چھم کتنے جاموں کی کھنک
؎ بطون خاک میں بوتے ہوئے مہ و انجم
؎ وہی گھناونے منظر وہی کریہہ جذام
؎ کیا عشق میں یونہی ہوتا ہے اک آگ سی ہے دل تا بہ جگر

"طلوع سحر" امجد نجمی کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ اس میں کوئی قابل ذکر بات نہیں ہے۔ البتہ اس مجموعے کی یہ خصوصیت ضرور قابل ذکر ہے، کہ اس میں بارہ ارباب قلم کی رائیں بہ طور دیباچہ شامل ہیں۔ ایک طویل مقدمہ مزید برآں۔ ان ۱۳ حضرات میں معروف نقاد بھی ہیں اور معمولی شاعر بھی۔ بیشتر رائیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ معتبر ناقدین نے حسب معمول مجموعہ پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں کی ہے۔

"شبنم شبنم" کرشن موہن کا مجموعہ ہے۔ اس کی یہ خصوصیت ہمیشہ یاد رکھی جائے گی کہ اس نے حسن طباعت کا ایک معیار قائم کر دیا ہے۔ کرشن موہن بہت شریف انسان ہیں۔ اسی مناسبت سے ان کی نظمیں بھی سیدھی سادی ہیں۔ وہ دل کی بات بے جھجک کہنے کے قائل معلوم ہوتے ہیں اور یہ پسند نہیں کرتے ہیں کہ اس کو دوسرے عناصر سے بوجھل بنائیں۔ اس مجموعے میں کچھ آزاد نظمیں بھی ہیں۔ ان کی یہ خصوصیت مجھے پسند آئی کہ ان میں دوسرے بہت سی آزاد نظموں کی طرح، جگہ جگہ ترنم یا آہنگ کو دم توڑنے پر مجبور نہیں ہونا پڑتا ہے۔ ایک آہنگ آخر تک قائم رہتا ہے یہ بڑی بات ہے۔ یہ مجموعہ بھی پہلی بار ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا تھا۔ دوسرا اڈیشن ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا ہے

قصائد

محسن کاکوروی اور عزیز لکھنوی کے بعد، نعت و منقبت کے قصائد کا چلن اُٹھ گیا تھا۔ یہ بڑا خلا تھا۔ قصیدے میں تشبیب گریز، مدعا اور خاتمہ پر مشتمل کئی حصے ہوتے ہیں۔ سلیقہ ہو تو یہ کئی رنگوں کا دلفریب مجموعہ بن سکتا ہے۔ قدما نے اس سے صرف بادشاہوں کی مدح طرازی کا کام نہیں

بیا ہی، اور بہت سی باتیں بھی کہی ہیں۔ قصیدے میں ایک خاص انداز بیان کی ضرورت ہوتی ہے، جو ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ معنی آفرینی، زورِ بیان اور قدرت کلام کی اس میں بنیادی حیثیت ہے — اقبال سہیل مرحوم کی نعت و منقبت پر مشتمل نظموں اور قصیدوں کا مجموعہ "ارمغان حرم" اس لحاظ سے قابل ذکر ہے۔ اس مجموعے کے قصیدے معیار قصیدہ گوئی پر پورے اترتے ہیں۔ خصوصاً تشبیبیں نہایت دل کش ہیں۔ مثلاً

سرشت حسن تغافل مزاج عشق غیور — وہ التفات سے ہم التجا سے ہیں معذور

بہت بلند نظر ہیں شہید ناوک دوست — وہ اور ہیں جنھیں ہوگی تلاش جلوۂ طور

مری بلا کرے دریوزۂ زکوۃ جمال — لب سوال پہ ہے مہر لن ترانی طور

نہ پوچھ اسیر محبت کی لذت تعزیر — ہر ایک دام بلا ہے شکنج طرۂ حور

ان اشعار سے شاعر کی قوت شعر گوئی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ان قصائد میں شکوہ الفاظ اور چستی بندش کی کمی نہیں۔ ہاں وہ شیفتگی و ربودگی نہیں ہے۔ جو بعض خالص نعت گو شعرا کا حصہ ہے۔ جو مثلاً شہیدی کے کلام میں ہے۔ اس کی وجہ کچھ تو قصیدے اور نعت کا فرق ہے اور کچھ افتاد طبع۔ کہیں کہیں فارسی عربی الفاظ کی کثرت نے بھی روانی کو مجروح کر دیا ہے۔

غزلیات

دوسری جنگ عظیم کے آغاز ہی سے سیاسی و سماجی انتشار اور بعض دوسرے محرکات کے سبب سے، بہت سے اچھے شاعروں کی توجہ غزل گوئی کی طرف سے ہٹ گئی تھی۔ سنہ ۵۰ء کے بعد جب ہنگامی موضوعات کا خزانہ قریب قریب ختم ہو گیا، اس وقت پھر یہ صنف یاد آئی اور بے طرح یاد آئی۔ غزل کے حسن ظاہر میں مشق سخن اور آداب تغزل کی رعایت کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔ اور حسن باطن کے لیے گداز دل کی ضرورت ہوتی ہے۔ ۱۰، ۱۵ سال تک غزل سے بے تعلق رہنے کی بنا پر اور چیخ پکار کو الفاظ کا لبا پہناتے رہنے کی وجہ سے، نہ مشق سخن رہی نہ دل دوزی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ رجعت بہتوں کو راس نہیں آئی — سنہ ۵۵ء کے قریب قریب، جب مختلف حالات کی وجہ سے، ذہن و قلب میں مایوسی و ناکامی کی لہریں دوڑ رہی تھیں، قدیم شعرا کے رنگ میں شعر کہنے کا رجحان بڑھا

ان حالات میں سب سے زیادہ میرؔ کی یاد آئی۔ اور کئی اچھے شاعر اس طرف متوجہ ہوگئے۔ یہ کوئی صحت مند رجحان نہیں تھا۔ میرؔ کے زمانے کے کچھ لفظ استعمال کرنے سے، یا محض ناکامی و نامرادی کے بیان سے تقلید میرؔ ہونے سے رہی۔ اس کے لیے تو اس دل خوں شدہ اور اس خلوص وفا کی بھی ضرورت ہے، جو میرؔ کا طرۂ امتیاز تھا ـــــ نتیجہ یہ ہوا کہ دو چار سال کے بعد، اس رجحان نے دم توڑ دیا ـــــ اس وقفۂ مختصر میں ذاتی رجحانات اور انفرادیت کو ٹھیس پہنچتی رہی۔

اب اندازہ ہوتا ہے کہ یہ رنگ ختم ہو گیا ہے۔ نیز ہمارے بعض غزل گو آداب غزل گوئی کا احترام ضروری سمجھنے لگے ہیں۔ یہ فال نیک ہے۔ البتہ سہل پسندی، عجلت پسندی، عدم مطالعہ، اور عدم قدرت کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ خوب سے خوب تر کی جستجو، اور ڈوب کر شعر کہنے کا انداز کم دیکھنے میں آتا ہے حالاں کہ معیاری غزل گوئی کے لیے یہ لازمی شرائط ہیں۔

ایک زمانے میں غزل کے خلاف خاصا جہاد کیا گیا۔ ایک گروہ نے تو اس کو جاگیردارانہ محرکات کی امین بتا کر اس سے زبان و قلم کو آلودہ نہ کرنے کی ہدایت فرمائی تھی۔ یہ سارے مہمل دعوے خود بخود ختم ہو گئے ہیں۔ جو لوگ پہلے غزل کو کشتنی سمجھتے تھے، اب کفارہ ادا کرنے کے لیے سب سے زیادہ غزلیں کہہ رہے ہیں۔

صرف غزلوں کے جو مجموعے میرے پیش نظر ہیں، ان میں شاہد صدیقی اور غلام ربانی تاباں کے مجموعے خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ شاہد صدیقی کا مجموعہ پڑھ کر یہ احساس ایک بار پھر تازہ ہو جاتا ہے کہ جب تک ڈوب کر شعر نہ کہا جائے، بات نہیں بنتی۔ شاہد صدیقی کی غزلوں میں مقصدی یا مسائلی شاعری کی بہتات ہے۔ انھوں نے زندگی کی محرومیوں اور سماجی مصیبتوں کا بار بار ذکر کیا ہے۔ لیکن کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اس بیان غم کو محض انسانی فرض سمجھ کر شریک غزل کیا ہے، یہ نہ ان کے ذاتی تجربات کا جزو بن سکا ہے، نہ شریک فکر و خیال ہو سکا ہے ـــــ ہمارے یہاں ایک رسم ہے کہ شاعر محض اس خیال سے کہ اس کا شمار باشعور اور حقیقت نگار شعرا میں کیا جائے، غم دوراں، شکایت، نامرادی، محرومی، اور ایسے ہی کچھ حقیقی اور کچھ مفروضہ بیانات کی تکرار ضروری سمجھتے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ تصورات دل کی گہرائیوں میں تہ نشین نہیں ہوتے ہیں۔ اس لیے حقیقت نگاری

کے باوصف، حسن بیان، اور تاثیر دونوں عنصر معدوم رہتے ہیں۔ ورنہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی جب کوئی شاعر مسائلی شاعری پر زور طبع صرف کرتا ہے تو اکثر و بیشتر اس میں تکرار محض اور بے کیفی کے سوا کچھ نہیں ہوتا، اور جب وہی شخص کچھ دیر کے لیے اس مصنوعی نوحہ گری سے دامن کش ہو جاتا ہے، تو شعر خلوص و تاثیر کی روشنی میں ڈوب جاتے ہیں۔

شاہد کے اس مجموعے میں زیادہ غزلیں، غم زمانہ کے سادہ و بیرنگ بیان کی آئینہ دار ہو کر رہ گئی ہیں۔ لیکن جہاں وہ اس عام انسانی فرض کو ادا کرنے سے کچھ دیر کے لیے رک گئے ہیں، اور آداب تغزل کا لحاظ رکھا ہے، وہاں دل کشی و حسن بیان کا رنگ چمک اٹھا ہے۔ مثلاً

ان کو منظور نہیں درد کا رسوا ہونا   آہ کرتا ہوں تو آواز بدل جاتی ہے
ترا کرم کہ مجھے سوز زندگی بخشا   مری خطا کہ اسے زندگی بنا نہ سکا
ایک پل کے رکنے سے دور ہو گئی منزل   صرف ہم نہیں چلتے راستے بھی چلتے ہیں

آداب تغزل کی رعایت کے فیض سے کہیں کہیں سیاسی اشارے بھی جزو غزل بن گئے ہیں۔

مثلاً ہم ہی رہ گئے پیاسے ورنہ بزم ساقی میں   جس طرف نہ تھا کوئی اس طرف بھی جام آیا
رفتہ رفتہ یاد ان کی بن گئی غم دنیا   زندگی کا سرمایہ زندگی کے کام آیا

یہ صحیح ہے کہ ان اشعار میں، اول الذکر اشعار کی طرح، شعریت کا وفور نہیں ہے، پھر بھی ایک حسن ضرور ہے، لیکن ایسے اشعار کی تعداد اس مجموعے میں بہت کم ہے۔ زیادہ غزلیں ایسی ہیں، جو محض فرض انسانیت کی یادداشتوں کا مجموعہ، اور عام مفروضہ حقیقت نگاری کا بے رنگ مرقع ہیں۔ یہ مجموعہ اس لحاظ سے نئے شعراء کے لیے عبرت و نصیحت کا مرقع ہے، کہ ایک ہی شاعر کے یہاں دو رنگ ہیں۔ بہت واضح، ایک طرف بل گل اندھیرا ہے، دوسری طرف کچھ چنگاریاں چمک رہی ہیں۔ کتنی حسرت کے ساتھ دل چاہتا ہے کہ یہ چنگاریاں شعلوں میں تبدیل ہو جائیں اور آتش مقدس کی طرح مجموعۂ نور و حرارت بن کر رہ جائیں۔

بعض شاعر جن کو فطرت نے غزل گوئی کی بہترین صلاحیتیں عطا کی تھیں، ایک مدت تک سیاسی شاعری کے پھیر میں پڑے رہے۔ لیکن اس تضاد کو دیر تک نہیں نباہا جا سکا۔ عرصے تک بے روح شاعری

بر زورِ طبع صرف کرنے کے بعد وہ بھی آخر صحیح راستے پر آ گئے۔ ایسے شاعروں میں غلام ربانی تاباں خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ موصوف نے ایک زمانے میں دوسرے بہت سے شعرا کی طرح اپنی فطرت کے تقاضوں کو نظر انداز کر کے، سیاست زدہ نظم نگاری کو مطمح نظر بنا لیا تھا۔ جس میں شعریت سے زیادہ نعرہ زنی کا پر شور آہنگ تھا۔ لیکن ان کی غزلیات کے مجموعے "حدیثِ دل" کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اب اُس بد مذاقی سے بھی قطع تعلق کر لیا ہے۔ اور نظم گوئی سے بھی، جو درحقیقت ان کے مزاج سے میل نہیں کھاتی تھی۔ تاباں کی غزلوں میں کلاسکل اندازِ سخن کی کیفیت پیدا ہو چلی ہے اور اشعار میں گداز دل کی آنچ محسوس ہوتی ہے۔ اس مجموعے میں چند غزلیں ایسی ضرور ہیں، جن میں سیاسی اشاریت حسنِ ادا پر غالب آ گئی ہے۔ ان میں وہی بے رنگی ہے جس کو ہونا چاہیے لیکن ایسے شعر نسبتہً کم ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی صلاحیتوں کا اندازہ کر لیا ہے۔ اور عرفانِ ذات کی منزل پر پہنچ گئے ہیں۔ جس کے اثرات جگہ جگہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ چند اشعار سے ان کے اس رنگِ سخن کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

کہاں سے لائیں گے اہلِ حرم مذاقِ سجود — مری جبیں بھی نہیں تیرا نقشِ پا بھی نہیں
عشق کیا خود حسن محوِ آرزو رہنے لگا — دل فریبیِ تمنا کارگر ہونے لگی
پیام آتے رہے اکثر کسی محوِ تغافل کے — ادائے برملا بن کر نگاہِ شرمگیں بن کر
لبِ نگار کو زحمت نہ دو خدا کے لیے — ہم اہلِ شوق زبانِ نظر سمجھتے ہیں

بسمل سعیدی کے مجموعے "مشاہدات" میں نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی، لیکن وہ دراصل غزل کے شاعر ہیں۔ ان کے اچھے اشعار میں سوز و گداز کی فراوانی ہے۔ لیکن اس کا تعلق سوزِ عشق سے نہیں، سوزِ زندگی سے ہے۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بہت سی مایوسیوں، ناکامیوں اور حادثوں نے ان کو گدازِ دل کی دولت بخشی ہے۔ بسمل صاحب بہت مشاق اور باخبر شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں میں استادانہ غور، اور فکر و فن کا اچھا امتزاج ملتا ہے۔ ان کے بہت سے دلدوز شعر پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ایک شخص ہے جو حالات و حوادث کی دھوپ چھاؤں سے گزرتا چلا جا رہا ہے۔ اور اس کے تاثرات

اشعار کی صورت میں نمایاں ہوتے جا رہے ہیں۔ چند اشعار سے ان کے اس رنگ سخن کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

وہ کچھ اس طرح مجھ کو دیکھ کر منہ پھیر لیتے ہیں — کہ جیسے میری حالت واقعی دیکھی نہیں جاتی
غضب ہی ٹھیس لگنا عشق کی خود دار فطرت کو — بس اے چشم کرم اب التفات رائگاں کب تک
دلِ بے بیداد جنوں دشت میں دیو لانے کو — ہر طرف کچھ در و دیوار نظر آتے ہیں

لیکن مجموعی طور سے یہ مجموعہ اُن کے پچھلے مجموعوں سے ہلکا ہے۔ جس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انتخاب کے اصول کو مدنظر نہیں رکھا گیا ہے۔ کئی غزلیں اور نظمیں اس مجموعے میں ایسی ہیں کہ اگر وہ نہ ہوتیں، تو بہتر ہوتا۔

جذبی جانے پہچانے شاعر ہیں۔ ان کے مجموعے "سخن مختصر" کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے "فروزاں" کے بعد کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں کیا ہے۔ بلکہ پچھلی روایت کو مجروح کر لیا ہے! اس مجموعے کی بیشتر غزلیں، حسن ادا، گداز دل اور تاثیر سے محروم ہیں۔ کہیں کہیں تو غزل اور نظم کا امتیاز بھی ختم ہو گیا ہے۔ اور سطحیت نمایاں ہو گئی ہے۔ یہ رنگ ۵۶ء تک کی غزلوں پر چھایا ہوا ہے۔ اس کے بعد کی دو تین غزلیں ضرور ایسی ہیں، جن میں کہیں کہیں حسن بیان کی چنگاریاں چمک اٹھی ہیں۔ اور جذبے کی ہلکی سی جھلک بھی نظر آتی ہے مثلاً

جب کبھی کسی گل پر اک ذرا نکھار آیا — کم نگاہ یہ سمجھے موسم بہار آیا
ہم نے غم کے ماروں کی محفلیں بھی دیکھی ہیں — ایک غمگسار اٹھا ایک غمگسار آیا
چمن کا گوشۂ راحت قفس کا کنج عذاب — کہاں کہاں نہ تری انجمن کی یاد آئی

لیکن ان چنگاریوں کی چمک جلد ہی ختم ہو جاتی ہے اور پھر وہی سطحیت سے لبریز غزلیں سامنے آ جاتی ہیں۔ جذبی نے محض دوسروں کی دیکھا دیکھی ایک زمانے میں سُنی سنائی باتوں اور چلتے ہوئے سیاسی نعروں کو غزل میں نظم کرنا فریضۂ غزل گوئی سمجھ لیا تھا جس کی وجہ سے ان کی اُس زمانے کی غزلیں حسنِ تغزل سے یکسر تہی داماں ہیں۔ مثلاً اس زمانے کی ایک غزل کے یہ شعر دیکھیے۔ اس سے رنگ سخن کا کچھ اندازہ ہو گا۔

ابھی زمیں حسیں ہے نہ آسماں حسیں ۔۔۔ ابھی بنی ہی کہاں ہے مری بہشت بریں
ابھی ہے ذوقِ جنوں اپنا مصلحت آگیں ۔۔۔ ادھر بھی ایک نظر اے نگار خطۂ چیں
یہ سوچتا ہوں کہ بدلا بھی ہے نظامِ الم ۔۔۔ یہ دیکھتا ہوں کہ موجِ نشاط بھی ہے کہیں
یہ اہتمام یہ تیاریاں تباہی کی ۔۔۔ عرق عرق ہوئی جاتی ہے زرفشاں سی جبیں

یہ غزل ۱۹۴۵ء کی ہے۔ جذبی نے ۱۹۵۶ء کے بعد اس طرزِ سخن کو ترک کر دیا لیکن بے کیفی کے جو اثرات ... سال مسلسل محیط رہے، ان کے عکس ابھی نظر آتے ہیں۔ حسنِ بیان و تاثیرِ سخن، کی کبھی کبھی ہلکی سی جھلک دکھائی دے جاتی ہے، اس قدر ہلکی، کہ محض گمان ہوتا ہے۔ ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ جذبی کے کلام میں عجزِ بیان اور الفاظ کے غلط استعمال کی ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ تعجب ہوتا ہے۔ ...خامی خورشید الاسلام کے یہاں بھی ہے اور بہ کثرت۔ جذبی عمر اور مشقِ سخن کی بہت سی منزلیں طے کر چکے ہیں، ان کے یہاں معائب اور اسقام کی ایسی مثالیں تعجب خیز ہیں، ان ناہمواریوں نے ان کے کلام کے ایک خاصے حصّے کو مجروح کر دیا ہے۔ جیسے

ع ۔۔۔ ہر قدم آگے بڑھانے کے لیے خون کی بھینٹ
ع ۔۔۔ نئے بل نئے زور ان کو سکھائے
ع ۔۔۔ اس اندھیرے میں اجالے کے سماں ملتے ہیں
ع ۔۔۔ تو یہ وہ تیر ہے جس کے لیے خطا ہی نہیں
ع ۔۔۔ دھڑکا رہے ہیں پھر بھی دلِ کائنات ہم

بعض مقامات پر رعایتِ لفظی اور غیر مانوس تعبیرات کی ایسی مثالیں سامنے آتی ہیں کہ مذاقِ سلیم الاماں پکار اٹھتا ہے مثلاً ؎

جب ذکر ان کے شہدِ لب و رخ کا چھڑ گیا ۔۔۔ ہم چپ رہے ہیں تلخی کام و دہن لیے
ع ۔۔۔ اک مہکتی ہوئی سرشار نگاہی گم ہے

ایسے اسقام صرف شاعر کے کلام کو مجروح نہیں کرتے ہیں، بہت سے نئے شعرا کو گمراہ کرنے کا فرض بھی انجام دیتے ہیں۔

خورشید الاسلام کی غزلیں، ان کی نظموں سے بھی کم دل کش ہیں۔ کہیں ردیفیں اکھڑی اکھڑی سی ہیں، کہیں غزلوں پر نظم کا سایہ پڑ گیا ہے جس سے نہ غزل کا حسن باقی رہا ہے نہ نظم کا رنگ چمک سکا ہے ۔ مثلاً

یار کا دامن نہ جانے کب چھٹا — گرمیٔ بازار میں کھو یا گیا
بیچ دی ہم نے نبوت کی قبا — کوچۂ عطار میں کھو یا گیا
حیف وہ راہی کہ منزل کے قریب — چشمہ و کہسار میں کھویا گیا

خورشید الاسلام سوداؔ سے متاثر ہیں کہیں کہیں یہ رنگ نمایاں بھی ہے لیکن اور بہت سے رنگ بھی نظر آتے ہیں۔ کہیں فراقؔ کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔

کوئی فریب تراشو کوئی چراغ جلاؤ — یہ ایک رات کسی طور سے بسر کر جاؤ
طرح طرح سے دلوں کو تپا تپا کے رچاؤ — فریب غیر تو کھائے فریب یار بھی کھاؤ
یہاں تو کوئی نہیں دل تلک اکیلا ہے — قبا کے بند تو کھولو، ہمارے پاس تو آؤ

کہیں انشاؔ کی قلندرانہ آواز کی گونج سننے میں آتی ہے ۔

اتنا تو ذرا سوچو کہ جس شہر کے تم ہو — اس شہر کا میں بھی ہوں میاں مجھ کو نہ چھیڑو
عاشق ہوں سپاہی ہوں مجھے سہل نہ جانو — کھیلو کوئی دن تیر و کماں مجھ کو نہ چھیڑو

کہیں محض لفظوں کی الٹ پھیر ہے ۔

وہ چند روز کہ جن کی بہار لٹ نہ سکی — وہ چند روز جنھیں ہم بہار کر نہ سکے
وہ ابتدا جو ہمیں آشکار کر نہ سکی — وہ انتہا جسے ہم آشکار کر نہ سکے
وہ زندگی جو ہمیں معتبر سمجھ نہ سکی — وہ موت ہم جسے بے اعتبار کر نہ سکے

غزل میں معائب زبان اور عجز بیان کی نمود بہت کھٹکتی ہے۔ اس مجموعے میں ایسے مصرعے بہت ہیں، جن پر ان عیوب کی مہریں لگی ہوئی ہیں مثلاً

ع تمھیں بھی ہم سے رم ہونے لگا ہے
ع ہم پی بھی پلا چکے بھی کب کے

ع کوئی وہ خندہ جو برپا نہ ہو تکمیل جائے

ع بہم رہے ہیں سرِ سینہ یک دگر کیا کیا

ں ان کی غزلیں تغزل ہی سے عاری نہیں، حسنِ بیان سے بھی محروم ہیں۔ اب غزلوں میں ایسے شعر گوارا کرنا بہت صبر آزما کام ہے۔

سوچنا پڑتا ہے یاں رک رک کے اک اک لفظ کو — اور وہاں چلتے ہوئے فقروں کی اک فرہنگ ہے

یہ توازن یہ تکلف یہ نہیں یہ ناپ تول — معجزہ ہے معجزہ نیرنگ ہے نیرنگ ہے

ں مجموعے میں مجھے کہیں معجزۂ شاعری در کنار کرشمۂ شاعری بھی نہیں ملا۔ کہیں کہیں سیمیا کی سی نمود ضرور ہے۔ جس کا رنگ اڑتے دیر نہیں لگتی۔

"تبسم" ادیب مالیگانوی کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ ادیب پرانے غزل گو ہیں۔ جذبات آمیز سادگی بیان ان کے اچھے اشعار کا امتیازی وصف ہے۔ مثلاً

لٹ گیا رات ہیں اس بزم میں کس طرح ادیب — تم تو بیٹھے تھے بہت دور تمہیں کیا معلوم

یہ مست مست گھٹائیں یہ سرد سرد ہوا — سمجھ رہا ہوں کہ در پردہ کیا اشارا ہے

سجائی تو ہے انجمن حسرتوں نے — دل اس انجمن سے بھی اکتا نہ جائے

کہیں کہیں فکر کے ہلکے ہلکے انعکاسات نے شعر میں لطفِ مزید کا اضافہ کر دیا ہے مثلاً

ہم اپنا ساتھ دیئے جائیں یہ بھی کیا کم ہے — نہ ہو ہوائے گلستاں جو ساز گار نہیں

لذت آموز غمِ عشق ہے ساری محفل — عام سوزِ دلِ پروانہ ہوا جاتا ہے

یہ مجموعہ نہایت اچھے کاغذ پر شائع ہوا ہے۔ جلد بھی بہت خوب صورت اور مضبوط معلوم ہوتی ہے کتابت اور طباعت بھی بہت سے مجموعوں سے اچھی ہے۔

سراج لکھنوی کا مجموعہ "شعلۂ آواز" صرف غزلوں کا مجموعہ ہے، جو ۱۸ء سے اکتوبر ۶۱ء تک کے کلام پر مشتمل ہے۔ سراج صاحب کی غزلوں میں مرصع سازی کی رنگ غالب ہے۔ وہ الفاظ کے نگینوں کو

کبھی مناسب اور کبھی غیر ضروری رعایتوں کے ساتھ جڑنے کے شائق معلوم ہوتے ہیں، چند اشعار سے ان کے عمومی رنگ سخن کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

گنگنے آنسو نفس میں ہلکا ہلکا سا گداز — یوں ترے شائستۂ غم گرم افسانہ رہے
وہی یاں کی چادر اوڑھ کر لب پہ ہنسی آئی — خوشی کے آنسوؤں نے بھی مزاج غم کہاں بدلا
جو اشک سرخ ہے نامہ نگار ہے دل کا — سکوت شب میں لکھے جا رہے ہیں افسانے
آ طور پہ پھر ل کے چڑھائی کریں اے دوست — سب ڈھنگ وہی ہیں ترے چھپنے کی ادا میں
تنکے قفس تک اڑ کے نشیمن کے آ گئے — رخ پر ہوا کے تیر لگائے بہار نے
ستم ہے غم کی دولت بھی عطا کی جائے قسطوں میں — تکلف ہر طرف ہونا ہی جو اک بار ہو جائے

ان کی غزلوں میں داخلیت اور سوز و گداز کے بجائے، فنِ تزئینِ شعر کی فراوانی ہے۔ اور یہی ان کا غالب رنگ ہے۔ جو شعر اس تکلف سے بری ہیں، وہ خوب ہیں۔ مثلاً

ہمیں خود بن گئے آئینہ دنیا کے تغیر کا — زمیں کی گردشیں بدلیں نہ دورِ آسماں بدلا
ہاں تم کو بھول جانے کی کوشش کریں گے ہم — تم سے بھی ہو سکے تو نہ آنا خیال میں

لیکن ایسے شعر بہت کم ہیں — معمولی خیالات کو بھاری بھرکم الفاظ اور بوجھل اندازِ بیان میں اس طرح پیش کرنا، کہ ان میں بہ ظاہر نیا پن جھلکنے لگے، سیماب صاحب کی خصوصیت تھی۔ سراج صاحب کے یہاں بھی قابلِ ذکر تعداد ایسے اشعار کی ہے۔ جیسے

امانت سونپ کر بنیاد بھی حشر آفریں رکھ دی — جہاں سے ایک مٹھی خاک اٹھائی تھی وہیں رکھ دی
سراج آہ وہ نادیدہ مرکزی جلوے — ہزار زاویے بدلے نگاہ کر نہ سکے

سلیمان اریب کے مجموعے "پاس گریباں" میں غزلوں کی قابلِ ذکر تعداد ہے۔ ان میں تغزل کا رنگ بے حد ہلکا ہے۔ مشق کی کمی، الفاظ کے بے محل استعمال اور سست بندشوں نے بے رنگی کو اور بڑھا دیا ہے — باقر مہدی کی غزلیں ان کی نظموں سے بھی کم رتبہ ہیں۔ ان کی غزلوں میں وہ حسنِ بیان نہ ہونے کے برابر ہے جو غزل کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔

محسن زیدی کی غزلوں کا مجموعہ "شہر دل" اسی سال شائع ہوا ہے۔ اس مجموعے کو پڑھ کر سب سے پہلا تاثر یہ پیدا ہوتا ہے کہ شاعر نے آج کل کی عام روایت کے برخلاف، زبان و بیان کو خواہ مخواہ مجروح کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی ہے۔ نہ غزلوں میں "کرتب و کرتوت" کی نمایش کی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کی غزلوں میں وہ گھلاوٹ اور دل میں سما جانے والی بات نہیں ہے، جو دل خوں شدہ کا پتا دیتی ہے۔ لیکن آداب تغزل کو ملحوظ رکھنے کے فیض سے متعدد اشعار میں حسن بیان کا رنگ ضرور جھلک اٹھا ہے۔ عشرت کرتپوری اور مخمور سعیدی کے مجموعوں میں بھی غزلیں ہیں، جن میں اچھے اشعار تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ مخمور کے یہاں چستی بند و شستی سخن کا رنگ نمایاں ہے۔ لیکن غزلوں میں جذبات نگاری کا رنگ مدھم ہے۔ وہ دراصل نظم کے شاعر ہیں۔ اور اس میں ان کے جوہر کھلتے ہیں۔ ان شعرا کی غزلیں پڑھ کر یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ محض خیالات کے شیش محل میں بند نہیں رہے ہیں۔ انھوں نے افکار و حوادث سے چشم پوشی نہیں کی ہے لیکن ان کی تبلیغ و تشہیر بھی نہیں کی ہے۔ یہ سلامت روی گرانمایگی مستقبل کی ضامن ہے۔ اگر صاحب کتاب بن جانے کے سرور نے بے خود نہ کیا (اور یہ حادثہ اکثر نئے شعرا کو پیش آتا ہے) اور ریاض میں مصروف رہے، تو یقیناً اس منزل پر پہنچ جائیں گے، جہاں پہنچ کر "خونے بہ جگر جمع کن و رنگ بروں آر" کا مفہوم خود بخود سمجھ میں آ جاتا ہے۔

حمید ناگپوری کا مجموعہ "حرف خاموش" اسی سال کامٹی سے شائع ہوا ہے۔ اس میں غزلیں زیادہ ہیں، جن میں سادگی بیان و سادگی فکر کا رنگ نمایاں ہے کہیں کہیں ضبط شوق کی جھلک بھی دکھائی دے جاتی ہے۔ ایسے اشعار میں دل کشی و تاثیر کا ہلکا سا رنگ نظر آ جاتا ہے مثلاً

ہم سمجھتے تھے غم دل کا مداوا ہوگی	وہ نظر پرسش حالات سے آگے نہ بڑھی
اس کی نگہ مہر کا اٹھنا ہی ستم تھا	بل پڑ گئے بے رحم زمانے کی جبیں پر
اپنی ہستی کا نہیں ہوش مگر حال یہ ہے	دل تری یاد سے غافل نہیں ہونے پاتا

رباعیات

غزل گوئی کے ساتھ ساتھ رباعی کی طرف بھی توجہ بڑھتی جا رہی ہے۔ رباعی ان شاعروں کی ذہنی تسکین کے کام بھی آتی ہے، جو گہرے اور نسبتہً بڑے خیال کو پیش کرنا چاہتے ہیں، اور نظم کے وسیع کینوس

پرگل کاری سے بچنا چاہتے ہیں۔ رباعی میں اس کی ہیئت اور مخصوص وزن کے لحاظ سے زور بیان کا رنگ زیادہ چمکتا ہے لیکن اسی نسبت سے یہ مشکل بھی ہے نظم کے بیشتر مجموعوں میں رباعیوں کی خاصی تعداد موجود ہے لیکن بہت کم رباعیاں قابل ذکر ہیں۔ اس عرصے میں شائع ہونے والے مجموعوں میں، تین مجموعے ایسے میرے پیش نظر ہیں جن میں صرف رباعیاں ہیں۔ ۱۔ رس ۲۔ شام و شفق ۳۔ گل رعنا۔

"رس" جناب جگر بریلوی کی رباعیوں کا مجموعہ ہے۔ جگر صاحب نہایت پختہ مشق اور قادر الکلام شاعر ہیں۔ ان کی رباعیوں پر بھی قدرت کلام کا رنگ چھایا ہوا ہے لیکن تقاضائے عمر یا بجھی ہوئی طبیعت، جو بھی سبب ہو، اس مجموعے کی رباعیاں بالعموم زور بیان اور جوش پنہاں سے خالی ہیں۔

"گل رعنا" رعنا جگی کا مجموعہ ہے۔ اس کا ایک قابل ذکر حصہ، حسن بیان و چستی بندش کے لحاظ سے خوب ہے خصوصاً جو رباعیاں "عورت" کے موضوع پر کہی گئی ہیں، وہ پاکیزگی خیال اور حسن بیان کی بنا پر خصوصی توجہ کی مستحق ہیں۔ ان میں عورت کو محض فشار آغوش کا مستحق نہیں بنایا ہے۔ نہ صرف رنگینی پیرہن تک بات کو محدود رکھا ہے، اس کی صنفی پاکیزگی، تقدس، غم گساری، اور عظمت کو دل کش انداز پیش کیا ہے۔ ایک رباعی سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

تسکین دہ ذوق تمنا تو ہے   آسودگی شوق تماشا تو ہے
انسان کے دل میں جو ازل سے ہے نہاں   اس درد محبت کا مداوا تو ہے

اندازہ ہوتا ہے کہ رعنا کے مزاج کو رباعی سے گہرا تعلق ہے۔ اور یہ بڑی بات ہے۔

"شام و شفق" ڈاکٹر سلام سندیلوی کی تلمیحی رباعیوں کا مجموعہ ہے۔ سلام صاحب نے رباعی پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔ اس مجموعے کی دو خصوصیتیں قابل ذکر ہیں، (۱) اس مجموعے کی ہر رباعی میں کسی تلمیح کو نظم کیا گیا ہے۔ اور حاشیے میں اس کی تشریح کی گئی ہے۔ پورا مجموعہ پاکٹ سائز کا تاریخچہ، تلمیحات بن کر رہ گیا ہے جس کو شاعری سے کہیں تو بہت دور کا علاقہ ہے اور اکثر وہ بھی معدوم ہے۔ سلام صاحب نے آغاز میں لکھا ہے: "مجھے اس کا احساس ہے کہ بہت سی رباعیاں خشک اور روکھی پھیکی ہیں اور محض واقعات کی کھتونی معلوم ہوتی ہیں تاہم اتنا عرض کروں گا کہ اس طرح کی رباعیاں اردو میں نہیں کہی گئی ہیں۔" سلام صاحب نے کچھ زیادہ احتیاط اور کسر نفسی سے کام لیا ہے

غفت یہ ہے کہ سب ہی رباعیاں خشک اور روکھی پھیکی" ہیں۔ ممکن ہے سلام صاحب نے ایک تاریخی ضرورت کو پورا کیا ہو لیکن شاعری سے اسے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ دوسری اس سے بھی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس مجموعے کی ۱۵۰ رباعیوں میں سے کم از کم ۴۸ رباعیاں ایسی ہیں، جن کا ایک مصرع یا دو مصرع ساقط الوزن ہیں۔ ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے !! - اس کا دیباچہ نیاز صاحب نے لکھا ہے۔

تراجم

دوسری زبانوں سے ترجمے کے سلسلے میں دو کتابیں قابلِ ذکر ہیں۔ (۱) شکنتلا۔ (۲) تجدید جنوں

ساغر نظامی نے کالی داس کی شہرۂ آفاق تصنیف "شکنتلا" کا منظوم ترجمہ پیش کیا ہے۔ اس ترجمے میں ساغر صاحب نے بہ قول خود "کہیں کہیں اپنی تخلیقی اہلیت سے کام لے کر ان کے (کالی داس کے) دائرۂ مطالب و مفاہیم میں لطیف اضافے کیے ہیں۔" بدقسمتی سے میں سنسکرت سے ناآشنائے محض ہوں اس لیے اس ترجمے اور ان لطیف اضافوں کے متعلق کوئی رائے ظاہر نہیں کر سکتا۔ اس منظوم ترجمے کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ اس میں جگہ جگہ اوزان کے تغیر سے کام لیا گیا ہے۔ کہیں کہیں ایک ہی مکالمے میں اس تغیر سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یہ ایک تجربہ ہے۔ تجربے کا فیصلہ ہمیشہ قبول عام سے ہوتا ہے اور اس کے لیے کچھ وقت کی ضرورت ہے۔

"تجدید جنوں" میں روس اور اس کے زیر اثر ممالک، پولینڈ، ہنگری وغیرہ کے کچھ شاعروں کی نظموں کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ ترجمہ مخمور سعیدی اور جلیس عابدی نے انگریزی سے کیا ہے۔ اصل میں رابرٹ کنکوئسٹ نے انگریزی میں ان ملکوں کے شعرا کی کچھ نظموں کا ترجمہ مع مقدمہ شائع کیا تھا۔ "تجدید جنوں" اسی کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ کتاب اس لحاظ سے قابلِ ذکر ہے کہ پہلی بار اردو میں کئی ملکوں کی ایسی نظموں کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے، جنھوں نے ایک دوسرے سے دور رہ کر، گرد و پیش چھاتے ہوئے حالات کی یکسانیت کی بنا پر، کچھ مشترک باتیں کہی ہیں۔ فکر کی گہرائی یا جذبات کی فراوانی کی تلاش ان نظموں میں عبث ہے۔ ان کا مقصد بھی یہ نہیں ہے۔ ان سب کا موضوع قریب قریب ایک سا ہے۔ اسی لیے یہ لطافت بیان اور تنوع جذبات یا تنوعِ فکر سے معرا ہیں۔ کچھ نظموں میں سپاٹ پن بے حد نمایاں ہے۔ البتہ بعض نظموں میں ایمائی انداز بیان کے بعض اچھے نمونے مل جاتے ہیں ۔۔۔ ایک بات کا اور واضح

احساس ہوتا ہے کہ جو ترجمے نظم آزاد کی صورت میں کیے گئے ہیں، ان میں حسن بیان نہ ہونے کے برابر ہے جبکہ پابند ترجموں میں سے بعض میں دو چار جگہ حسن بیان کی خوبیاں موجود ہیں۔

انتخابات

اچھے انتخابات کی اہمیت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ ان سے اس دور کے رجحانات اور رفتار ادب کا صحیح اندازہ ہوتا رہتا ہے۔ قدیم ادب کے اچھے انتخابات تیار کرنے کی تو بے حد ضرورت ہے۔ مولانا حسرت موہانی اور کیفی چڑیا کوٹی کے انتخابات اپنی نوعیت کے لحاظ سے آج بھی پُر اہمیت ہیں۔ آج کل خالص علمی شغف کے بجائے تجارتی ذہنیت غالب ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اگر کوئی کام کیا بھی جاتا ہے تو اس کا مقصد نفع حاصل کرنا ہوتا ہے — ان دو برسوں میں جو انتخابات شائع ہوئے ہیں ان میں سے مندرجۂ ذیل کتابیں قابلِ ذکر ہیں۔ ۱۔ اردو شاعری کا انتخاب ۲۔ گلِ صد رنگ ۳۔ دیوان میر، ۴۔ ارمغان نعت، ۵۔ غزلیں، ۶۔ انتخاب داغ۔

"اُردو شاعری کا انتخاب" ملک کے مقتدر ترین ادارے، ساہتیہ اکیڈمی نے شائع کیا ہے۔ مرتب اُردو کے مشہور محقق ڈاکٹر محی الدین قادری زور ہیں۔ مرتب کے الفاظ میں یہ اُردو شاعری کا نمائندہ اور مکمل انتخاب ہے۔ لیکن درحقیقت غلط نگاری، بدمذاقی، تحریف اور بدسلیقگی کا شاہکار ہے۔ دکنی اشعار کا آسان اُردو میں ترجمہ کر دیا گیا ہے اور آسان اُردو اشعار کو غالباً مزید آسان بنانے کے لیے بہ تبدیل الفاظ لکھا گیا ہے۔ بیش تر شاعروں کے حالات و سنین غلط ہیں، اور مختصر سی تنقیدی رائیں بچکانہ لطائف کا مجموعہ معلوم ہوتی ہیں۔ اردو کے بہت سے بہترین شاعر اس انجمن میں نہیں ہیں۔ نیز شاعری کی جملہ اصناف کی صحیح نمائندگی بھی نہیں ہوئی ہے۔ یہ کتاب مکتبہ جامعہ کے اہتمام سے شائع ہوئی ہے۔ اور مکتبہ کی روایت کے برخلاف اس کے ہر صفحے پر کتابت کی دو چار غلطیاں موجود ہیں، جنھوں نے رہی سہی کمی کو بھی پورا کر دیا ہے۔ البتہ اس طرح مرتب اور ناشر کی کارکردگی میں ایک حد تک توازن ضرور پیدا ہو گیا ہے۔ ساہتیہ اکیڈمی جیسے ادارے سے ایسی بے سروپا اور مجموعۂ اغلاط کتاب کا شائع ہونا افسوس ناک بھی ہے اور شرمناک بھی۔ یہ طالب علموں کی گمراہی کا سامان ہی نہیں، اُردو شاعری کو رسوا کرنے کی عالمانہ کوشش بھی ہے۔

دیوان میر، سردار جعفری کا کارنامہ ہے۔ انھوں نے دیوان غالب، کے بعد میر کے انتخاب کو مع فرہنگ
[illegible] دو ہندی دونوں رسم خط میں شائع کیا ہے۔ اس کا کاغذ نہایت دبیز رنگین اور بہت ہی اچھا
ہے۔ جلد بہت ہی خوب صورت ہے، بس اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ سب سے زیادہ افسوس کی بات
یہ ہے کہ اس کا ٹائپ بہت خراب ہے۔ جس میں جگہ جگہ حرفوں کے جوڑ علاحدہ علاحدہ نظر آتے ہیں۔ بعض
صفحوں پر سیاہی اس طرح پھوٹ گئی ہے۔ کہ پورا صفحہ کسی گناہ گار کے نامۂ اعمال کا ورق معلوم ہوتا ہے
اس ٹائپ کو دیکھ کر اُردو کے ٹائپ کی طرف سے کراہت سی پیدا ہو جاتی ہے جب کہ مقابل کے
صفحے پر ہندی کا ٹائپ نہایت پاکیزہ ہے۔ اگر یہ اُردو کی یا ٹائپ کی خدمت ہے تو پھر خدا حافظ ہے!
صحت متن کے لحاظ سے بھی پریشان کن صورت حال ہے۔ جگہ جگہ غلطیاں ملتی ہیں۔ اور بہت بری عبادت
صاحب نے بھی کلیات میر کراچی سے شائع کیا ہے، فرقت کاکوروی کا یہ جملہ اس پر مکمل تبصرے
کی حیثیت رکھتا ہے کہ" دو کتابیں ایک ساتھ مرتب کر دیں ایک کلیات میر، دوسرا اس کا غلط نامہ"
سردار جعفری نے اسی نسخہ عبادت کو بھی اپنے مآخذ میں گنایا ہے۔ اس کے بعد اگر متن غلط ہو، تو کیا جائے
تعجب ہے!! یہ محسوس ہوتا ہے کہ ساری توجہ کاغذ اور جلد پر مبذول کی گئی ہے۔ کیوں کہ اس کی قیمت
میں روپیہ رکھی ہے۔ یہ ادب دوستی نہیں ادب کے پردے میں تجارت ہے۔ یہ کہاں کی ادب دوستی
ہے کہ آپ ایک انتخاب کے بیس روپے وصول کر کے، غلط سلط اشعار اور بھونڈے ٹائپ کا مجموعہ
حوالے کر دیتے ہیں ـــ کچھ کتابیں اس لیے بھی ہوتی ہیں کہ بعض نمود و نمایش کے شوقین ان کو خرید کر
ڈرائنگ روم میں احتیاط سے رکھ دیتے ہیں کہ نگاہوں کا مرکز بنتی رہیں۔ یہ کتاب بھی اسی فہرست
میں شامل کی جاسکتی ہے۔ اور اس کا کوئی مصرف نہیں معلوم ہوتا۔

شارب ردولوی نے غزلوں کا ایک انتخاب "گل صد رنگ" کے نام سے مرتب کیا ہے۔ تقریباً
ساڑھے پانچ سو صفحات کا یہ انتخاب ہر گل بنیے کی دکان کا منظر پیش کرتا ہے۔ جس میں نہ کوئی اصول
ہے نہ وجہ انتخاب سمجھ میں آتی ہے۔ ۱۳۶ غزل گو شعرا کے جواہر پارے اس میں شامل ہیں۔ مرتب
نے وجہ انتخاب یہ بتائی ہے کہ اس سے شاعری کے موجودہ رنگ و آہنگ کا کچھ اندازہ ہوگا لیکن
افسوس ہے کہ یہ اندازہ مطلق نہیں ہوتا۔ محض کتاب کو زیادہ سے زیادہ ضخیم بنانے کی کوشش کی

گئی ہے۔ ممکن ہے تجارتی نقطۂ نظر سے یہ بات مناسب ہو، لیکن مرتب کے دعوے کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہے ــــ "ارمغان نعت" نعتیہ کلام کا انتخاب ہے، جس کو والی آسی اور ساجد صدیقی نے مرتب کیا ہے۔ مرتبین نے محنت کی ہے۔ اور بہت سے فارسی و اردو شعرا کا کلام جمع کر دیا ہے۔ لیکن کسی اصول کو پیش نظر نہیں رکھا ہے۔ نعتیہ قصائد اور مثنویات کے شعر اس طرح درج ہیں کہ غزل کے اشعار معلوم ہوتے ہیں۔ طویل قصائد میں سے ۸، ۱۰ شعر منتخب کیے گئے جس سے ان شعرا کی نمایندگی نہیں ہوتی ہے۔ کسی جگہ کوئی حوالہ بھی نہیں دیا گیا ہے۔ حالاں کہ یہ بہت ضروری بات ہے۔ مرتب حضرات اگر اس پر نظر ثانی کر کے، اس کی ان خامیوں کو دور کر دیں، تو اپنی نوعیت کا یہ اچھا انتخاب ہوگا۔ بعض نہایت غیر معروف اور غیر اہم شعرا کو معلوم نہیں کیوں شامل کیا گیا ہے؟ کتاب کو اگر سلیقے سے مرتب کرنا ہو، تو دوست نوازی یا مروت سے کچھ دیر کے لیے قطع تعلق کرنا ضروری ہوتا ہے۔ دوسری اشاعت میں غیر اہم شعرا کا کلام نکال کر اُن کے بجائے معروف شعرا کا کلام بڑھا دیا جائے اس حد تک کہ اس کی صحیح نمایندگی ہو، تو بہتر ہے۔

"غزلیں" شاہد علی خاں کا مرتب کیا ہوا، غزلوں کا انتخاب ہے۔ جو اس سال پانچویں بار شائع ہوا ہے۔ یہ انتخاب اچھا ہے، لیکن ایک عجیب بات یہ ہے کہ پچھلے اڈیشن کی بعض اچھی غزلیں اس میں نہیں ہیں۔ اس طرح یہ نیا اڈیشن مرتب کی نظر ثانی کا محتاج ہو گیا ہے۔ شاہد صاحب اگر اس میں قدیم و جدید شعرا کی کچھ نمایندہ غزلیں اور شامل کر دیں، اور ایک مفصل مقدمہ لکھ دیں، تو اس انتخاب کی خوبی اور افادیت میں اور اضافہ ہو جائے۔ مقدمے کی کمی بری طرح محسوس ہوتی ہے۔

"انتخاب داغ" ڈاکٹر عقیل کا مرتب کیا ہوا ہے جسے ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد نے شائع کیا ہے۔ اس سے پہلے داغ کے دو قابل ذکر انتخاب شائع ہو چکے ہیں۔ ایک مولانا احسن مارہروی مرحوم کا دوسرا مولانا حامد حسن قادری کا مرتب کیا ہوا۔ جس کا نام "کمال داغ" ہے۔ مرتب نے ۳۰ صفحے کا مقدمہ بھی لکھا ہے۔ انتخاب کا تعلق ذاتی پسند و ناپسند سے بھی ہوتا ہے۔ اس لیے اس میں اختلاف کی گنجایش کچھ نہ کچھ تو نکل ہی سکتی ہے۔ لیکن مجموعی طور سے یہ اچھا خاصا انتخاب ہے۔ ایک اچھی بات یہ ہے کہ اس میں اغلاط کتابت بہت کم ہیں۔ اور یہ مسرت آمیز تعجب کی بات ہے۔ البتہ مقدمہ کچھ ناتمام سا

معلوم ہوتا ہے۔ داغ کی شاعری پر اچھے زاویے سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ پھر بھی تمہید، ذاتی حالات اور رنگ سخن کے ذیل میں کچھ اور مزید باتیں بھی کہی جا سکتی تھیں۔ آج کل مذاق تحقیق بڑھ رہا ہے۔ اس لیے کسی ادیب و شاعر کے حالات پڑھتے وقت اصول تحقیق اور معیار تحقیق کا خیال آجانا لازمی سا ہے۔ مقدمہ میں اس کی بھی کمی محسوس ہوتی ہے۔ پچھلے دو اچھے انتخابات کی موجودگی میں حسن ترتیب اور مقدمے کی جامعیت یہی دو چیزیں کسی نئے انتخاب کے جواز کی وجہ بن سکتی ہیں۔

تحقیقی اڈیشن

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے دو قدیم مثنویوں کو مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ (۱) مثنوی سراپا سوز مصنفہ قاضی محمد صادق خاں اختر (۲) طوطی نامہ مصنفہ جعفر علی حسرت بقول تمہید دونوں مثنویاں بجائے خود کوئی اہمیت نہیں رکھتی ہیں۔ ان کو شائع کر کے ہاشمی صاحب نے اچھا کام کیا، لیکن زیادہ اچھا ہوتا کہ وہ حسرت کی اس معمولی سی مثنوی کے بجائے اس کا دیوان شائع کر دیتے۔ ہمارے یہاں قدیم دواوین کو مرتب کرنے کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ کیا یہ افسوس کی بات نہیں کہ ابھی تک میر، سودا، سوز، درد، قائم مصحفی، ذوق اور دوسرے قدیم شعراء کے مکمل اور قابل اعتماد مجموعے ہمارے پاس نہیں۔ عالم یہ ہے کہ کلیات سودا کے نول کشوری اڈیشن میں نہ معلوم کتنی غزلیں میر سوز کی ہیں۔ یہی صورت اور دواوین کی ہے۔ اس طرف خصوصیت کے ساتھ توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس عرصے میں میرے علم کے مطابق اور کوئی قابلِ ذکر کتاب شائع نہیں ہوئی ہے۔

حسن طباعت

ادھر پندرہ سال کے عرصے میں، کتابوں کو سلیقے سے پیش کرنے کا رجحان بڑھا ہے۔ ان دو برسوں میں بھی کتابوں کو اہتمام کے ساتھ شائع کرنے کی طرف خصوصی توجہ کی گئی ہے۔ کاغذ، طباعت، گرد پوش غرض آرائش بیرون در کے سارے انداز جلوہ فرما ملتے ہیں۔ اور بعض کتابیں تو ایسی ہیں کہ ان کے حسن ظاہر کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔ ایسی کتابوں میں شبنم شبنم، شکستلا، تلخیاں، سخن مختصر، رگ جاں، تجدید جنوں، دیوان میر مرتبہ سردار جعفری قابلِ ذکر ہیں۔ ان سب میں حسنِ طباعت کے لحاظ سے شبنم شبنم کو درجۂ فضیلت حاصل ہے۔ اور نفیس ترین کاغذ کے لحاظ سے "تلخیاں" کو۔ لیتھو میں چھپنے والی کتابوں میں بہ لحاظ حسنِ طباعت

"شکنتلا" سب سے اچھی کتاب ہے۔

ایک کمی کا احساس بری طرح ہوتا ہے۔ عام طور سے اچھے کاغذ، اچھی طباعت اور بہت اچھے گرد پوش کا تو خیال رکھا جاتا ہے، لیکن اچھے ٹائپ یا حسن کتابت کی طرف کم توجہ کی جاتی ہے۔ کتابت ایک فن ہے، جو کاروبار کی حد تک تو اب بھی جاری ہے، لیکن بہ لحاظ فن رو بہ زوال ہے۔ اس کے مختلف اسباب ہیں۔ من جملہ ان کے ایک سبب ناشرین یا مصنفین کی کم توجہی بھی ہے۔ بلاک اور آفسٹ نے چمک دمک میں اضافہ کر دیا ہے۔ کاغذ کی اچھائی بھی اس میں چار چاند لگا دیتی ہے۔ لیکن جائزہ لیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ کتابت اتنی اچھی نہیں ہے۔ پہلے کتابت اچھی ہوتی تھی، طباعت خراب تھی، اب کاغذ و طباعت خوب ہے تو کتابت اچھی نہیں۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے مثلاً شبنم شبنم کو دیکھ کر "عروسِ جمیل" کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، لیکن بہ لحاظ کتابت یہ بھی عام کتابوں کی ہم پلہ ہے۔

پاکٹ بک سیریز

اسی زمانے میں پاکٹ سائز کتابوں کا سلسلہ بھی شروع ہوا ہے۔ ہر کتاب کی قیمت ایک روپیہ ہے۔ اس میں بیش تر نظم کی کتابیں چھپی ہیں۔ دیکھتے دیکھتے اس سلسلے نے بہت مقبولیت حاصل کر لی ہے۔ اس وقفۂ مختصر میں اس کی کئی لاکھ جلدیں بک چکی ہیں۔ ذیل میں صرف چند کتابوں کی تعداد اشاعت درج کی جاتی ہے، جن سے اس سلسلے کی مقبولیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

دیوانِ غالب، ۱۳ ہزار؛ انتخابِ ظفر، ۱۲ ہزار؛ انتخابِ داغ، ۸ ہزار؛ بانگِ درا، ۵ ہزار؛ دیوانِ ذوق، ۵ ہزار؛ رومانی شاعری کا انتخاب، ۷ ہزار؛ ساقی نامے، ۳ ہزار؛ ارمغانِ حجاز، ۳ ہزار؛ شاہنامۂ اسلام، ۸ ہزار (یہ اعداد و شمار جناب انور کمال حسینی کے فراہم کیے ہوئے ہیں۔ میں موصوف کا مشکور ہوں۔)

اندازہ ہے کہ اب تک ایسی کتابوں کی کئی لاکھ جلدیں بک چکی ہیں — ہمارے یہاں بعض ضروری کاموں کی طرف بہت کم توجہ کی جاتی ہے، یا بہت دیر میں۔ اس وقت تک کسی خالص ادبی اور معیاری ادارے نے اس کام میں ہاتھ نہیں لگایا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ صحت متن تباہ ہو کر رہ گئی ہے۔

نجانات بھی اچھے نہیں ہیں۔ اسی بنا پر اب پہلے کی بہ نسبت ان کتابوں کی بکری کچھ کم ہو گئی ہے اس سلسلے کی بدولت اُردو کتابوں کی اشاعت اور مقبولیت میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ آج ہم کو ہر ایسی تحریک کی طرف ضرور توجہ کرنا چاہیے، جو اُردو کی اشاعت اور مقبولیت میں معاون ہو۔ اب بھی اگر مکتبۂ جامعہ یا اسی سطح کا کوئی ادارہ، اس طرف توجہ کرے اور اپنے روایتی اہتمام کے ساتھ اس سلسلے کو جاری کرے تو یہ بات ہر لحاظ سے ادب و زبان کے لیے مفید ہو گی۔ جو لوگ آج بھی قیمتی دیوان خریدتے ہیں وہ کل بھی خریدیں گے۔ البتہ جو لوگ چھ روپے یا دس روپے خرچ کر کے کتاب نہیں خرید سکتے ہیں، اور پڑھنا چاہتے ہیں، وہ اس سے مستفیض ہوں گے۔

۲۰، ۲۲ ماہ کی مدت میں شائع ہونے والے مجموعوں کا یہ سرسری سا جائزہ ہے۔ بعض کتابیں اس تبصرے میں شامل نہ ہو سکیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بر وقت دستیاب نہیں ہو سکیں۔ ان میں منور لکھنوی کی غزلوں کا مجموعہ "نوائے کفر" تلوک چند محروم کی غزلوں کا مجموعہ "شعلۂ نوا" مانی جائسی کے قصائد کا مجموعہ "وادیٔ ایمن" اور اختر الایمان کی نظموں کا مجموعہ "یادیں" قابلِ ذکر ہیں۔ یہ مضمون حوالۂ کاتب ہو چکا تھا، تب اختر الایمان کا یہ مجموعہ سامنے آیا۔ افسوس رہا کہ ایک واقعی اچھی کتاب شاملِ تبصرہ نہیں ہو سکی۔ ایک بات اور عرض کرنا ہے کہ ہمارے باشعور ناقدین اگر معمولی معمولی مجموعوں پر مبالغہ آمیز دیباچے لکھنے سے پرہیز کریں اور کچھ دیر کے لیے جانب داری و مصلحت پسندی سے بے نیاز ہو جایا کریں، تو صورتِ حال بہتر ہو سکتی ہے۔ ہمارے کچھ ناقد بہت سے شعرا کو بے راہ رو بنانے یا ضروری امور کی طرف سے تغافل برتنے میں مدد دینے کے ضرور مجرم ہیں، یہ سلسلہ جس قدر جلد ختم ہو جائے اچھا ہے۔

وفیات سنہ ۱۹۶۱ء

جناب خواجہ حافظ نبی احمد

۹ر مارچ : مولوی محمد ظفر صاحب ایم اے، ایل ایل۔ بی وکیل گوڑ گاؤں کا سرگودھا (پاکستان) میں انتقال ہوا۔ آپ نے کئی مذہبی کتابیں لکھی ہیں۔ کئی رسالوں کے مستقل مضمون نگار تھے۔

۱۴ر مارچ : ڈاکٹر خان بہادر حاجی محمد حبیب اللہ خاں ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر جنوری ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ سرسید کے خاص صحبت یافتہ اور ان کا فیض اٹھائے ہوئے تھے۔ ان کا حافظہ بلا کا تھا ۱۸۸۶ء سے انھوں نے روزنامچہ لکھنے کا جو اہتمام کیا تھا اسے مرتے دم تک ترک نہیں کیا۔ اگر یہ چھپ گیا تو تحریک علی گڑھ سے متعلق بہت سی عجیب و غریب معلومات سامنے آئیں گی۔ آپ نے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی سوانح عمری حیات آفتاب کے نام سے لکھی تھی۔ ۱۴ر مارچ کو انتقال کیا۔

۲۹ر مارچ : سید احمد حسین امجد حیدر آبادی۔ ۷ر فروری ۱۸۸۶ء کو حیدر آباد میں پیدا ہوئے اپنے دور کے ممتاز شاعر تھے۔ رباعی گوئی میں اس زمانہ میں ان کا کوئی جواب نہیں ہے۔ ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں

۱۔ ریاض امجد دو جلدیں ۲۔ رباعیات امجد۔ ۳۔ حج امجد ۴۔ جمال امجد ۵۔ پیام امجد ۶۔ گلستان امجد۔

۲۹ر مارچ ۱۹۶۱ء کی رات میں ساڑھے دس بجے انتقال کیا۔

۲۷ر مئی : خواجہ دل محمد مشہور ریاضی داں تھے۔ اور اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل رہ چکے ہیں تقریباً ۷۷ سال کی عمر پائی۔ ریاضی پر ان کی ۲-۳ کتابیں درسی کتب میں شامل تھیں۔

۲۷ر مئی : سید تمکین کاظمی۔ حیدر آباد کے ممتاز ادیب کا حرکت قلب بند ہوجانے کی وجہ سے انتقال ہوا۔ آپ ادارۂ ادبیات اردو کے لئے تذکرہ نوادرانِ دکن لکھ رہے تھے انھیں مرکزی وزارت تعلیم کی طرف سے سو روپے کا علمی وظیفہ ملتا تھا۔ آپ داغ کے شاگرد تھے۔ تقریباً ۶۰ سال کی عمر پائی۔ حکومت ہند نے ان کی بیوہ کے لئے بھی سو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کردیا ہے۔ آپ ۲۵ر نومبر ۱۹۰۲ء کو حیدر آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے تقریباً ایک درجن کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں سے

بعض کے نام یہ ہیں۔ ۱۔ تذکرہ ریختی ۲۔ فریاد داغ ۳۔ مرزا داغ ۴۔ اسکر وائلڈ کی کتاب ارنسٹ کا ترجمہ۔

جون : صدیق حسن مولانا شرر کے لڑکے تھے۔ آپ کافی مدت سے بیمار تھے۔ آپ عرصے تک گلگداز کے اڈیٹر رہے۔ اس کے بعد انجمن ترقی اُردو سے وابستہ ہوگئے اور کئی سال وہاں پر رہے حکومت نے ان کا ایک سو روپے وظیفہ بھی مقرر کر دیا تھا۔ آپ اپنے والد کی سوانح عمری لکھ رہے تھے۔

۳۰ رجون : پروفیسر سید نواب علی ایک عرصہ سے بیمار تھے۔ آپ نے کئی کتابیں لکھی ہیں لیکن ان میں سے دو کتابیں نہایت ہی قابل قدر ہیں۔ ایک سیرۃ الرسول اور دوسری تاریخ صحف سماوی آپ مولانا محمد علی اور علامہ شبلی کے دوستوں میں تھے۔ ان کا اصل وطن نیوتنی ضلع اناؤ تھا۔ بڑودہ اور گجرات میں سرکاری ملازم رہے۔ ملازمت سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد ریاست جوناگڈھ میں وزیر تعلیم ہوگئے تھے اس سے سبکدوش ہونے کے بعد اپنے وطن لوٹ آئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی چلے گئے۔ آپ بمبئی یونیورسٹی کی سینٹ کے ممبر بھی رہ چکے ہیں اور عربی فارسی کے ممتحن بھی۔ تقریباً ۸۴ سال کی عمر پائی۔

۱۴ جولائی : خان بہادر ظفر حسین خاں انسپکٹر آف اسکولز کے ممتاز عہدہ پر فائز رہ چکے ہیں۔ ریٹائرڈ ہونے کے بعد کچھ عرصہ تک شیعہ کالج لکھنؤ کے پرنسپل رہے۔ ان کا خاص موضوع فلسفہ تھا اس موضوع پر ان کی کئی تصانیف ہیں۔ ان کی کتاب آل و نسبت پر ساہتیہ اکاڈیمی نے پانچ ہزار روپے کا انعام دیا تھا آپ علامہ شبلی کے شاگرد تھے آپ کا لکھنؤ میں انتقال ہوا۔

۱۷ اگست : مولوی عبدالحق بابائے اردو ۱۸۷۰ء میں ہاپور ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئے اور ۱۶ اگست ۱۹۶۱ء کو کراچی میں وفات پائی۔ (رسالہ جامعہ بابت ماہ ستمبر ۱۹۶۱ء میں مفصل مضمون شائع ہو چکا ہے)

۲۱ اگست : مولوی سید عطاء اللہ شاہ بخاری شعلہ بار مقرر خوش گو واعظ، کٹر نیشنلسٹ اور راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ علم و مذہب و ملک و ملت کی بڑی خدمت کی۔ ۲۱ اگست کو ملتان میں انتقال کیا۔

۵ ۲ ستمبر : ہادی مچھلی شہری مشہور شاعر عرصہ سے دمہ کے مریض تھے۔ آپ کی طبیعت غزل گوئی سے زیادہ مناسبت رکھتی تھی۔ آپ جگر مراد آبادی کے قدیم دوستوں میں تھے۔ آپ کا ایک مجموعہ کلام نوائے دل کے نام سے ۱۹۴۴ء میں الہ آباد سے شائع ہوا تھا۔ آپ کے والد عبدالرزاق صاحب شاکر، مرزا غالب کے شاگرد تھے۔ چنانچہ ان کے نام سے بہت سے خطوط مکاتیب غالب میں موجود ہیں۔ آپ نے ۸۰ سال کی عمر پائی۔

۲۶ ستمبر : ابوالعلاء چشتی (حاجی لق لق) آپ پاکستان کے پرانے صحافی تھے صحافت میں مولانا ظفر علی خاں کے شاگرد تھے ان کی مزاحیہ نظمیں بہت مقبول تھیں۔ ان کے فکاہات دلچسپی سے پڑھے جاتے تھے آپ طویل عرصہ سے بیمار تھے میو ہسپتال لاہور میں انتقال ہوا۔

(باقی صفحہ ۱۰۲ پر ملاحظہ فرمایئے)

تنقید وتبصرہ

۶۱ء کی مطبوعات پر ایک نظر

علمی ومذہبی کتابیں

ہندوستان اور پاکستان میں ایسے ادارے صرف چند ہیں، جو سنجیدہ اور معیاری علمی ومذہبی کتابیں شائع کرتے ہیں۔ پاکستان کے اداروں کے متعلق ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب نے تفصیل سے لکھا ہے۔ ہندوستان میں ایسی کتابیں زیادہ تر دار المصنفین سے شائع ہوتی ہیں۔ خط لکھنے کے باوجود ہمیں علوم نہ ہو سکا کہ زیر تبصرہ سال میں دار المصنفین سے کوئی کتاب شائع ہوئی ہے۔ البتہ ندوۃ المصنفین سے آخر دسمبر اور شروع جنوری میں کچھ کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ چند کتابیں پاکستان سے بھی موصول ہوئی ہیں۔ ان کتابوں کا مختصراً تعارف ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

علمائے سلف و نابینا علماء از مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم۔

علمائے سلف اور نابینا علماء نواب صدر یار جنگ مرحوم کی دو مشہور ومقبول کتابوں کو مزید تشریح وتوضیح کے ساتھ بڑے سائز پر شائع کیا گیا ہے۔ اس میں مصنف کے بارے میں مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کا ایک طویل مضمون اور مفتی محمد انتظام اللہ شہابی صاحب کا ایک مبسوط مقدمہ بھی شامل ہے۔ اس نئی شکل میں کتاب پہلے سے کہیں زیادہ مفید ہوگئی ہے۔ قیمت نو روپے

شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ اور ان کی تعلیمات از اعجاز الحق قدوسی

شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ سلسلہ چشتیہ صابریہ کے نامور صوفی گزرے ہیں۔ اس کتاب میں حضرت شیخ کے حالات زندگی، ان کی تعلیمات، سلسلہ چشتیہ صابریہ کی مختصر تاریخ اور تصوف کے اہم مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ اس موضوع پر یہ کتاب بہت مفید اور قابل مطالعہ ہے۔ قیمت نو روپے۔

اوپر کی دونوں کتابیں "اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی" سے شائع ہوئی ہیں۔

تفسیر مظہری (جلد اوّل) تالیف: قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی مجددی پانی پتی مرحوم۔
ترجمہ: مولانا سید عبدالدائم الجلالی۔
پارۂ الٓمٓ اور سیقول کی تفسیر ہے۔ قدیم طرز کی تفسیر ہے۔ بڑے سائز پر ۵۶۸ صفحات پر مشتمل ہے۔
قیمت غیر مجلّد ساڑھے دس روپے۔ مجلد ساڑھے بارہ روپے۔

قرنِ اول کا ایک مدبر۔ از خورشید احمد فارق
اس کتاب میں پہلی صدی ہجری کے ایک مدبر مختار بن ابی عُبید (وفات ۶۷ھ) کے کارنامے بیان کئے گئے ہیں۔ اس مدبر کے بارے میں مؤلف نے لکھا ہے کہ "مختار نے اپنے دست و بازو سے یہ اقتدار حاصل کیا اس کے حصول میں اس کی فکر و اجتہاد نے تو اس کا ساتھ دیا ہی، لیکن جس صفت نے سب سے زیادہ اس کی یاوری کی وہ تھی اس کی غیر معمولی تنظیمی صلاحیت، مذہبی بہروپ اور اہل بیت (خاندان حضرت علی) کی ہوا خواہی"۔ قیمت غیر مجلّد ڈھائی روپے۔ مجلد تین روپے۔

عرب دُنیا از مولانا محی الدین الوائی۔
اس کتاب میں خلیج فارس سے مراکش تک پھیلے ہوئے تمام عرب ملکوں کے جغرافیائی، معاشرتی اور عام حالات سے بحث کی گئی ہے۔ جدید عرب ممالک کے متعلق شاید اردو میں یہ پہلی کتاب ہے قیمت مجلد ۵/-

اسلامی کتب خانے از الحاج محمد زبیر (اسسٹنٹ لائبریرین مسلم یونیورسٹی)
اس کتاب میں قرون وسطیٰ کے اسلامی کتب خانوں کے حالات درج ہیں۔ مولف نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ "یہ دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں ان سارے کتب خانوں کا ذکر موجود ہے جو قرون وسطیٰ کی وسیع عریض اسلامی سلطنتوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں بارہ برس کے کتب خانوں کی ایک واضح تصویر پیش کی گئی ہے اور مسلمانوں کے علمی شغف اور ان کی تعلیمی و تصنیفی سرگرمیوں کی ایک جھلک دکھلائی گئی ہے"۔ قیمت مجلد پانچ روپے۔

تاریخ ہند پر نئی روشنی : مترجم : خورشید احمد فارق
یہ عربی کی ایک کتاب "مسالک الابصار فی ممالک الامصار" کا ترجمہ ہے اصل کتاب چونکہ قلمی ہے اس لئے ترجمے کے ساتھ اسے بھی شائع کر دیا گیا ہے۔ کتاب کے بارے میں مترجم نے لکھا ہے کہ "اس میں

ایسی نادر اور تاریخی، اجتماعی اور اقتصادی معلومات ہیں جن سے خود ہندوستان میں لکھی تاریخوں کا دامن خالی ہے۔
اس کے علاوہ اس باب میں تغلق شاہ کی آئین جہاں داری اور پبلک سیرت کی ایک ایسی تصویر بھی نظر آتی ہے
جو اس تصویر سے مختلف ہے، جو بعض ہم عصر مورخوں نے ان سے ذاتی ناراضگی یا فقہی و مسلکی اختلافات کی بنا
پر پیش کی ہے..... ایسی دلچسپ معلومات ہیں جو عینی شاہدوں یا موجودہ وقت میں نایاب کتابوں سے لی گئی
ہیں اور جن سے قرون وسطیٰ کے ہندی رسم و رواج، کلچر و عقائد کے چہرہ کے بہت سے خط و خال واضح
ہو جاتے ہیں۔" قیمت مجلد چار روپے۔

اوپر کی پانچوں کتابیں ندوۃ المصنفین، اردو بازار، جامع مسجد دہلی ۶ سے شائع ہوئی ہیں۔

انیس زندگی از محمد انیس الرحمن (ایڈوکیٹ)

اس کتاب میں عورت کے مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ لفظ "عورت" میں مصنف کے نزدیک
نکتہ ہائے لطیف پوشیدہ ہیں یعنی ع سے عفت، و سے وفاداری، ر سے رفعت، ت سے تمکنت
اس کتاب کے مباحث کا خلاصہ یہ ہے کہ (۱) شادی کو لازمی قرار دیا جائے (۲) مردوں کو ایک زوجگی
کے لئے مجبور نہ کیا جائے۔ فاضل مصنف کا کہنا ہے کہ انھوں نے "کوشش کی ہے کہ جنسی اور نفسیاتی پہلو
پر جذباتی نہیں بلکہ حکیمانہ نظر پڑ سکے"۔ قیمت پونے تین روپے۔ ناشر: دانا اکیڈمی۔ تنسکر بلڈنگ
اے، ایم ۲۔ فریر روڈ۔ کراچی ۱ (پاکستان)

خط و خطاطی از شیخ ممتاز حسین جون پوری و محمد ایوب قادری

یہ مختصر کتاب دراصل دو مضامین کا مجموعہ ہے۔ پہلا مضمون شیخ ممتاز حسین جونپوری صاحب کا
ہے جس میں خط اور فن خطاطی پر تاریخی نظر ڈالی گئی ہے اور مختلف خطوں کی خصوصیات اور ان کی فنی نوعیت
سے بحث کی گئی ہے۔ دوسرا مضمون قادری صاحب کا ہے جس میں خطاطی کے ایک نادر ذخیرے کا تعارف کرایا
گیا ہے۔ "فن خطاطی کا یہ نادر ذخیرہ ۱۳۴ قطعات پر مشتمل ہے، جس میں بعض مشہور و معروف خطاط مثلاً
پنجہ کش، میر جلال الدین، عباد اللہ بیگ اور تنسکر ناتھ دہلوی وغیرہ کے قطعات نیز عبدالرشید
اور میر علی کے قطعات کی نقول شامل ہیں"۔ قیمت مجلد ڈیڑھ روپے۔ ناشر: آل پاکستان ایجوکیشنل
کانفرنس۔ سعیدہ منزل۔ ناظم آباد۔ بی روڈ۔ کراچی۔

ڈھاکہ — میرے خوابوں کا شہر از عارف حجازی

اس مختصر کتاب میں ڈھاکہ کی ابتدا سے آج تک کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ آخری باب کا عنوان ہے، "میرے خوابوں کا شہر" جس میں موجودہ حکومت کے منصوبوں کی وضاحت کی گئی ہے اور درخشاں مستقبل کی توقع ظاہر کی گئی ہے۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ ملنے کا پتہ: مشتاق بک ڈپو۔ نزد اردو کالج۔ شلٹن روڈ کراچی ۱۵

انتظام کتب خانہ از شیخ محبوب قریشی

یہ مختصر کتاب کتب خانوں کی تنظیم کے فن پر لکھی گئی ہے۔ مصنف کا بیان ہے کہ "میں نے اس کتاب میں کوشش کی ہے کہ مختلف موضوعات پر صرف انھیں باتوں کو عام فہم انداز میں پیش کر دوں جو کتب خانوں کے انتظام اور کتابوں کی درجہ بندی کے سلسلہ میں علمی اہمیت رکھتی ہیں۔ غیر ضروری تفصیلات اور نظری باتوں کو میں نے نظر انداز کر دیا ہے۔" ۱۹۵۳ء میں اس کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا تھا، اب ۱۹۶۱ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن جدید اضافوں اور نئی معلومات کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ قیمت غیر مجلد ڈیڑھ روپے۔ ناشر: محبوبیہ کارخانہ جلد سازی۔ حیدرآباد کالونی ۱/۴، کراچی ۵۔

تعلیمی کتابیں

شاید تعلیم ہی ایک ایسا بدقسمت موضوع ہے، جس پر اردو میں سب سے کم کتابیں ہیں۔ مکتبہ جامعہ اور بعض دوسرے اداروں نے چند کتابیں شائع کی ہیں، مگر ہندوستان میں کوئی ایسا مکتبہ نہیں ہے، جو اس موضوع کی طرف خصوصی توجہ کرتا ہو۔ سرسید مرحوم نے ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا، جس کے مقاصد میں تعلیم پر کتابیں لکھوانا اور شائع کرنا بھی تھا، مگر اب وہ ختم ہو گیا ہے۔ پاکستان میں اسی نام سے ایک ادارہ ۱۹۵۱ء میں قائم ہوا ہے اور کہا گیا ہے کہ سرسید کے اس ادارہ کا احیاء کیا گیا ہے۔ اس نے تعلیم پر متعدد کتابیں شائع کی ہیں، مگر اس نے ۱۹۶۱ء کی جو مطبوعات تبصرہ کے لئے ہمیں بھیجی ہیں ان میں تعلیم پر کوئی کتاب نہیں ہے۔ ہمارے علم کے مطابق ۱۹۶۱ء میں صرف مکتبہ جامعہ نے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی مقبول ترین کتاب تعلیمی خطبات کا [illegible] جدید اضافے کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا تھا، اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ یہ پانچواں ایڈیشن شائع ہوا ہے، یہ خطبے تعلیمی لحاظ سے

تو اچھے اور قابلِ مطالعہ ہیں ہی، ادبی لحاظ سے بھی اپنی مثال آپ ہیں اور بقول مولانا عبدالماجد دریابادی "بڑی بات یہ ہے کہ ان میں مذہبی رنگ بھی اچھا خاصہ جا بجا ملتا ہے۔" قیمت تین روپے ۵۰ نئے پیسے

سیاسی و معاشی کتابیں

سیاسیات اور معاشیات پر بھی معیاری کتابیں بہت کم شائع ہوئی ہیں۔ ان دونوں موضوعات پر ہمیں صرف دو کتابیں تبصرہ کے لئے ملی ہیں۔

ہندوستان کا دستور اور اس کی مختصر شرح   از پروفیسر ہارون خاں شروانی

یہ کتاب ہندوستان کے دستور کا ترجمہ ہے اور جہاں جہاں مترجم نے ضرورت محسوس کی ہے وضاحت کردی ہے۔ فاضل مترجم تاریخ اور سیاسیات کے پروفیسر رہ چکے ہیں، ان دونوں موضوعات پر اردو اور انگریزی میں متعدد کتابیں لکھی اور ترجمے کئے ہیں۔ حکومتِ ہند نے دستور ہند کا ترجمہ کرنے کے لئے ایک چھوٹی سی کمیٹی بنائی تھی، موصوف بھی اس کے ایک ممبر تھے۔ اس لئے ان کا ترجمہ اور ان کے تشریحی نوٹ ظاہر ہے، دونوں معتبر اور مستند ہوں گے۔ حیدرآباد کے ترجمے عام طور پر مشکل اور اصطلاحوں کے ترجمے غیر مانوس ہوتے ہیں۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس ترجمے میں عام فہم زبان استعمال کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اصطلاحوں کے معاملے میں ہندی کی اصطلاحوں سے مدد لی گئی ہے۔ لیکن کہیں کہیں الٹا بھی ہوگیا ہے۔ مثلاً (ص۱۰) بعض اصطلاحوں میں ہندی فارسی کی قلم لگانے کی کوشش کی گئی ہے، مثلاً اپر ہاؤس کا ترجمہ اُپری ایوان کیا گیا ہے، حالاں کہ یا تو اردو کی مروّج اصطلاح ایوانِ اعلیٰ کرنا تھا یا ہندی کی اصطلاح جو اب کافی رواج پا چکی ہے، راجیہ سبھا کرنا چاہیئے تھا۔ بعض اصطلاحات کے وہ ترجمے کئے گئے ہیں، جو کسی اور کے کئے جاتے ہیں۔ مثلاً اس کتاب میں پروسیجر کا ترجمہ ضابطہ کیا گیا ہے، حالانکہ "ضابطہ" اسٹیچوٹ کا کیا جاتا ہے۔ اس سے ممیز کرنے کے لئے "پروسیجر" کا ترجمہ طریق کار کیا جا سکتا تھا۔ بعض انگریزی کی اصطلاحیں اردو میں اس کثرت سے استعمال ہونے لگی ہیں کہ اب ان کے ترجمے کی ضرورت نہیں ہے، مثلاً چیئرمین کا ترجمہ میرِ مجلس یا ٹرسٹی کا ترجمہ امانت دار کیا گیا ہے۔ بہرنوع اس قسم کے اختلافات تو اس وقت تک موجود رہیں گے، جب تک جدید

دیبوں کی ایک جماعت تمام اہم اصطلاحات کا ترجمہ کردے۔ کتاب بہرحال مفید اور قابل مطالعہ ہے۔
قیمت مجلد دس روپے۔ "تلگو اردو اکیڈمی برائے سائنس و تاریخ حیدرآباد" نے اسے شائع کیا ہے۔

پاکستان کا معاشی پس منظر از سیدہ انیس فاطمہ بریلوی

اس کتاب کے پیش لفظ میں ڈاکٹر سید ظہیرالدین احمد نے مصنفہ کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے۔
سیدہ انیس فاطمہ بریلوی عرفِ عام میں ماہر معاشیات نہیں ہیں، مگر کافی پڑھی لکھی پرانی اہل قلم ہیں۔ ... وہ پاکستان کے غریب طبقہ کی زبوں حالی سے متاثر ہوکر معاشیات ملکی کے مسائل پر قلبی سوز و گداز سے لکھنے میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ ان کے دل میں سچا درد ہے، لہٰذا اسلام ہی کے بتائے ہوئے معاشی نظام کے مطابق زر اور زمین کا صحیح صحیح استعمال اور ان کی مساویانہ تقسیم چاہتی ہیں" اور کتاب کے بارے میں لکھا ہے کہ "یہ کتاب قیام پاکستان سے پہلے کے تاریخی پس منظر اور پاکستان بننے کے بعد ۱۹۴۷ء کو اکتوبر ۱۹۵۰ء تک کے معاشی حالات کا ایک اچھوتا تاریخی ریکارڈ ہے" قیمت مجلد ساڑھے تین روپے
ملنے کا پتہ: اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس۔ سعید منزل ناظم آباد
ہی روڈ۔ کراچی (پاکستان)

ادبی کتابیں

GLIMPSES OF URDU LITERATURE از پروفیسر این ایس گوریکر

یہ کتاب اگرچہ انگریزی میں ہے، مگر چونکہ اردو ادب سے متعلق ہے، اس لئے ہم نے اردو ادب کے اس [illegible] میں اسے شامل کر لیا ہے۔

پروفیسر گوریکر سینٹ زیویرس کالج بمبئی میں شعبۂ اردو اور شعبۂ اسلامی تہذیب کے صدر ہیں اور [illegible] کے مصنف اور کاروانِ ادب کے مرتب ہیں، نیز کیفِ ادب، سرورِ ادب در انتخاب [illegible] میں سے ایک یہ بھی ہیں۔ پیش نظر کتاب موصوف کے چار لکچروں کا مجموعہ ہے، جو ۱۹۵۶ء میں [illegible] یونیورسٹی کی دعوت پر دیئے گئے تھے۔ ان لکچروں میں بڑی خوبی کے ساتھ اردو ادب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اختصار کے ساتھ اس پر تاریخی اور تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے اور آغاز سے آج تک کے مختلف

ادوار کی خصوصیات اور ان کے رجحانات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب میں مشہور جرنلسٹ ڈاکٹر رفیق زکریا کا ایک مبسوط اور فکر انگیز مقدمہ بھی شامل ہے۔ قیمت مجلد دس روپے۔ ناشر: جیکب پبلشنگ ہاؤس ۱۲۵ مہاتما گاندھی روڈ۔ بمبئی ۱

اردو زبان اور اسالیب (جلد اوّل) از سید محمد محمود رضوی مخمور اکبر آبادی۔

برصغیر ہند و پاک میں انگریزی کی تعلیم کی اشاعت اور مغربی ادب کے مطالعہ اور واقفیت سے خیالات میں گہرائی اور نظر میں وسعت پیدا ہوئی مگر عربی و فارسی پر زوال آنے اور انگریزی کے ذریعہ تعلیم ہونے سے اردو زبان کا معیار خاصا پست ہو گیا۔ تلفظ، تذکیر و تانیث اور محاورے کی غلطیاں جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں عام ہو گئیں۔ پیش نظر کتاب اسی خرابی کو دور کرنے کے لئے لکھی گئی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مصنف نے غلطیوں پر سخت محاسبہ کیا ہے اور صحت زبان پر بہت زور دیا ہے، مگر اتنا ہی جتنا ضروری ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "زبان کے سیاق میں صحت اور صحت پرستی دو باتیں ہیں۔ صحت یا شدھتائی کا پاس، زبان کو مضرتوں سے بچانے اور پاکیزگی برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے، لیکن اس اصول کو اتنا بے لوچ بے محل بے عمل نہ بنا دینا چاہیئے کہ بے مقصد ہو جائے اور دفع مضار کا تریاق، خود ہی سم قاتل بن کر رہ جائے ..... ہم اگر طرح طرح کی غیر فطری اور خود ساختہ بندشوں سے زبان کو، جدید خیالات، ترقی پسند عناصر اور معارف حیات کا ہم آہنگ نہ بننے دیں گے تو زبان معکوس ترقی کی راہ پر چلنے لگے گی، تنگ اور محدود ہو کر بے مصرف و مفاد ہو کر رہ جائے گی۔" اس میں شک نہیں کہ یہ کتاب وقت کی اہم ترین ضرورت کو پورا کرتی ہے اور اس قابل ہے کہ نصاب تعلیم میں شامل کی جائے۔ قیمت مجلد نو روپے۔ ناشر: اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس۔ کراچی۔

ماسٹر رام چندر اور اردو نثر کے ارتقاء میں ان کا حصہ۔ مولفہ: ڈاکٹر سیدہ جعفر

ماسٹر رام چندر انیسویں صدی کے نصف اول کی اہم ترین شخصیتوں میں سے ہیں۔ ۱۸۲۱ء میں پیدا ہوئے اور اگست ۱۸۸۰ء میں انتقال کیا۔ ریاضی کے بہت بڑے عالم تھے، اُس دور کی صحافت میں ان کا ممتاز مقام ہے، اردو زبان کو عام فہم بنانے میں ان کی خدمات قابلِ تعریف ہیں اور بقول غلام یزدانی صاحب "دلی والے جہاں غالب، مومن، صہبائی اور مفتی صدر الدین پر فخر کرتے تھے، وہیں ماسٹر رام چندر کا نام بھی

بہت محبت اور احترام سے لیا جاتا ہے" مگر یہ افسوسناک بات تھی کہ اُردو میں ایسے خادم قوم اور محسن اُردو پر کوئی مستقل کتاب نہیں تھی۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر شکریہ کی مستحق ہیں کہ زیرِ تبصرہ کتاب لکھ کر انھوں نے اردو دوستوں کا فرض کفایہ ادا کر دیا ہے۔ موصوفہ نے اس کتاب میں ماسٹر رامچندر کے حالاتِ زندگی اور ان کے علمی کارناموں کو بڑی چھان بین کے بعد لکھا ہے اور ان کے اہم مضامین کا انتخاب بھی پیش کیا ہے۔ ماسٹر رام چندر کی علمی و ادبی صلاحیتوں اور ان کی خدمات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا، مگر مولفہ کے اس خیال سے اتفاق کرنا مشکل ہے کہ "مضمون نگاری کے ارتقاء میں سرسید کے مضامین ایک توسیع ہیں آغاز نہیں۔ ماسٹر رام چندر اُردو کے پہلے مضمون نگار ہیں جنھوں نے شعوری طور پر اردو ادب میں اس صنف کی ابتدا کی"۔ (صـ۵۲ـ) ہمارے نزدیک اس معاملہ میں اس کتاب کے مقدمہ نگار غلام یزدانی صاحب کی رائے زیادہ صحیح ہے کہ "ان کے مضامین کی زبان میں وہ ادبی شان و شوکت اور وہ سلاست اور روانی نہیں ہے جو سرسید یا ماسٹر رام چندر کے چند ہمعصر ادیبوں میں پائی جاتی ہے" (معمولی تصرف کے بعد) اس لئے انھیں انشائیہ کا بانی قرار دینا صحیح نہیں ہے۔

یہ کتاب ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ خیرآباد۔ حیدرآباد ۲۰ سے خوبصورت ٹائپ میں شائع ہوئی ہے۔ اس پر سنہ طباعت ۱۹۶۰ء درج ہے، مگر معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی ہے۔ قیمت غیر مجلد ساڑھے تین روپے۔

انشاء اللہ خاں انشاء — عہد اور فن   از اسلم پرویز

اس کتاب میں انشاء کے سوانح حیات اور علمی کارناموں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب پر تنقید و تحقیق کے مضمون میں تفصیل سے تبصرہ کیا جا چکا ہے اس لئے یہاں اعادہ کی ضرورت نہیں۔ کتابت و طباعت اور کاغذ عمدہ۔ قیمت مجلد چار روپے۔ ناشر: مکتبہ شاہراہ۔ دہلی ۶

دلی کا دبستان شاعری   مرتبہ: ظہیرالدین احمد صدیقی۔

دلی کالج میگزین کا یہ خاص نمبر ہے جس کا موضوع "دلی کا دبستان شاعری" ہے۔ اس کے دو حصے ہیں۔ ایک شخصیات سے متعلق ہے، جس میں دلی کے اساتذہ شعراء پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ دوسرے حصہ میں دلی کے دبستان شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس کے اہم رجحانات و میلانات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ جناب اڈیٹر نے اس خاص نمبر کے متعلق لکھا ہے کہ "بہت سے گوشے تشنہ رہ گئے ہیں، اگرچہ کچھ

بھی پیش کر رہے ہیں، وہ اس یقین کے ساتھ کہ قدر شناسانِ ادب کے لئے نایاب چیز ہوگی۔ قیمت پانچ روپے
ملنے کا پتہ: دلی کالج دہلی۔

امراؤ جان ادا از مرزا محمد ہادی رسوا

امراؤ جان ادا اردو کے مقبول ترین ناولوں میں سے ہے اور اردو ناول نگاری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ پیش نظر ایڈیشن مکتبہ شاہراہ سے ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا ہے، اس میں ڈاکٹر قمر رئیس کے قلم سے مصنف کا سوانحی خاکہ اور ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کا ایک مبسوط مضمون شامل ہے، جس میں ناول کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے اس سے کتاب کی افادی حیثیت بہت بڑھ گئی ہے۔ اس ایڈیشن کی ساڑھے پانچ روپے قیمت ہے۔ ایک عام ایڈیشن بھی شائع کیا گیا ہے۔ جس میں یہ دونوں مضمون شامل نہیں ہیں۔ اس کی قیمت ساڑھے چار روپے ہے۔ ناشر مکتبہ شاہراہ۔ دہلی ۶

اُردو ڈرامہ مرتبہ: ڈاکٹر قمر رئیس

اردو میں ڈرامے کی طرف توجہ بہت کم ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے چند مطبوعہ ڈراموں کا یہ مختصر مجموعہ مرتب کرکے اردو ادب میں ایک مفید اضافہ کیا ہے۔ اس میں کل نو ڈرامے شامل ہیں، جن میں دو ترجمے ہیں اور سات طبع زاد۔ مرتب کا ایک طویل مقدمہ بھی شامل ہے جس میں موصوف نے ڈرامے کے فن پر تفصیل سے بحث کی ہے اور اُردو ڈرامہ نگاروں کا جائزہ لیا ہے۔ جائزے کے بارے میں مرتب نے لکھا ہے کہ "اس مختصر جائزے میں صرف ایسے ڈرامہ نگاروں کا ذکر کیا گیا ہے، جن کی سنجیدہ کوششیں اُردو ڈرامہ کے نشو ونما اور ترقی میں معاون رہی ہیں اور جن کی تخلیقات سے اُردو ڈرامہ کا فنی معیار بلند ہوا ہے"۔ قیمت مجلد چار روپے۔ ناشر: سرسید بک ڈپو۔ علی گڑھ۔

حالی کی ایک جھلک از صالحہ عابد حسین

یہ ایک ۹۵ صفحے کا مختصر ڈراما ہے، جس میں بڑی خوبی کے ساتھ مولانا حالی کے علمی کارنامے اور ان کی شخصیت بیان کی گئی ہیں۔ بیگم صالحہ عابد حسین چھوٹوں کے لئے بھی لکھتی ہیں اور بڑوں کے لئے بھی، وہ افسانے بھی لکھتی ہیں اور ڈرامے بھی، ناول بھی لکھتی ہیں اور سنجیدہ علمی و ادبی مضامین بھی۔ اور جو کچھ لکھتی ہیں خوب لکھتی ہیں۔ یہ ڈراما بھی خوب ہے اور اپنی نوعیت کا شاید اکیلا۔ قیمت ڈیڑھ روپے۔ ناشر: انجمن ترقی اردو علی گڑھ

حاجی بغلول مصنفہ: منشی سجاد حسین مرحوم

منشی سجاد حسین مرحوم مشہور مزاحیہ نگار ہیں اور حاجی بغلول اُردو کے بہترین مزاحیہ ناولوں میں ہے اور بقول رشید احمد صدیقی "حاجی بغلول اردو طنزیات وظرافت میں منفرد حیثیت رکھتا ہے اور اب تک اس کا جواب اردو میں کہیں نظر نہیں آتا۔" مگر اس کے پرانے ایڈیشن میں بہت سی خامیاں تھیں مثلاً کتابت میں صحیح اصول املا کو ملحوظ نہیں رکھا گیا تھا کسی باب کا عنوان تھا، کسی کا غائب۔ غرض اس قسم کے متعدد نقائص تھے، جنھیں اس کتاب کے مرتب جمیل جالبی صاحب نے اس ایڈیشن میں دور کر دیا ہے۔ اس میں مرتب کا ایک مبسوط مقدمہ بھی شامل ہے، جس میں موصوف نے اس ناول کی خصوصیات کو بیان کیا ہے۔ قیمت مجلد ساڑھے چار روپے۔ ناشر: مشتاق بک ڈپو۔ شلڈن روڈ۔ کراچی ۱

بیسویں صدی بدھو از فکر تونسوی

فکر تونسوی ایک خوش فکر طنزیہ اور مزاحیہ نگار ہیں۔ پیش نظر طنزیہ ناول میں خود اپنا تعارف کرایا ہے۔ اس میں ان کا اپنا انداز پوری طرح نمایاں ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ پہلے انھوں نے ڈرامے لکھے، پھر شاعری کی ان دونوں میں ناکام ہونے کے بعد طنز ومزاح کی طرف توجہ کی اور لوگ، خود فکر صاحب کے الفاظ میں ان کی "طنزیہ تحریروں پر لٹو ہونے لگے۔۔۔۔۔ چنانچہ مقبولیت کی اس گہما گہمی میں مصنف نے سات آٹھ کتابیں لکھ ڈالیں، جو تمام و کمال طنز ومزاح کے گرد گھومتی ہیں۔" قیمت مجلد پونے چار روپے ناشر: مکتبہ شاہراہ دہلی ۲

اردوئے معلیٰ (مولانا عبد الحق مرحوم کے خطوط کا مجموعہ)

کراچی میں مولانا عبد الحق صاحب بابائے اردو کی نوے سالہ جوبلی منائی گئی تھی۔ اس موقع پر ایک جوبلی کمیٹی بنائی گئی تھی جس کے صدر بابائے اُردو کے دست راست سید ہاشمی فرید آبادی تھے۔ کمیٹی کی تحریک پر طے کیا گیا کہ اس موقع پر بابائے اُردو کے خطوط جمع کر کے شائع کیے جائیں۔ چنانچہ صدر کمیٹی کی کوششوں سے کافی خطوط جمع ہو گئے، جنھیں جلیل احمد قدوائی صاحب نے مرتب کیا اور حسب ضرورت ذیلی حواشی لکھے اور سید ابو نعیم صاحب فرید آبادی نے انھیں اُردوئے معلیٰ کے نام سے شائع کیا ہے۔ بابائے اُردو کی زبان کی سادگی اور ان کے اسلوب کی دلکشی اور شگفتگی مسلم ہے اور اس کا بہترین اظہار خطوط میں ہوتا ہے۔

چنانچہ یہ خطوط بابائے اُردو کے طرزِ نگارش کے بہترین نمونے اور مواد کے لحاظ سے بھی کچھ خطوط تاریخی اہمیت رکھتے ہیں۔ قیمت ساڑھے سات روپے۔ ناشر: سید ابوتمیم فرید آبادی، ۱۲۔ اردو بازار۔ لاہور۔

جگہ کم ہے، اس لئے اب صرف کتابوں کی فہرست ذیل میں درج کی جا رہی ہے، ان پر تبصرہ کسی اگلی اشاعت میں شائع کیا جائے گا۔

اقبالیات

اقبالؔ کے آخری دو سال از ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی ؛ اسرارِ رموز پر ایک نظر۔ از پروفیسر محمد عثمان
اقبالؔ اور حیدرآباد از نظرِ حیدرآبادی ؛ حدیثِ اقبال از طیب عثمانی ندوی

نظم

رگِ جاں از خورشید الاسلام ؛ اردو غزل دکنی تک۔ مرتبہ ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی
شکستِ شب از محسن بھوپالی ؛ نیرنگِ نظر۔ از روحی علی اصغر

نیرنگِ نظر پر دسمبر ۱۹۶۱ء کے جامعہ میں تبصرہ ہو چکا ہے۔ ذیل کی دو کتابیں بھی ۱۹۶۱ء کی مطبوعات میں شامل ہیں اور ان پر بھی جامعہ میں (اکتوبر ۱۹۶۱ء) تبصرہ ہو چکا ہے۔

تذکرۂ جگر از محمود علی خاں ؛ جگر — فن اور شخصیت از شارب ردولوی۔

(بقیہ صفحہ ۹۱)

اکتوبر: سید علی اصغر بلگرامی۔ ۱۸۸۴ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ ممتاز مؤرخ اور ماہر آثارِ قدیمہ تھے۔ آپ سنسکرت اور پالی کے بھی ماہر تھے۔ آپ نے حسبِ ذیل کتابیں لکھی ہیں۔ ۱۔ فلسفۂ ازدواج ۲۔ مآثر دکن ۳۔ سیاحت نامہ ۴۔ فارسی بلگرام۔ ۵۔ حدیقۃ السلاطین۔ ۶۔ Landmarks of Deccon ۷۔ Landmaks of Aurangabad

۲ر دسمبر: ڈاکٹر سید محمد حفیظ آج سے کوئی ۶۰ سال قبل قصبہ نونہرہ ضلع غازی پور کے ایک شیعہ خاندان سادات میں پیدا ہوئے اصل نام کے بجائے ایم ایچ سید کے نام سے مشہور تھے۔ کوئی پندرہ سولہ سال تک درس و تدریس کی خدمت انجام دینے کے بعد ریٹائر ہو کر الہ آباد میں مستقل قیام کر لیا۔ کلیاتِ بحری (دکنی) کو ایڈٹ کیا اور ایک کتاب گوتم بدھ پر اور ایک کبیر پر لکھی۔ اُردو سے زیادہ انگریزی میں لکھتے تھے۔ ۲۱ر دسمبر ۶۱ء کو دل کا دورہ پڑا اور داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

کچھ سالنامہ کے متعلق

سالنامہ جامعہ کا سالنامہ آپ کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔ اگر آپ آج کل کے ضخیم سالناموں اور خاص نمبروں کے معیار پر اس کو جانچیں گے، تو آپ کو مایوسی ہوگی لیکن اگر اس کے مضامین کے معیار، موضوعات کی اہمیت اور اس کے افادی پہلو پر نظر ڈالیں گے، تو امید ہے کہ بڑی حد تک پسند آئے گا۔ آج کل اعداد و شمار کا زمانہ ہے کسی چیز کا صحیح اندازہ کرنا یا جائزہ لینا ہو تو پہلے اس کی تعداد معلوم کی جاتی ہے، اس لیے ہم نے سب سے پہلے پچھلے سال کی تمام مطبوعات کے متعلق معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی مختلف رسالوں میں اعلانات شائع کئے اور متعدد ناشروں کو خطوط لکھے ہم نے جن ادیبوں سے مضامین لکھنے کی درخواست کی تھی انھوں نے بھی اپنے طور پر اپنے اپنے موضوع سے متعلق کتابیں حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن اس کے باوجود اگر اس سالنامہ میں کوئی اہم کتاب تبصرہ سے رہ گئی ہے تو اس میں ہماری کوتاہی کو کوئی دخل نہیں ہے۔

اس موقع پر جہاں ہمیں شدت سے اس بات کا احساس ہوا کہ اردو کے ناشر اپنی مطبوعات کی نشر و اشاعت کے لئے جدید طریقے اختیار نہیں کرتے، وہاں اس تکلیف دہ حقیقت کا بھی احساس ہوا کہ بڑے سے بڑے تعلیمی اداروں میں اردو کی تمام اہم کتابوں کو حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ ہم نے جن ادیبوں سے مضمون لکھنے کی درخواست کی تھی، ان میں سے ہر ایک بلا استثنا کسی نہ کسی بڑے ادارے سے وابستہ ہے مگر ان میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جسے کتابوں کو حاصل کرنے میں غیر معمولی کوشش اور محنت نہ کرنی پڑی ہو، اگر یونیورسٹیوں اور کالجوں کے کتب خانوں میں بھی ہر سال کی تمام اہم مطبوعات اور نئے اڈیشن موجود نہ ہوں گے تو پھر کس سے توقع کی جاسکتی ہے اور کتابیں لکھی اور شائع کی جائیں گی تو کس امید پر؟!

ہم نے پچھلے شمارہ میں جن مضامین کا اعلان کیا تھا، ان میں سے تین مضمون —— علمی و مذہبی کتابیں، تعلیمی کتابیں اور ڈرامے —— سالنامہ میں شامل نہیں ہیں۔ تیسرا مضمون باوجود متعدد وعدوں کے موصول نہیں ہوا اور پہلے دو مضمون اس لئے لکھے نہ جاسکے کہ آخر وقت تک ان کے لئے مناسب تعداد میں کتابیں نہ مل سکیں۔ اردو میں تعلیم کے موضوع پر کتابوں کی کمی کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے

کہ پچھلے سال ہندوستان و پاکستان میں صرف ایک ہی کتاب شائع ہوئی ہے۔

ہم نے صرف ۱۹۶۱ء کی مطبوعات کا جائزہ شائع کرنے کا اعلان کیا تھا۔ لیکن تین مضامین میں پچھلے دو برسوں کی کتابوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کی وجہ سے جہاں یہ نقص پیدا ہوا ہے کہ تمام مضامین میں یکسانیت باقی نہیں رہی، وہاں یہ فائدہ بھی ہوا ہے کہ بعض اصناف ادب کا جائزہ زیادہ وسیع ہو گیا ہے اور معلومات میں قابل لحاظ اضافہ ہوا ہے۔

ہندوستانی ادیبوں کو پاکستان کی تمام کتابوں کا نہ تو علم ہوتا ہے اور نہ وہ آسانی سے یہاں ملتی ہیں اس لئے ان پر ایک مستقل مضمون لکھوایا گیا ہے۔ ظاہر ہے ایک مضمون میں جائزہ کا پورا حق ادا نہیں کیا جا سکتا تھا، مگر ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب نے اپنا مضمون اس خوبی سے لکھا ہے کہ اس کی روشنی میں وہاں کی رفتار ادب کا آسانی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے مضمون نگاروں نے بھی بڑی محنت اور جانفشانی سے لکھا ہے اور اپنے اپنے موضوع کے ساتھ پورا انصاف کرنے کی کوشش کی ہے۔

ارادہ تھا کہ اس سالنامہ میں جو مضامین شائع ہوئے ہیں، ان کا جائزہ لینے کے لئے ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کو تکلیف دی جائے۔ لیکن شیخ الجامعہ کے عہدہ کی ذمہ داریوں کی وجہ سے وہ اس زمانہ میں بے حد مصروف رہے، اس کے علاوہ سوائے ایک کے بقیہ کوئی مضمون ہمارے اپنے پروگرام کے مطابق وقت پر موصول نہیں ہوا۔ افسوس ہے کہ اس کی وجہ سے یہ سالنامہ ڈاکٹر صاحب کے مفید تبصرہ سے محروم رہا۔

آخر میں ادارے کی طرف سے تمام مضمون نگاروں کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ہمیں اس کا پورا احساس ہے کہ انھوں نے کن مشکل حالات میں مضمون لکھے ہیں۔ اور اپنے جائزہ کو مکمل کرنے کے لئے ایک ایک کتاب کی تلاش میں کس قدر وقت اور محنت صرف کی ہے۔ انھوں نے یہ سب کچھ محض جامعہ اور اردو ادب کی خاطر کیا ہے۔ ان کے اس خلوص بے پایاں کا شکریہ ادا کرنے سے زبان قلم قاصر ہے۔

عبداللطیف اعظمی

۲۴ر جنوری ۱۹۶۲ء

Printer & Publisher : A. L. Azmi
Printed at : Union Printing Press, Delhi-6.
Only cover printed at : Dayals' Printing Press, Delhi-6.

جامعہ

جامعہ ملّیہ اسلامیہ، دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ
چھ روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس نئے پیسے

جلد ۴۶	بابت ماہ مارچ سنہ ۱۹۶۲ء	شمارہ ۵

فہرست مضامین

خط و کتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر۔ نئی دہلی

مغربی دُنیا پر ایک نظر

(۱)

پروفیسر محمد مجیب

آج کل یورپ اور امریکہ کا سفر کرنا ایک معمولی سی بات ہے، اور ایسے سفر کے حالات بیان کرنا جانی بوجھی باتوں کو خواہ مخواہ دہرانا ہے۔ مگر جو لوگ اکثر آتے جاتے رہتے ہیں انھیں بھی ہر دفعہ یورپ یا امریکہ پہنچ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے ایک تصور اور ایک نظام سے نکل کر کسی دوسرے ماحول میں آگئے ہیں۔ تبدیلی کے اثر کو زائل کرنے کے لئے وہ سوس، جرمن، فرانسیسی، انگریز، امریکن کا ایک نقشہ اپنے ذہن میں قائم کر لیتے ہیں، اور اس طرح جو کچھ پیش آتا ہے وہ خود بخود دماغ کے مفروضے میں داخل ہو جاتا ہے۔ نقشہ قائم کرنے میں کوئی خوش فہمی سے کام لیتا ہے، اور جہاں جاتا ہے اسے تعریف کے قابل طریقے اور آدمی ملتے ہیں، کوئی تعریف کے پہلوؤں کو نظر انداز کر کے اعتراض اور شکایت کے موقعے نکالتا ہے اور اسے یہ ملتے رہتے ہیں۔ تعریف زیادہ تر انتظامات کی خوبی اور زندگی کی سہولتوں کی ہوتی ہے، اعتراض انھیں انتظامات اور سہولتوں کی روح، یعنی دولت اور لالچ پر کیا جاتا ہے۔ یورپ اور امریکہ کے لوگ بھی تعریف اور اعتراض اسی نقطۂ نظر سے کرتے ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ ہم ایسے نظام کی جانچ کرتے ہیں جسے دوسروں نے بنایا ہے، اور وہ اسے اپنی بنائی ہوئی چیز سمجھ کر دیکھتے ہیں، اور اس میں کسی وجہ سے رکاوٹیں یا دشواریاں پیدا ہوں تو اس میں انھیں اپنی حق تلفی محسوس ہوتی ہے اور انھیں اسی طرح کا غصہ آتا ہے جیسے اپنی گھڑی کے غلط وقت دینے یا رک جانے یا موٹر کے خواہ مخواہ بگڑ جانے پر۔ میں ایک مرتبہ جرمنی میں سفر کر رہا تھا۔ اتفاق سے گاڑی بہت لیٹ ہو گئی۔ ایک جنکشن پر لوگوں نے کنڈکٹر کو گھیر لیا اور اس طرح لعنت ملامت کرنے لگے کہ گویا اس نے انھیں دھوکا دیا ہے۔ مغربی دنیا کا سارا نظام اس مفروضے پر چلتا ہے کہ سب اس کو قائم اور جاری رکھنے میں شریک ہیں، اور کوئی رکاوٹ پیدا ہو تو ایسا اثر ہوتا ہے جیسے کسی بدعہدی کا۔

یہ نظام بنیادی طور پر صنعت اور تجارت کے ذریعے نفع اندوزی کی مسلسل جدوجہد کا نتیجہ ہے لیکن نفع اندوزی کا ایک طریقہ دوسرے طریقوں کے لئے راہ نکالتا ہے اور چاہے یہ ثابت کیا جا سکے کہ ان طریقوں کو

اختیار کرنے میں نیت محض نفع حاصل کرنے کی تھی، مجموعی طور پر ان کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہزار قسم کی آسانیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ نفع حاصل کرنے والوں میں برابر مقابلہ رہتا ہے، اور کامیاب وہ ہوتا ہے جو خریدار کو اپنی طرف متوجہ کر سکے۔ خریدار چاہے اپنی ضرورت یا خواہش کی وجہ سے مجبور ہو، لیکن اسے محسوس یہ کرایا جاتا ہے کہ مال خریدنے یا کسی سہولت سے فائدہ اٹھانے میں وہ دوسروں پر احسان کر رہا ہے۔ اس کا دوسرا مضر پہلو یہ ہے کہ اشتہار کی بہت بیجا اہمیت ہوگئی ہے۔ شہروں کو روشن اور رنگین اشتہاروں سے اس طرح سجایا جاتا ہے کہ گویا زندگی اور کاروبار کی آبرو اسی میں ہے، اخباروں اور رسالوں کا مقصد یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ذریعے اشتہار دیے جا سکیں۔ یورپ میں یہ عیب بہت نمایاں ہے۔ متحدہ ریاستوں میں یہ ایک ذہنی بیماری کی حد تک پہنچ گیا ہے۔ میں نے ایک امریکن خاتون سے کہا کہ آپ کے یہاں بیشتر مصور رسالوں میں مضامین اشتہاروں کی پشت پر چھاپے جاتے ہیں۔ وہ میرا مطلب سمجھ گئیں اور کچھ دنوں بعد مجھے نفسیات کے مشہور عالم ڈاکٹر ینگ کا ایک مضمون کسی رسالے سے کاٹ کر بھیجا جو انھیں پسند آیا تھا، اور اسی کے ساتھ یہ معذرت بھی کی کہ یہ اشتہاروں کی پشت پر چھپا ہے۔ اشتہار دینے اور مال بیچنے کو اتنی اہمیت حاصل ہوگئی ہے کہ اس کے لیے ہر بات جائز سمجھی جاتی ہے، لوگوں کو اشتہاری تصویریں دکھائیے اور پوچھیے کہ ان کے ہوتے ہوئے کسی قاعدے اور اصول کے مطابق اخلاقی تربیت ہوسکتی ہے یا نہیں تو وہ فوراً کہہ دیں گے کہ نہیں ہوسکتی، یہ بھی کہہ دیں گے کہ یہ اشتہار واقعی بہت نقصان پہنچاتے ہیں، مگر اصلاح کی کوئی تدبیر ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ سرمایہ داری اور کھلا مقابلہ معاشی زندگی، آزادی اور جمہوریت کی بنیاد ہوں تو وہ اپنے تحفظ کی صورتیں پیدا کر لیتے ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نامناسب اشتہاری تصویروں کی ممانعت کرنا آزادی اور جمہوریت کا گلا گھونٹنا ہے۔

یورپ میں سرمایہ داری اور صنعت کی وجہ سے بہت ترقی ہوئی ہے، مگر آبادی اتنی کم اور خام اور صنعتی مال کی پیداوار اتنی افراط سے نہ تھی کہ اسراف کو ایک معاشی فرد کی حیثیت دینا ضروری ہو جائے۔ امریکہ میں آبادی کی کمی، قدرتی اور صنعتی پیداوار کی فراوانی اور زندگی کے معیار کو اونچا کرنے کی مسلسل جدوجہد نے ایسا کچھ کر دیا ہے کہ ہر طرح کا مال ضائع نہ کیا جائے تو معاشی زندگی کا نظام درہم برہم ہو جائے۔ کفایت شعاری کی تعلیم دینا گویا نصیحت کرنا ہے کہ کھانا اس طرح کھاؤ کہ نوالہ حلق میں پھنس جائے۔ کاغذ کی

ہزاروں قسمیں ہیں اور اس سے ہزاروں کام لئے جاتے ہیں، اس کی خاص قدر اس وجہ سے ہے کہ استعمال کے بعد سب سے زیادہ آسانی سے پھینکا اور جلایا جا سکتا ہے جسے لکھنے کی عادت ہو، اور وہ بھی ہندوستانی کاغذ پر، اسے بڑی الجھن ہو سکتی ہے۔ انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک سٹڈیز میں مجھے بہت سا کاغذ لکھنے کے لئے دیا گیا پہلے تو اس بات سے وحشت ہوئی کہ اتنا اچھا کاغذ محض مشق کے لئے استعمال کیا جائے، پھر جب طبیعت پر جبر کرکے لکھنا شروع کیا تو دیکھا کہ کھردری سطح پر چلنے کا عادی قلم چکنے کاغذ پر پھسلتا ہے، اور روشنائی بہہ کر اپنی عاجزی ظاہر کرتا ہے۔ پھر بھی کوشش جاری رکھی۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ ٹائپسٹ کو عبارت پڑھنے میں دشواری ہوتی ہے۔ میں نے اپنی لکھائی کو لازم ٹھہرایا، اور حرفوں کی نوک پلک کی طرف توجہ کرنے لگا۔ ایسی لکھائی کاغذ نے گوارا نہیں کی۔ پھر میں نے سستے، خراب، بلکہ خراب سے خراب کاغذ کی تلاش کی، اس امید میں کہ غریب کاغذ غریب کے قلم کی سنگت کو پسند کرے گا، انسٹی ٹیوٹ کی منتظمہ دفتر مسز ڈوفسکل نے الماری کھول دی اور کہا کہ جو کاغذ پسند ہو لے لیجئے۔ میں نے ایک زرد رنگ کا نسبتاً سستا کاغذ پسند کیا، مگر اس میں بھی وہ آن بان تھی کہ میرا قلم اس سے مانوس نہ ہو سکا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یونیورسٹی کی کتابوں کی دکان میں سستا کاغذ ملتا ہے، وہاں گیا اور سب سے سستا کاغذ خرید لایا، اس سے بھی کام نہ بنا۔ آخر میں نے خشک روشنائی کا سستا سا قلم لے کر حرفوں کی نوک اور اچھی شکل کا خیال کئے بغیر لکھنے کی عادت ڈالی، کاغذ زیادہ صرف میں آیا، مگر جتنی ناپسند مجھے اپنی لکھی ہوئی عبارت تھی اتنی ہی وہ ٹائپسٹ کے لئے پڑھنے میں آسان ہو گئی۔ کاغذ کے بیجا صرف پر مجھے اس وجہ سے بھی تامل ہوتا تھا کہ میونخ میں میرا کوریا کے ایک طالب علم سے تعارف کرایا گیا تھا جو اتنا غریب تھا کہ ادھر اُدھر سے ردی کاغذ جمع کرکے اپنا کام چلاتا تھا۔ یہ طالب علم ایک اور موقعے پر بھی بہت یاد آیا۔ میں نے ایک بڑی دوکان سے اوورکوٹ خریدا، اور دوکاندار سے کہا کہ اسے میرے پتہ پر بھجوا دے۔ دوسرے دن شام کو کمرہ پر آیا تو دیکھا کہ ایک لمبا چوڑا دفتی کا بکس رکھا ہے اسے کھولا تو ململی کاغذ کی ایک موٹی تہ نظر آئی۔ اسے ہٹایا تو اوورکوٹ نکلا۔ اوورکوٹ کو اٹھایا تو اس کے نیچے بھی ململی کاغذ کا ایک بستر تھا۔ یہ ململی کاغذ ایسا نفیس تھا کہ میں اسے ردی کی ٹوکری میں پھینک نہ سکا۔ اور میں نے اسے بہت احتیاط سے میز کے خانے میں رکھ لیا۔ مگر سوائے اس کے کہ میں اسے کوریا کے

طالب علم کے لئے بچا کر رکھتا اور واپسی پر میونخ میں اسے دے دیتا کاغذ کا اور کوئی مصرف سمجھ میں نہ آیا۔ وہ خانے میں رکھا رہا۔ آخر میں اسباب باندھتے وقت اس کے لئے جگہ نہیں نکلی، اور اسے میں میز کے خانے میں ایسے شخص کے لئے چھوڑ آیا جو اسے اس کی منزل مقصود یعنی ردی کی ٹوکری تک پہنچانے کا دل گر رکھتا ہو۔

آپ بیتی کی ان چھوٹی موٹی مثالوں سے اس کا ہرگز اندازہ نہیں ہو سکتا کہ امریکہ میں کاغذ کس مقدار میں ضائع ہوتا ہے۔ اور کاغذ بھی صرف ایک مثال ہی ہے۔ کھانے پینے کی چیزیں اس سے بھی زیادہ ضائع ہوتی ہیں۔ کئی لوگوں نے حساب لگایا ہے کہ صرف نیویارک شہر میں جتنا کھانا پھینک دیا جاتا ہے اس سے دنیا کے کتنے بھوکے پیٹ بھرے جا سکتے ہیں۔ لکڑی، لوہے، پٹرول کا خرچ بے پناہ ہے۔ امریکہ کی خوش حالی موٹروں کی تعداد سے ظاہر کی جاتی ہے۔ میں وہاں کے ایک بہت چھوٹے شہر منسی میں کوئی دو ہفتہ رہا۔ اس کی آبادی چھہتر ہزار ہے اور موٹروں کی تعداد پچیس ہزار۔ لوگ قریب کے مکانوں میں ملاقات کے لئے موٹروں پر جاتے ہیں، پارکنگ کا مسئلہ اتنا اہم ہو گیا ہے کہ شہر کے باہر کی وہ دوکانیں پسند کی جاتی ہیں جن کے ساتھ موٹر کھڑے کرنے کے لئے جگہ ہوتی ہے، شہر میں ایسی جگہ کبھی کبھی اتنی دور ملتی ہے کہ موٹر پر جتنا فاصلہ طے کیا جاتا ہے اس سے زیادہ پیدل طے کرنا ہو ہے۔ اس دستور کا کہ ہر شخص کے پاس موٹر ہو اور عادتاً موٹر کی سواری کی جائے ایک یہ نتیجہ نکلا ہے کہ لوگ پیدل چلنے کو معمول کے خلاف سمجھتے ہیں۔ منسی میں ایک مرتبہ میں اپنے میزبان کے ساتھ خط ڈاک میں ڈالنے گیا۔ مطلب یہ تھا کہ اس بہانے کچھ سیر بھی ہو جائے۔ خط ڈالنے کے بعد ہم دونو واپس آ رہے تھے کہ ایک پولیس والے نے اپنی گاڑی روک کر ہم سے پوچھا کہ آپ کی موٹر کو کچھ ہو تو نہیں گیا ہے۔ میرے میزبان اور ان کی بیوی کے لئے شہر میں پیدل چلنا ایک انوکھی بات تھی، اور میرے اصرار سے ٹہلنے کے لئے جانے کا ان کے ماننے پر جو خوشگوار اثر پڑا اسے انھوں نے میرا ایک احسان سمجھ اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ چل نہیں سکتے تھے، یا امریکہ میں عام طور پر لوگ چل نہیں سکتے۔ وہاں لوگوں کو چلنے پھرنے کا بہت شوق ہے، صحت کا بہت خیال رکھتے ہیں، مگر روزمرہ کا ٹہلنا یا گھر سے دفتر تک پیدل جانا، چاہے دفتر قریب ہی ہو، کسی شوق کو پورا کرنے یا صحت کو قائم رکھنے کا ذریعہ نہیں مانا جاتا۔

شہروں میں آمدورفت کے قاعدے یہ سمجھ کر بنائے گئے ہیں کہ ہر شہری کے پاس موٹر ہوگا۔ بے چارے پیدل چلنے والوں کو چوراہوں پر سڑک پار کرنے کا موقع اس وقت ملتا ہے جب ایک سمت سے آنے جانے والے موٹروں کو اس لئے روکا جاتا ہے کہ مقابل کی سمت والوں کو چوراہے سے گذرنے کا موقع ملے، جہاں موٹروں کی آمدورفت میں آسانی پیدا کرنے کے لئے وَن وے ٹریفک کا قاعدہ ہے وہاں موٹروں کا سیلاب مسلسل بہتا رہتا ہے، اور پیدل چلنے والا کھڑا انتظار کرتا رہتا ہے جب تک کہ یہ سیلاب نہ تھمے۔ مجھے روز ایک ایسی ہی سڑک کو پار کرنا ہوتا تھا، اور روز ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بس بال بال بچا۔

یورپ اور امریکہ کی تہذیب پر کاروبار کی مصلحتیں اور ضرورتیں حاوی ہیں، اور ان سے یا تو اتنا فائدہ پہنچتا ہے یا ان کی پشت پر ایسی طاقتیں ہوتی ہیں کہ ان کے مقابلے پر دوسری مصلحتوں کو پیش کرنا بیکار ہوتا ہے۔ اسی پچاسی منزلوں کی عمارتیں بنانے کا رواج غالباً نیویارک سے شروع ہوا، اور کاروباری مقابلے نے ان کی بلندی کو سو منزلوں سے بھی اوپر پہنچا دیا، لیکن اس کے بعد اس قسم کی عمارتیں ان شہروں میں بھی بننے لگیں جہاں زمین کی اتنی کمی نہیں تھی کہ شہر پھیل کر آباد نہ ہوسکیں، یہاں تک کہ لندن میں بھی ایوان پارلیمنٹ اور بگ بن کو نیچا دکھانے کے لئے ایسی ہی ایک عمارت بن گئی ہے۔ یورپ اور امریکہ کا نظامِ زندگی ایک مدت سے وہاں کے انسانوں کے ذہن پر حاوی ہے۔ اور اس کی حکومت میں مطلق العنانی کی وہی کیفیت ہے جو فرعون، سکندر اور دارا کی فرمانروائی میں تھی ہر شخص کے لئے سلامتی اسی میں ہے کہ قاعدے پر عمل کرے۔ قاعدے کی خلاف ورزی کرنے والے کے ساتھ ہر طرح کا سلوک ہوسکتا ہے۔ اگر اس سے کسی شخص کو نقصان پہنچا ہو تو وہ فوراً اعتراض کرتا ہے، اگر صرف پبلک قاعدہ کو توڑا جائے، مثلاً پارک میں کوئی پھول توڑے تو پارک کے نگراں ہی نہیں بلکہ راستہ چلتے لوگ ٹوک سکتے ہیں، جرمنی میں طالب علمی کے زمانے میں ایک مرتبہ میں گھاس پر جو سڑک کے دونوں طرف لگی ہوئی تھی کھڑا ہوگیا۔ ایک آدمی نے مجھے ڈانٹ کر وہاں سے ہٹایا، اور ایک نوٹس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ تم دیکھ نہیں رہے ہو کہ گھاس پر کھڑے ہونے کی ممانعت ہے۔ اگر نقصان قاعدہ کی خلاف ورزی کرنے والے ہی کو پہنچ رہا ہو تو اس سے شاذ و نادر کسی کو ہمدردی ہوتی ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو خاص ایسی صورتوں کے لئے مقرر ہوں۔ ہندوستان آتے ہوئے میں پیرس

میں اترا تو پاسپورٹوں کی جانچ کرنے والے نے مجھے روک لیا، اور ایک طرف کھڑے ہو جانے کو کہا۔ میرے سامنے سے لوگ گذرتے رہے اور کسی نے میری طرف توجہ نہ کی۔ پاسپورٹ آفیسر اپنے کام میں لگا رہا اور میری طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ اس طرح میں آدھے گھنٹے کے قریب کھڑا رہا۔ آخر میں ایک عورت کو جس کے سپرد یہ کام تھا کہ ہر ہوائی جہاز کے مسافروں کو گن کر دیکھے کہ جتنے جہاز سے اترے تھے اتنے شہر جانے کی بس پر بیٹھ کر روانہ ہو گئے اپنی فہرست میں ایسے مسافر کا نام ملا جو جہاز سے اترا تھا مگر بس پر سوار نہیں ہوا تھا۔ تلاش کرتے کرتے وہ میرے پاس پہنچی، اور پاسپورٹ آفیسر سے میرے روکے جانے کی وجہ دریافت کی معلوم ہوا کہ میں نے ویزا نہیں لیا ہے۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ پیرس میں کتنے دن ٹھہرو گے، اور جب میں نے یقین دلایا کہ تین دن سے زیادہ نہیں ٹھہروں گا تو اس نے ایک طرف میونخ کے جہاز میں میری سیٹ ریزرو کرادی اور دوسری طرف ویزا دلوادیا۔ ایسے واقعات بہت سے لوگوں کے ساتھ پیش آتے ہیں، اور مغربی نظام زندگی کی یہ بڑی تعریف کی بات مانی جاتی ہے کہ اگر قاعدوں سے واقف ہونا اور ان پر عمل کرنا ضروری ہے تو غلطی کرنے والوں کو راہِ راست پر لانے کا انتظام بھی ہے۔

لیکن اس نظام میں جو اپنے بل بوتے سے اپنے قاعدوں کے مطابق چلتا ہے افراد کی تسکین کا سامان بہت کم ہے، اور زیادہ تر اس وجہ سے کہ نظام ان کی ضرورتوں کو اس حد تک پورا کر دیتا ہے جہاں تک وہ اس کی قیمت ادا کر سکتے ہیں، باقی جو کچھ ہے اس سے اس نظام کو مطلب نہیں۔ اس کی لوازمات افراد کو ایک دوسرے سے متعلق کر دیتی ہیں، کارخانوں میں مختلف قسم اور درجے کے مزدور، نگراں اور منتظم ہو ہیں، سب کو قابلیت اور کام کی نوعیت کے مطابق معاوضہ ملتا ہے، لیکن سب کا معاملہ الگ، رائج قاعدوں کے مطابق ہوتا ہے، مدرسوں اور کالجوں میں استاد رکھے جاتے ہیں جو اپنے انفرادی اور مشترک کام خوبی اور خوبی سے انجام دیتے ہیں، کچھ لوگوں میں دوستی ہو جاتی ہے، جن میں دوستی نہیں ہوتی وہ بھی ہنسی خوشی کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں، مگر یہ سب جانتے ہیں کہ ان کی اجتماعی زندگی کا اصول انفرادی آزادی ہے اور ہر ایک کو اس آزادی کا بوجھ اٹھا سکنا چاہیئے۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ پر صحیح اور اچھی ہیں، ان پر عمل کرنے سے بہت اچھے نتیجے نکلے ہیں، اگرچہ جس میں جتنا زیادہ حر

اتنا ہی وہ اپنی بے پناہ تنہائی کو محسوس کرتا ہے۔

ہجوم اور ہنگاموں میں افراد کو تنہائی کی جو تکلیف ہوتی ہے وہ مجھے اس سفر میں خاص طور پر نظر آئی، اس لئے کہ اس مرتبہ ایک محدود حلقے میں کافی عرصہ تک رہنے کا موقع ملا۔ میرا قیام شام کے سات بجے سے صبح نو بجے تک ایک چھوٹے سے ہوٹل میں رہتا تھا۔ وہاں ایک روز کھانے کے وقت ایک پچاس پچپن برس کی خاتون میرے سامنے آکر بیٹھ گئیں، کہا کہ میں آپ کی شکل اور لہجے سے سمجھ گئی کہ آپ ہندوستانی ہیں، میرے شوہر کراچی میں پیدا ہوئے تھے اور اس نسبت سے مجھے ہندوستان سے بڑی دلچسپی ہے، میں نے جواب دیا کہ میں شکل سے یہودی یا اٹلی یا جنوبی امریکہ کا باشندہ سمجھا جاتا ہوں اور میرے لہجے میں کوئی ایسی خصوصیت نہیں ہے جس کی وجہ سے میں خالص انگریز نہ مانا جاؤں! اس طرح اختلاف کا سلسلہ شروع ہوا جس کی شدت کے ساتھ رفتہ رفتہ بڑی بی کی بے تکلفی بڑھتی رہی۔ کچھ مذہب کی بات ہوئی تو انھوں نے کہا کہ آپ عیسائی مذہب کے بارے میں کیا جانیں، آپ تو گمراہ ہیں، پھر ایک مرتبہ گویا بھولے سے انھوں نے کہہ دیا کہ آپ بڑے بیوقوف ہیں۔ جب انھیں یقین ہو گیا کہ مجھے ایسے مذاق پر کوئی اعتراض نہیں ہے تو انھوں نے اپنا سارا حال سنایا، اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ ایک مدت سے ایسے شخص کی تلاش میں ہیں جس سے وہ کہہ سکیں کہ تم بڑے بیوقوف ہو اور میں بھی بڑی بیوقوف ہوں۔ وہ ایک بینک میں اچھے عہدے پر ملازم تھیں۔ ان کا جوان لڑکا دینیات کے ایک مدرسے میں تعلیم پا رہا تھا، ان کے ملاقاتیوں کی تعداد خاصی تھی، مگر ایسا کوئی نہ تھا جو فی سبیل اللہ ان کی اُلٹی سیدھی باتیں سنے انھیں تنہائی کے احساس کو دور کرنے کا موقع دے۔ انسٹی ٹیوٹ کے ایک استاد نے بھی میرے ایسے ہی تعلقات ہو گئے، انھوں نے بھی فی سبیل اللہ مجھے اپنی زندگی کے سارے حالات سنائے اور ایک مرتبہ یہ بھی بتا دیا کہ ان کے والد کے کسی خاتون سے تعلقات تھے۔ اور اس بنا پر کہ باپ کو بیٹے سے کچھ چھپانا نہ چاہیئے ان کے والد نے ان خاتون سے ان کی ملاقات کرائی۔ ایک اور استاد نے جن کی بیوی انھیں چھوڑ کر چلی گئی تھیں اس علیحدگی کی وجہ تفصیل سے سمجھائی۔ امریکہ میں جو میاں بیوی میرے میزبان تھے وہ بھی اپنی اپنی جگہ تنہائی میں مبتلا تھے۔ دونوں خوش مزاج تھے دونوں کو اچھی تنخواہیں مل رہی تھیں، بظاہر کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ ایک دوسرے سے، زندگی سے اور دنیا سے

خوش نہ ہوں۔ بیوی کو شکایت تھی کہ ان کے ماں باپ تعلیم یافتہ نہیں ہیں اور علمی گفتگو نہیں کر سکتے۔ شوہر کہتے تھے کہ ان کے بھائی بہنوں کو علم اور تعلیم سے کوئی شوق اور کوئی مناسبت نہیں ہے۔ مگر اس کا اثر یہ نہیں ہوا تھا کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے اور قریب آجائیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا انھیں اپنے کام کی وجہ سے ایک دوسرے سے بات کرنے اور دوسرے کو خوش رکھنے کی مہلت ہی نہیں۔ جامعہ میں لوگوں کی شکایتیں سنتے سنتے شاید میری صورت کچھ ایسی ہوگئی ہے کہ بعض اجنبی بھی مجھے دیکھ کر میرے خاص منصب کو تاڑ جاتے ہیں۔ بہرحال مجھے کسی کے ذاتی معاملات سے مطلب نہیں تھا، نہ انھیں معلوم کرنے کی خواہش تھی۔ میرے ساتھ جو کچھ پیش آیا اس سے اس علمی تحقیق کی تصدیق ہوتی ہے کہ مغربی تہذیب کے حالات اور آداب نے انسان کو بالکل تنہا کر دیا ہے، اور جس کسی کے انداز سے ظاہر ہو کہ وہ توجہ اور ہمدردی سے سننے پر تیار ہے اسے تنہائی کی ہزاروں شکایتیں سننے کو مل جائیں گی۔

(باقی آئندہ)

ساقیِ محفلِ صاحب نظراں

(ابوالکلامؒ کی یاد میں)

حضرت رَوِش صدیقی

خامشی، تمکنتِ کوہِ گراں کی صورت
گفتگو، زمزمۂ جوئے رواں کی صورت

خلوتِ حسنِ یقیں تھی تری محفل کہ جہاں
نظر آتی ہی نہ تھی وہم و گماں کی صورت

ترے ایثار نے پھونکا ہے کچھ ایسا افسوں
زندگی بھول گئی سود و زیاں کی صورت

اِک نفس، معتکفِ منزلِ آرام و سکوں
اک نفس، قافلۂ دردِ نہاں کی صورت

اک نفس، مشعلہ افروزِ حریمِ دانش
اک نفس، شمعِ خراباتِ فغاں کی صورت

تو نے اس طرح اٹھایا رخِ دوراں کا نقاب
بول اٹھی مُنہ سے بہار اور خزاں کی صورت

اک نظر تشنگیٔ صبحِ ازل کی تصویر
اک نظر سلسلۂ رطلِ گراں کی صورت

اک نظر شورشِ وطوفانِ بغاوت کا پیام
اک نظر ناقدِ آئینِ جہاں کی صورت
پختگی ، مدرسۂ حکمت خارا شکنی
نرمگی ، کارگہِ شیشہ گراں کی صورت
سادگی، چشمِ غزالیں کے لئے آئینہ
برہمی ، شعلۂ رخسارِ بتاں کی صورت
وہ صداقت کا جلال اور محبت کا جمال
چادرِ ابر میں خورشیدِ رواں کی صورت
ہمہ اسرارِ دل آرائی و دل باختگی
تجھ سے مانوس، دلِ ہم نفساں کی صورت
تیرے افکار کا آئینہ، وہ کردار ترا
لالہ وگل کے لئے جوئے رواں کی صورت
جیسے اک معجزۂ جنبشِ لب یاد آئے
وہ دل آویز ، ترے حسنِ بیاں کی صورت
خود بہ خود لوحِ تخیل پہ ابھر آتی ہے
ساقئ محفلِ صاحب نظراں کی صورت
دور میں جب مہ و خورشید کا جام آتا ہے
اہلِ محفل کی زباں پر ترا نام آتا ہے

اسلام
وش

۲۲ ستمبر ۱۹۶۲ء

ارسطو کے سیاسی افکار

جناب ضیاء الحسن فاروقی

ارسطو (۳۸۴-۳۲۲ ق م) کی عظمت اس کی زندگی کے نشیب و فراز میں نہیں بلکہ اس کے افکار و خیالات میں تلاش کی جاتی رہی ہے، تقریباً دو ہزار سال تک سائنس اور فلسفہ کی دنیا پر اس کا فکری اقتدار قائم رہا اور ذہنی ترقی کی راہ مسدود رہی، سترھویں صدی کے آغاز میں جب صدیوں کے بند سوتے پھوٹے اور انسانی ذہن نئی پہنائیوں کے لئے بے چین ہوا تو اسے سب سے پہلے ارسطو کے اصولوں ہی سے برد آزما ہونا پڑا، عہد جدید کی غالباً تمام فکری ترقیاں اسی یونانی عالم کے کسی نہ کسی اصول کی تنقید کر شروع ہوتی ہیں اور اس میں اس کا کوئی قصور بھی نہیں تھا، قصور ان عالموں اور فلسفیوں کا تھا جنھوں نے اس طویل عرصے میں اس کے خیالات کی تنقید کا حوصلہ نہیں کیا۔

ارسطو کی زندگی ہنگامہ پرور زندگی نہیں تھی، اور نہ تو اس میں اخلاقی جرأت ہی تھی کہ جب اس پر بدعقیدگی اور عدم تقویٰ کا الزام لگایا گیا تھا تو سقراط کی طرح زہر کا پیالہ پینے کے لئے تیار ہو جاتا، سکندر اعظم کا وہ اتالیق ضرور رہا، مگر سکندر کی شخصیت عظمت اور کارناموں میں اس کی تعلیم و تربیت کا کوئی اثر نہیں ملتا، ہاں تعجب اس پر ہے کہ سکندر کا کوئی اثر ارسطو پر کیوں نہیں پڑا جسے اپنے شاگرد کی فتوحات سے یہ یقین ہو جانا چاہیئے تھا کہ اب شہری ریاستوں کا دور ختم ہو گیا تھا اور شہنشاہتیں قائم ہونے والی تھیں۔ ارسطو کے نزدیک شہری ریاستیں نمونے کی ریاستیں تھیں، اس کا خیال تھا کہ اعتدال بڑی برکت کی چیز ہے۔ اور کسی ریاست میں ایک لاکھ شہریوں سے زیادہ نہیں ہونے چاہئیں۔ اور یہ باتیں اس نے اس وقت کہیں جب سکندر مقدونی شہنشاہیت قائم کر رہا تھا۔

اس میں شبہ نہیں کہ ارسطو کا علم بہت وسیع، نظر بڑی نکتہ رس اور بصیرت اعلیٰ درجہ کی تھی، وہ ایک طبیب کا بیٹا تھا جو مقدونیہ کے بادشاہ کے دربار سے وابستہ تھا، اپنے باپ کی نگرانی اور رہنمائی میں اس نے

طب کی تعلیم حاصل کی، دوسرے طبیبوں سے بھی اس نے استفادہ کیا، طب کے علاوہ اس نے دوسرے مروجہ علوم کی بھی تحصیل کی اور اس میں اُسے اپنے والد کی خوشحالی اور امارت سے بہت مدد ملی، اس لیئے کہ باپ کی دولت سے وہ تعلیم سے متعلق تمام ضروری وسائل فراہم کرسکتا تھا۔ ۳۶۶ ق م میں جب اس کے باپ کا انتقال ہوا تو وہ ایتھنز آیا اور افلاطون کی اکادمی میں داخل ہوگیا، یہ وہ زمانہ تھا جب یونانی فکر کا تخلیقی دور اپنی آخری منزلوں میں تھا اور اس کا جو کچھ بھرم قائم تھا وہ درحقیقت اسی اکادمی سے تھا۔ یہاں وہ تقریباً بیس سال رہا، افلاطون کی وفات کے بعد وہ ایتھنز سے چلا گیا اور مقدونیہ اور دوسرے مقامات پر چند سال گذارنے کے بعد وہ ۳۳۴ ق م میں پھر ایتھنز آیا اور فلسفہ کا اپنا اسکول لی سےاُم (Lyceum) قائم کرکے درس دینا شروع کیا، بارہ سال تک وہ یہاں علم کا چراغ جلاتا رہا، ۳۲۲ ق م میں ایتھنز میں سیاسی انقلاب ہوا اور جو پارٹی برسرِ اقتدار آئی وہ مقدونیہ اور مقدونیہ والوں کے خلاف تھی، اس پارٹی نے اُس پر بدعقیدگی کا الزام لگایا، اور وہ نتائج سے خوفزدہ ہوکر بھاگ نکلا اور اسی سال اُسی کی موت واقع ہوئی۔

جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے، ارسطو کا علم بہت وسیع تھا اور اس کی شاہد وہ تحریریں ہیں جو ہم تک پہنچی ہیں، وہ ریاضی کے علاوہ علم کے تقریباً تمام گوشوں میں کامل دستگاہ رکھتا تھا، اس نے طبیعیات، مابعد الطبیعیات، علم الاخلاق، معاشیات، سیاسیات، جمالیات، طبیعیات اور عالمِ طبیعی کے ہر شعبہ سے متعلق اپنے خیالات پیش کیے اور اصولی بحثیں کیں، منطق کے علم کا تو وہ بانی تھا، خاص طور سے اس لحاظ سے کہ اس نے ان اصطلاحات کے مفہوم متعین کیے جن سے ہم آج بھی اصولی تفحص اور تجریدی تفکر میں کام لیتے ہیں، منطق کی دنیا اس زمانے میں بھی ارسطو سے بے نیاز نہیں ہوسکی ہے۔

اس مضمون میں ہم اس کے سیاسی افکار کا ایک جائزہ پیش کرنا چاہتے ہیں اس لئے ہمارا موضوع بحث اس کی مشہور کتاب 'سیاسیات' ہے جس کے بارے میں کچھ مبصروں کا خیال ہے کہ یہ اس کا شاہکار ہے' یہ خیال صحیح ہے یا غلط، یہاں اس سے بحث نہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ اس کی بنیاد پر ہم اُسے علم سیاسیات کا 'باوا آدم' کہہ سکتے ہیں۔

ارسطو کے متعلق ایک نظریہ یہ ہے کہ اس کے فلسفے کو سمجھنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ افلاطون اور

اس کے طرزِ فکر کے بنیادی اختلاف کو سمجھا جائے، ایک حد تک یہ بات صحیح ہے، لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ ارسطو کے خیالات میں "افلاطونیت" کا کوئی اثر نہیں، سخت غلطی ہوگی، تقریباً بیس سال تک وہ افلاطون کی اکادمی کا ممبر رہا، افلاطون سے اُس کے بہت قریبی تعلقات تھے، افلاطون اسے اپنے مکتب خیال کے ذہن سے تعبیر کرتا تھا، ایسی صورت میں وہ اپنے استاد سے کتنا متاثر ہوا ہوگا، اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، اس کے فلسفیانہ افکار میں "افلاطونیت" کے خدوخال اس حد تک سموئے ہوئے ہیں کہ کسی بڑے فلسفی کے یہاں کسی دوسرے مفکر کے افکار کا اتنا اثر نہیں ملتا، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ارسطو اپنے استاد کے ہر اصول سے متفق بھی نہیں تھا، یہی نہیں بلکہ جہاں جہاں اُس نے اختلاف کیا ہے، اتنی شدت سے کیا ہے کہ بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ دونوں مفکرین کا فکر ایک دوسرے کی ضد ہے۔

ارسطو نے اپنی کتاب "سیاسیات" سلسلہ وار نہیں لکھی، جرمن عالم یےگر کا خیال ہے کہ اس کی تصنیف کے دو دور ہیں، اس کا دوسرا، تیسرا، ساتواں اور آٹھواں حصہ اس وقت لکھا گیا جب ارسطو افلاطون کی وفات کے بعد اکادمی چھوڑ کر ایتھنز سے چلا گیا تھا، دوسرے اور تیسرے حصے میں اس نے عینی ریاست اور اس سے متعلق پچھلے نظریات سے بحث کی ہے، اور اس سلسلہ میں افلاطون کی عینیت پر تنقید بھی کی ہے۔ اس نے ریاست اور شہریت کی ماہیت کی بحث بھی چھیڑی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس بحث کے بعد وہ عینی ریاست سے متعلق اپنے خیالات پیش کرنا چاہتا ہے۔ ساتواں اور آٹھواں حصہ عینی ریاست کی تشکیل اور اس کے امکانات کے بارے میں ہے، چوتھا، پانچواں اور چھٹا حصہ جو یےگر کے خیال میں لے سی ام کے قیام کے بعد کی تصنیف ہیں، عینی ریاست کے تصورات سے خالی ہیں اور ان میں اس نے موجودہ ریاستوں اور ان کی مختلف شکلوں کی داستان بیان کی ہے اور ان کے انحطاط اور زوال کے اسباب اور دستور اور ریاست کے استحکام کے ضروری لوازمات کا نقشہ چھیڑ دیا ہے، پہلا حصہ سب سے آخر میں لکھا گیا اور یہ ایک طرح سے پوری کتاب کی تمہید ہے۔ یےگر کا خیال ہے کہ اگر بعد میں کتاب پر نظرِ ثانی کی گئی ہوتی تو کتاب میں ترتیب اور موضوعات میں ربط قائم ہو جاتا اور پڑھنے والے کو بار بار محض تکرار

لہ سیبائن، A HISTORY OF POLITICAL THEORY، ہنری ہولٹ اینڈ کمپنی، نیویارک، ۱۹۵۰ء

بحوالہ یےگر، ARISTOTLES.

سے دوچار نہ ہونا پڑتا" لیکن اگر ہم اسے ایک ایسی تصنیف مان لیں جس میں ایک دور کے خیالات نہیں بیان کئے گئے ہیں بلکہ 'مختلف دوروں کے' اور تصنیف کے دوران میں مصنف کے ذہن میں ایک خاص نظریۂ علم نشوونما پاتا رہا ہے تو بہت سی مشکلیں آسان ہوجاتی ہیں اور ہم ارسطو کی قدر شناسی کا حق بہتر طریقے سے ادا کرسکتے ہیں۔[1]"

ارسطو سوفسطائیوں کے اس نظریے کا مخالف تھا کہ سیاسی معاشرہ کے ادارے فطری نہیں ہوتے بلکہ روایت کی گود میں جنم لیتے ہیں۔ وہ افلاطون کے اس خیال سے متفق ہے، اور اپنے سیاسی تفکر کا آغاز اسی سے کرتا ہے کہ اجتماعی زندگی یا ریاست کا آغاز انسانی حاجتوں سے ہوتا ہے، لیکن وہ ریاست جو محض حاجتیں پوری کرے "سوروں کا شہر" ہے۔ ارسطو بھی اجتماعی زندگی کا اصل مقصد اچھی زندگی کا قیام بتاتا ہے، لیکن وہ ریاست کے سلسلہ میں اس کے نامیاتی پہلو کو نظر انداز نہیں کرتا "زندگی کی ضرورتوں کی بنا پر خاندان بنتے ہیں جس میں مرد اور عورت اور آقا اور محکوم مختلف ضرورتوں کی بنا پر ایک دوسرے سے متعلق ہوتے ہیں، لیکن جب بہت سے خاندان متحد ہوجاتے ہیں اور اس اتحاد کا مقصد روزمرہ کی حاجتیں پوری کرنے کے علاوہ کچھ اور بھی ہوتا ہے۔ تو معاشرہ کی جو شکل ظاہر ہوتی ہے وہ گاؤں ہوتا ہے، اور جب کئی گاؤں متحد ہوکر ایک مکمل جماعت بن جاتے ہیں جو خاصی بڑی اور تقریباً خود مکتفی ہوتی ہے تو ریاست وجود میں آتی ہے۔ اس طرح ریاست کا ظہور زندگی کی ضروریات کا رہین منت ہوتا ہے لیکن یہ قائم اُسی صورت میں رہتی ہے جب مقصود ایک اچھی زندگی کی تشکیل ہو۔ اس بحث سے ارسطو کا مقصد یہ ہے کہ وہ یہ بتائے کہ ریاست ایک فطری مظہر ہے اور "انسان فطرتاً ایک حیوان سیاسی ہے"۔ لیکن ریاست میں ایک 'غیر فطری' عنصر بھی شامل ہے اور اسی وجہ سے ریاست کی شکلیں بدلتی رہتی ہیں اور انقلابات رونما ہوتے رہتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ ریاست کی بحث میں اخلاقی بحثیں بھی آجاتی ہیں۔ یہ 'غیر فطری' عنصر انسان کا خیر و شر کا شعور ہے جو دوسرے مل جل کر رہنے والے جانوروں میں نہیں ہوتا۔ انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ اپنے معیاروں کے مطابق اجتماعی زندگی کی تشکیل کرے۔

---

[1] پروفیسر محمد مجیب، 'تاریخ فلسفۂ سیاسیات' ہندستانی اکیڈیمی، الہ آباد، ۱۹۳۶ء، صفحہ ۶۰ بحوالہ

یے گر، ARISTOTELES

وہ معیار کیا ہوں اور اچھی زندگی کا شوق کس طرح پورا ہو۔ بنیادی طور پر یہی وہ مباحث ہیں جن پر ہر زمانے میں ہر سیاسی مفکر نے اپنے خیالات پیش کئے ہیں اور یہ بحث آج بھی جاری ہے اور اس وقت تک جاری رہے گی جب تک انسان اس کائنات کا ایک فعال عنصر ہے۔

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب دیکھئے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں

ارسطو اس حقیقت سے واقف تھا کہ ریاست سیاسی نظام یا حکومت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی، چاہے وہ کسی طرز کی حکومت ہو لیکن وہ استبدادی حکومت کے مقابلہ میں، خواہ وہ کسی فلسفی بادشاہ کا روشن خیال اور وسیع النظر استبداد ہی کیوں نہ ہو، دستوری حکومت کو ترجیح دیتا ہے۔ اسی لئے وہ افلاطون کے اس نظریے کا جو اس نے اپنی کتاب نوامیس (Laws) میں پیش کیا ہے۔ شروع ہی سے قائل ہے یعنی یہ کہ اچھی ریاست وہی ہے جہاں قانون کی فرمانروائی ہو اور کوئی شخص خواہ وہ کتنا ہی بڑا مدبر اور دانشمند کیوں نہ ہو قانون سے بالاتر نہ ہو۔ یہی اس کی عینی ریاست ہے اور قانون کی فرمانروائی ہی کو وہ اپنی عینی ریاست کا اصل وصف تصور کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ دستوری حکومت میں حکمراں کا اپنی رعایا سے جو تعلق ہوتا ہے وہ آقائی اور محکومی کی اور نوعیتوں کے مقابلہ میں مختلف ہوتا ہے کیونکہ اس میں دونوں فریق پابند بھی ہوتے ہیں اور آزاد بھی اور اس وجہ سے ایک متوازن قسم کی مساوات قائم رہتی ہے۔ ارسطو کے نزدیک مساوات انصاف ہے اور انصاف مساوات کا نام ہے۔ اگر ریاست اس انصاف سے محروم ہو جائے تو پھر اس کا انتشار شروع ہو جاتا ہے۔ اور یہ انصاف وہیں قائم ہو سکتا ہے جہاں قانون کی حکمرانی ہو، اس طرح کا سیاسی نظام اُس اقتدار و اختیار سے مختلف ہوتا ہے جو خاندان کے بزرگ کو خاندان والوں پر یا غلاموں پر ان کے آقاؤں کو حاصل ہوتا ہے۔ ارسطو کا خیال ہے کہ افلاطون کی یہ بڑی غلطی تھی کہ اس نے ریاست کو ایک بڑے خاندان سے تعبیر کیا اور خاندان کے اقتدار اور سیاسی اقتدار کے فرق کو سمجھنے میں ناکام رہا، یہی وجہ ہے کہ وہ افلاطون کے اس خیال سے متفق نہیں ہے کہ قانون کی حکومت اور دانشمند حکمرانوں کی حکومت ایک ہی درجہ کی چیزیں ہیں۔ بڑے سے بڑا دانشمند حکمراں بھی قانون سے نہ تو بے نیاز ہو سکتا ہے اور نہ اس کے بغیر کام چلا سکتا ہے کیونکہ قانون میں ایک لاشخصی (Impersonal) وصف ہوتا ہے جسے کوئی

شخص خواہ وہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو، حاصل نہیں کرسکتا۔" قانون عقل کی اس حالت کا نام ہے جب کہ اس پر خواہشات کا بُرا اثر نہ پڑا ہو۔ قانون کا اختیار جو جذبات سے معرّی ہوتا ہی مجسٹریٹ کی جگہ نہیں لیتا لیکن مجسٹریٹ کے اختیار میں اخلاقی وصف کا رنگ بھرتا ہی، قانون کی فرمانروائی کے طفیل رعایا کا وقار قائم رہتا ہی جبکہ شخصی حکومت میں معاملہ برعکس ہوتا ہی، دستوری حکومت کے موجودہ نظریوں سے کس قدر مطابق ہی ارسطو کا یہ نقطۂ نظر، یہ اور بات ہی کہ آج بھی حقیقت میں وہی لوگ حکمراں ہیں جو اپنے حق میں رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے پناہ وسائل رکھتے ہیں اور حکمراں طبقہ کی حیثیت سے عوام کے آزاد ارادوں کے اظہار کا موقع نہیں دیتے۔

ارسطو کے نزدیک دستوری حکومت کا ایک خاص مفہوم تھا، اس نے اس کے تین پہلو بتائے ہیں: اول یہ کہ اس سے یہ مقصود نہیں ہوتا کہ کسی خاص فرد یا طبقہ کے مفاد کے حق میں کسی مُستبد یا کسی طبقہ کی حکومت قائم کی جائے بلکہ اس کا مطمح نظر مفاد عامہ ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ حکومت کا کاروبار مسلمہ قاعدوں کے مطابق ہو اور مطلق العنانی کا اس سے کوئی تعلق نہ ہو۔ اور تیسرے یہ کہ دستوری حکومت کا مطلب یہ ہوتا ہی کہ یہ رضامند اور مطمئن رعایا کی حکومت ہی، کسی جابر حکمراں کے جبر کا پنجہ اس پر نہیں ہی۔ اس نے دستوری حکومت کی ان تین خصوصیات کا ذکر وضاحت سے کیا ہی لیکن انھیں کسی خاص سسٹم کے مطابق جانچا نہیں ہی اور یہ بھی نہیں بتایا ہی کہ اس کے علاوہ اور کوئی خصوصیت ہوسکتی ہے یا نہیں، اُسے اس بات کا احساس تو تھا کہ ہوسکتا ہی دستوری حکومت میں بیک وقت یہ تینوں خصوصیات موجود نہ ہوں مثلاً ایک مستبد حکمراں، ہی جو مطلق العنانی سے حکومت کرتا ہے لیکن وہ جو کچھ بھی کرتا ہے مفاد عامہ کے حق میں کرتا ہی، یا یہ کہ حکومت تو دستوری ہی مگر ناانصافی اپنا شعار بنائے ہوئے ہے اور ایک خاص طبقہ کے مفاد کا زیادہ خیال رکھتی ہی، لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس نے دستوری حکومت کی کبھی باقاعدہ تعریف نہیں کی۔

افلاطون نے نوامیس (Laws) میں کہا تھا کہ قانون کی اہمیت کو محض دفع الوقتی کے لئے نہیں تسلیم کرنا چاہیئے بلکہ مہذب اور اخلاقی زندگی بسر کرنے کے لئے ناگزیر تصور کرنا چاہیئے۔ ارسطو نے اپنے استاد کے مشورہ سے اتفاق کیا، سیاسیات میں اس نے ایک جگہ لکھا ہی اور افلاطون ہی کے قول کو دہرایا ہے: "انسان، اگر کامل ہو جائے، تو بہترین حیوان ہی، لیکن اگر قانون اور انصاف سے اسے کوئی واسطہ نہ ہو، تو وہ بدترین مخلوق ہی۔"

عینیت کی سطح سے اتر کر حقیقت کی دنیا میں اگر موجودہ اداروں اور ریاستوں کی رسم وروایات کی روشنی میں مجرد اصولوں کو پرکھا جائے تو مشکلات اور تضادات کا سامنا ہوتا ہے، افلاطون کی قسم کے عینیت پرست حقائق کی پروا کیے بغیر فلک پیمائی کرتے رہتے ہیں، یہ انتہا پسندانہ رویہ ہوتا ہے لیکن ارسطو خوابوں کی دنیا کا باشندہ نہیں تھا، اس لئے اس کے یہاں اعتدال اور اصلاح پسندی کے رجحان ملتے ہیں، وہ تاریخ کو جو صدیوں پر پھیلے ہوئے انسانی تجربات کا خزانہ اپنے دامن میں رکھتی ہے، اصول ارتقا کو جو کائنات کے نظام میں کارفرما ہے، انسانی نفسیات کو جو فرد اور جماعت کے انداز اور کردار پر اثر انداز ہوتی رہتی ہے اور انسانوں کی عقل سلیم کو بہت زیادہ اہمیت دیتا ہے ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ اس کے خیالات میں اس رجحان کی جھلک ملتی ہے کہ آئیڈیل ایک موثر طاقت ہے اور واقعی زندگی اور موجود حالات میں اس کی اثر آفرینی اور متحرک قوت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ احوال وحقائق کی دنیا میں بھی یہ فعال اور زندہ رہتا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ ارسطو نے اس نکتہ کی وضاحت نہیں کی اور آنے والی نسلوں کے لئے سوچنے کا ایک موضوع دے دیا۔ اور غالباً وہ اس کی وضاحت کر بھی نہیں سکتا تھا اس لئے کہ اس کی مشکل یہ تھی کہ افلاطون سے آسے جو سیاسی آئیڈیل ملا تھا اس میں یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ شہر (ریاست) اور شہری دو لازم وملزوم اصطلاحیں ہیں، اس کی وجہ سے اس کے سامنے تین سوال ابھرے: ریاست کیا ہے؟ شہری کیا ہے؟ کیا ایک نیک آدمی کے اوصاف وہی ہوتے ہیں جو ایک اچھے شہری کے ہوتے ہیں؟ ریاست انسانوں کی جماعت ہے جس کا مقصد بہترین اخلاقی زندگی کا ساز وسامان فراہم کرنا ہے، انسانوں کی ایک جماعت ہے اور یہ جماعت مشترک طور پر جس قسم کی زندگی گذارے گی اس سے اندازہ ہوگا کہ کس قسم کے انسانوں سے وہ جماعت بنی ہے اور وہ کیا مقاصد ہیں جنھیں وہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اور اسی طرح اس کے بالمقابل یہ کہا جا سکتا ہے کہ ریاست کے مقصد سے اس کا تعین ہوتا ہے کہ اس کے افراد کس قسم کے لوگ ہو سکتے ہیں اور الگ الگ وہ کس قسم کی زندگی بسر کر سکتے ہیں، اس نظریئے کے مطابق دستور نظام زندگی کا نام ہے اور حکومت اور اس کی شکل درحقیقت اس نظام زندگی کی آئینہ دار ہے جسے ریاست قائم کرنا چاہتی ہے۔ اس سے ارسطو یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ

"جب حکومت کی شکل بدل جائے اور کوئی نئی شکل اختیار کی جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ریاست وہ نہیں رہی جو پہلے تھی..... نظام حکومت بدلنے کے معنی یہ ہیں کہ سیاسی زندگی کے اصول اور مقاصد بدل گئے۔"[۱] قانون، دستور، ریاست، نظامِ حکومت ــــــ اس منزل میں سب ہی ایک دوسرے سے گلے ملتے ہوئے نظر آتے ہیں کیونکہ اخلاقی نقطۂ نظر سے سب کا تعلق اس مقصد سے ہے جس کے سہارے انسانوں کی یہ جماعت زندہ ہے۔

اس بحث سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ارسطو کی نظر اس حقیقت سے کبھی نہیں ہٹتی کہ تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، ریاستوں کے دستور میں خامیاں ضرور ہوتی ہیں اور ان کی شکلیں بدلتی رہتی ہیں، افلاطون سے اگر پوچھا جاتا کہ ریاستوں کے دستور میں کیا خامیاں ہوتی ہیں اور کیوں ہوتی ہیں تو وہ یہ جواب دیتا کہ پہلے خیر کے تصور کو سمجھنے کی کوشش کرو، اگر تم نے اسے سمجھ لیا تو تم کو اس سوال کا جواب مل جائے گا۔ لیکن پہلے خیر کے تصور کا ادراک کیا جائے اور پھر اس پیمانے سے موجود ریاستوں اور واقعی زندگیوں کو جانچا جائے، یہ طرزِ استدلال ارسطو کو قبول نہیں، اس کے خیال میں پہلے موجود ریاستوں کا مشاہدہ کرنا چاہیے پھر یہ امتیاز ہو سکتا ہے کہ کون سی ریاست اچھی ہے اور کون سی بُری، اچھا آدمی ایک اچھا شہری ہو یہ اسی وقت ممکن ہے جب ریاست آئیڈیل ہو۔

نظام حکومت کی تبدیلی کے ساتھ ریاست کی شکل بھی بدل جاتی ہے، اسی ضمن میں اس نے اس بات کی بھی بحث کی ہے کہ ریاستیں کتنے قسم کی ہوتی ہیں، ظاہر ہے کہ ریاستوں کی قسموں کا تعین کسی معیار کے مطابق ہونا چاہیے۔ لہٰذا اس معیار کے مطابق کہ حکومت کے مدنظر مفاد عامہ ہے یا ان مفاد کی تعداد کم ہے یا زیادہ ارسطو نے ریاستوں کی تین صحیح شکلیں اور تین بگڑی ہوئی مثالی شکلیں قرار دیں۔ بادشاہی (Monarchy)، اشرافیہ (Aristocracy) اور معتدل جمہوریت (Polity)، یا دستوری حکومت صحیح شکلیں ہیں، مطلق العنان بادشاہی (Tyranny) ... (Oligarchy)، اور جمہوریت مطلق (Extreme Democracy) ...

[۱] تاریخ فلسفۂ سیاسیات، صفحہ ۹۱۔ [۲] ... ارسطو ...

ارسطو کو احساس تھا کہ ریاستوں کی تقسیم اس نہج پر کرنے سے، ان کی الگ الگ خصوصیات بتلانے میں مشکلات کا سامنا ہوگا کیونکہ سب سے پہلے یہ سوال اٹھتا ہے کہ اقتدار کے حقدار کون ہیں اور کن لوگوں کے ہاتھ میں تمام اقتدار ہونی چاہیئے۔ عام طور پر لوگ چند سری حکومت کو امیروں کی حکومت تصور کرتے ہیں بالکل اسی طرح جیسے جمہوریت، غریبوں کی حکومت سمجھی جاتی ہے، یہ صحیح ہے کہ غریبوں کی تعداد اور زیادہ ہوتی ہے اور امیر کم ہوتے ہیں لیکن تعداد کا یہ اضافی فرق ریاست کی ان دونوں قسموں پر دلالت نہیں کرتا، اصل معاملہ یہ ہے کہ اقتدار کے استحقاق کے دو نمایاں پہلو ہیں: ایک کا تعلق ملکیت کے حقوق سے ہے اور دوسرے کی بنیاد زیادہ سے زیادہ تعداد میں عام انسانوں کی فلاح و بہبود پر ہے۔

ارسطو اس کا منکر نہیں ہے کہ نجی ملکیت کا تصور بہت قوی ہے۔ وہ نجی ملکیت کے تصور کا مخالف بھی نہیں ہے لیکن وہ جائداد یا دولت کو ایک ذریعہ تصور کرتا ہے اچھی زندگی کے قیام کے لئے، اس کے خیال میں دولت جمع کرنا بعینہٖ کوئی مقصد نہیں ہونا چاہیئے، دولت کے احتکار کی کوئی مناسب حد ہونا چاہیئے ورنہ اس سے ریاست کے اس مقصد کے حصول میں کہ اچھی زندگی بسر کرنے کا ساز و سامان فراہم کیا جائے، [illegible] پیدا ہوگی۔ دولت کے لامحدود احتکار کو، خواہ اس کی کوئی شکل ہو، وہ ریاست کے استحکام کے لئے [illegible] تصور کرتا ہے اور اسی سلسلہ میں وہ متنبہ کرتا ہے کہ امیر اور غریب کا فرق اگر بہت بڑھ جائے گا تو ریاست [illegible] فساد پیدا ہوگا۔ ہر ریاست میں تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں: ایک طبقہ بہت امیر ہوتا ہے، دوسرا [illegible] غریب، اور ایک طبقہ یعنی تیسرا متوسط حیثیت کا۔ یہ مانی ہوئی حقیقت ہے کہ اوسط، یا اعتدال، [illegible] ہے اور اس لئے واضح ہے کہ اعتدال کے ساتھ خوشحال اور امیر ہونا اچھا ہے کیونکہ اس صورت حال [illegible] انسان عقل و ہوش سے محروم نہیں ہوتا، لیکن وہ جو حسن، طاقت، خاندانی نجابت یا دولت کے لحاظ [illegible] قوی اور دوسروں سے بڑھ کر ہوتا ہے، یا برخلاف اس کے وہ جو بہت غریب یا بہت کمزور یا [illegible] زیادہ ذلیل و حقیر ہوتا ہے، اپنے لئے دشوار پاتا ہے کہ عقل کی رہنمائی قبول کرے۔[1]

ارسطو کے نزدیک امیر طبقہ کا رجحان یہ ہوتا ہے کہ وہ فرمانبرداری نہیں کر سکتا اور اگر حکومت [illegible] ہاتھ میں ہوگی تو وہ مطلق العنان حکومت ہوگی، غریبوں کا طبقہ چونکہ دوسری انتہا پر ہوتا ہے

---

[1] ارسطو، سیاسیات۔

اس لئے وہ یہ نہیں جانتا کہ حکمرانی کسے کہتے ہیں لہٰذا اُسے غلاموں کی طرح محکوم ہونا چاہیئے، اس طرح ان دو طبقوں پر مشتمل جو ریاست بنے گی وہ آزاد انسانوں کی نہیں بلکہ آقاؤں اور غلاموں کی حکومت ہوگی امیر غریبوں سے نفرت اور غریب امیروں سے رشک و حسد کریں گے اور اس لئے رفاقت اور دوستی کی فضا نہیں پیدا ہو سکتی جو ریاست کی پائیداری کے لئے ضروری ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ارسطو نے دستور یا ریاست کی "خوبی کا معیار پائیداری کو قرار دیا ہے اور موجودہ زمانے کے خیالات کی رو سے یہ صحیح ہے"[۵]

ارسطو کا خیال تھا کہ ریاست وہی اچھی ہے جہاں ایسے لوگوں کی اکثریت ہو جو مساویانہ حیثیت کے حامل ہیں اور مادی معیار زندگی کے اعتبار سے ایک ہی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں، اور یہ متوسط طبقہ کے افراد ہوتے ہیں، ان میں آپس میں رشک و حسد نہیں ہوتا، کسی کو کسی سے خطرہ نہیں ہوتا اس لئے ظاہر ہے کہ بہترین سیاسی جماعت متوسط طبقہ کے لوگوں سے بنتی ہے اور ان ریاستوں میں اچھا انتظام ہونے کا امکان زیادہ ہے جن میں متوسط طبقہ بڑا ہو۔ اور اگر ممکن ہو تو دوسرے دونوں طبقوں کے مقابلہ میں زیادہ بڑا ہو، یا کم از کم ان میں سے کسی ایک سے بڑا ہو، کیونکہ متوسط طبقہ کسی ایک سے مل کر صورت حال کو بدل دے گا اور ان میں سے کسی ایک کو غلبہ حاصل کرنے کا موقع نہیں دے گا[۶] لیکن واقعات کی دنیا میں اس طرح کی صورت حال بہت کم وقوع میں آتی ہے۔ بہرحال متوسط طبقہ کی اشرافیہ جو دستوری حیثیت کی حامل ہو، ارسطو کی عینی ریاست کہی جا سکتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ایسی ریاست بھی جو بہترین اور قابلِ عمل ہے۔

یونان کی شہری ریاستوں میں انقلابات ہوتے رہتے تھے، ارسطو نے ان کے اسباب پر غور کیا اور سیاسی مظاہر اور تجربات کی روشنی میں ان کا تجزیہ کر کے ان کی روک تھام کے لئے کچھ طریقے بھی بیان کئے اس کا خیال تھا، اور واقعات نے ثابت کیا ہے کہ بہت بڑی حد تک اس کا خیال صحیح تھا، کہ مساوات کی خواہش ہی ہمیشہ بغاوت کا جھنڈا بلند کرتی ہے" جو کمتر ہوتے ہیں وہ اس نیت سے بغاوت کرتے ہیں کہ اوروں کے برابر ہو جائیں اور جو برابر ہوتے ہیں وہ اس غرض سے کہ برتر ہو جائیں۔ کیونکہ انہیں جو کچھ

---

[۵] تاریخ فلسفہ سیاسیات، صفحہ ۶۶ [۶] ارسطو، سیاسیات۔

ملتا ہے اُسے وہ اپنے حق سے کم سمجھتے ہیں۵۱"۔ کسی دستور کی یہ بھی ایک بڑی خامی ہوتی ہے کہ حکمرانوں اور حکمراں طبقوں کو اس کا موقع ملے، کہ وہ لالچ کو اپنا مسلک بنالیں اور محکوموں کے ساتھ بدسلوکی سے پیش آئیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ محکوم اُن کی مخالفت پر آمادہ ہوجاتے ہیں، انقلاب کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ کسی فرد یا کئی افراد کے ہاتھ میں اقتدار اس طرح آجائے کہ بادشاہی یا چند سری حکومت کے قائم ہونے کا خطرہ پیدا ہوجائے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مجرم افراد اپنی بدکاریوں پر پردہ ڈالنے کے لئے اس کی کوشش کرتے ہیں کہ ہنگامہ برپا کیا جائے، نسلی اختلافات، شخصی حکومتوں میں ذاتی عداوتیں اور جھگڑے یا ریاست کے کسی حصہ میں علاقائی، معاشرتی، معاشی یا کسی اور لحاظ سے، تناسب سے زیادہ اضافہ اور ترقی بھی ایسے اسباب ہیں جو انقلابات کا پیش خیمہ ہوتے ہیں۔

ارسطو نے انقلابات کو روکنے کی تدبیریں بھی بتائی ہیں، اس سلسلہ میں پہلی ضروری بات یہ ہے کہ رعایا میں قانون کی فرمانبرداری کا جذبہ باقی رہے، کبھی کبھی بے قاعدگی چپکے چپکے ہیئت اجتماعیہ میں رچ بس جاتی ہے۔ اور ریاست کو برباد کردیتی ہے، بالکل اسی طرح جیسے چھوٹے چھوٹے مستقل اخراجات خزانے کو خالی کردیتے ہیں۵۲۔ دوسری چیز یہ ہے کہ کوئی طبقہ جو حکومت میں شریک نہیں ہے، بدسلوکی کا نشانہ نہ بننے پائے بلکہ یہ ہونا چاہیئے کہ اس کے بااثر افراد کو ان کی حیثیت کے مطابق مرتبہ دیا جائے اور ان کی حیثیت کو تسلیم کیا جائے عوام میں حب الوطنی کا جذبہ کبھی ختم نہ ہو یہ بھی بڑی کارگر تدبیر ہے، اس کے علاوہ حاکموں کو اس کا موقع نہیں ملنا چاہیئے کہ وہ اپنے اقتدار سے ناجائز فائدہ اٹھاکر دولت کمائیں اور یہ اس طرح سے ہوسکتا ہے کہ دستور میں اس کے تدارک کے لئے دفعات موجود ہوں، اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ کسی ایک شخص یا اشخاص کی کسی جماعت کا اقتدار حد سے زیادہ نہیں بڑھنے پائے گا، اس کا بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ دولت کی تقسیم صحیح اور منصفانہ ہو، نابرابری کا فرق بہت نمایاں نہ ہو، اور ریاست کا معاشی ڈھانچہ ایسا ہو کہ غریبوں کو بھی صلاحیت پیدا کرنے اور ترقی کرنے کا موقع ملے۔ لیکن ارسطو کا خیال ہے کہ "ان تمام تدبیروں کے علاوہ جو میں نے بیان کی ہیں ایک اور تدبیر ہے جو دستور کے استحکام میں سب سے زیادہ ممد و معاون ثابت ہوتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ تعلیم طرز حکومت کے مناسب اور مطابق ہو لیکن یہی وہ اصول ہے جسے ہمارے زمانے میں عام طور پر نظر انداز کردیا گیا ہے"۔ افسوس

---

۵۱ تاریخ فلسفۂ سیاسیات، صفحہ ۶۷ ۵۲ ارسطو، سیاسیات۔ ایضاً

ہے کہ ہمارے ملک میں قومی یک جہتی اور جذباتی ہم آہنگی کا نعرہ بڑی شدت سے لگایا جاتا ہے لیکن ارسطو کے اس اصول پر جو درحقیقت اپنے اندر بنیادی سچائی رکھتا ہے، بہت کم توجہ دی جاتی ہے۔ ابھی حال میں قومی یک جہتی کے سلسلہ میں جو کانفرنس ہوئی تھی اُس میں انتشار اور فساد کی روک تھام کے لئے جن تدبیروں پر بہت زیادہ زور دیا گیا اُن کی حیثیت محض منفی تھی، ہمارا دستور اچھا ہے، ملک کی بھاری اکثریت اسے تسلیم کرتی ہے لیکن نظام تعلیم ایسا نہیں ہے جس میں اس کا امکان قوی ہو کہ نئی نسل کی تعلیم و تربیت دستور کی بنیادی خصوصیات کے مطابق ہو۔)

تعلیم طرزِ حکومت کے مزاج کے عین مطابق ہو، ارسطو کے خیال میں یہ اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب اس کا انتظام ریاست کی طرف سے ہو، معاشرہ ایک کل ہے اور شہری اس کے اجزاء ہیں، معاشرہ محفوظ نہیں رہ سکتا اگر اُس کے افراد کی اُس کے مقصد کے پیش نظر تعلیم و تربیت نہ کی جائے، اور "ارسطو نے تعلیم کا نصب العین یہ قرار دیا ہے کہ وہ فطرت، عادت اور عقل کو ہم آہنگ کر دے اور تینوں کو ریاست کے خاص رنگ میں رنگ دے۔"[۵۲]

تعلیم طرزِ تعلیم، شہریوں کی سیرت کی تربیت، ریاست کا دستور اور اس کا نصب العین وغیرہ ــــ درحقیقت یہ سب ایک ہی تسبیح کے دانے ہیں اور ارسطو کے سیاسی نظام فکر کا مطالعہ اسی وقت مکمل ہوگا جب سب کو ایک کل سمجھ کر جانچنے اور پرکھنے کی سعی کی جائے۔

اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بنیادی طور پر ارسطو کے سیاسی خیالات کا مقصد بھی یہ نہیں تھا کہ افلاطون کی طرح وہ کسی عینی ریاست کی تعمیر و تشکیل کا خواب دیکھے اور اس قسم کی خیال آرائی اس کے جینئس (Genius) کو راس بھی نہیں آ سکتی تھی۔ جس قدر بھی اس نے اپنے آزاد طرزِ فکر کو اپنے خاص رنگ میں متعین کرنے کی کاوش اور تحقیق اور مشاہدہ کی دنیا میں جد و جہد کی اسی قدر اس نے موجودہ دستوروں کو بیان کرنے اور اُن کا تجزیہ کرنے کی طرف زیادہ توجہ کی، اُس نے اور اُس کے شاگردوں نے ایک سو اٹھاون دستوروں اور اُن کی تاریخ کا مطالعہ کیا اور اس تحقیق و مطالعہ کا اُس کے فکر پر بڑا انقلابی اثر مرتب ہوا، اور اسی کا اثر تھا کہ اُس نے سیاسی نظریے کے ایک وسیع تر مفہوم کی طرف اشارہ کیا، اس کا کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے تجرباتی مطالعہ کو سیاسی اصولوں کے خالص فکری مطالعہ سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔

---

۵۲ تاریخ فلسفۂ سیاسیات، صفحہ ۷۳۔

شگفتہ بچّہ

حضرت سلام مچھلی شہری

(ٹیگور کے مشہور شاہکار گیتانجلی کی نظم نمبر ۶۱ سے متاثر ہو کر کہی گئی)

شگفتہ بچّے کی آنکھوں میں نیند چھائی ہے
کوئی بتائے یہ آخر کہاں سے آئی ہے
شگفتہ بچّے کی آنکھوں میں نیند کی راز
چمن بدوش بہاروں کی رہنے والی ہے
جبین پریوں کی اک خوشنما سی وادی میں
نسیم صبح کی رعنائیوں کی پالی ہے
وہ ایسی وادیٔ گلبار و گلفشاں ہے جہاں
سحر حسین اگر ہے تو شب حسین تر ہے
جہاں مناظرِ فطرت کا رقص ہوتا ہے
وہیں، پہاڑ کے دامن میں اس کا بھی گھر ہے!

(۲)

لبوں پہ موجِ بہاراں جو مسکرائی ہے
کوئی بتلائے یہ آخر کہاں سے آئی ہے
شگفتہ بچّے کے ہونٹوں پہ یہ ہنسی کی لکیر
جوان چاند کی اُن شوخیوں کی ہے تنویر
جو ابرپاروں کے پاؤں میں ڈال دیں زنجیر!

نگارِ صبح نے شبنم میں آنکھ جب کھولی
تو پاس ایک کلی مُسکرا کے یوں بولی
"میں صدقے آپ کے حسن و شباب پر جاؤں
یہ رنگ و نور کسی طفلِ نَو کو دے آؤں؟"
شگفتہ بچے کے ہونٹوں پہ یہ ہنسی کی کرن
عروسِ صبح کے خوابوں کا ہے سہانا پن!!

(۳)

شگفتہ بچے کی ایسی جو دلربائی ہے
کوئی بتائے یہ آخر کہاں سے آئی ہے؟
جب اس کی مادرِ مشفق جواں و رعنا تھی
تو خود بھی اپنی بہاروں کی ایک دنیا تھی
اُن ہی دنوں وہ کوئی رازِ دلنشیں پا کر
حسین چاند ستاروں پہ ڈالتی تھی نظر
حیات پرتوِ رنگیں تھی حسنِ دلبر کا!
شگفتہ بچے کا یہ حسن، یہ سلونا پن
ہے ایک عکسِ ضیا بارِ خوابِ مادر کا!!

آئینۂ حیرت

حضرت عبدالمجید حیرت

نوید آمدِ فصلِ بہار ہوتا ہے
وہ برگِ گل جو سرِ شاخسار ہوتا ہے
وہی شجر جو کبھی سایہ دار ہوتا ہے
خزاں کے دور میں بے برگ و بار ہوتا ہے
مجھے یہ ڈر ہے، کہیں آپ بھی انھیں میں نہ ہوں
جنھیں خزاں پہ گمانِ بہار ہوتا ہے
ابھی تو آپ کے صبر و ثبات کا دامن
خیال ہی میں فقط تار تار ہوتا ہے
یہ باغباں ہی جانے کہ کون سا موسم
شگفتِ گل کے لئے سازگار ہوتا ہے
نہیں بھی ملتا ہے آرام کم نصیبوں کو
اگرچہ سایۂ دیوارِ یار ہوتا ہے
وہ سرزمین جو سورج سے دور ہوتی ہے
وہاں تو شام ہی کا اعتبار ہوتا ہے
نفس نفس میں مشیخت کی جس سے بو آئے
وہ انکسار کوئی انکسار ہوتا ہے
خدا کی شان کہ جس کی نگاہ کچھ بھی نہ تھی
اب ان کا اہلِ نظر میں شمار ہوتا ہے
کسی کو ہم سے تعلق، نہ ہم سے ہمدردی
نظر نظر سے یہی آشکار ہوتا ہے

اُسی پہ قہر کی گرتی ہیں بجلیاں حیرت
جو ان کے لطف کا امیدوار ہوتا ہے

"انارکلی"

محترمہ وحیدہ نسیم (کراچی)

یاد میں تیری ہی راوی دیدۂ پر آب ہے
سینۂ لاہور میں تو ہی دلِ بے تاب ہے

تختِ مغلوں کا تھا تیرے رقص سے لرزہ کناں
تھی نظر تیری عنانِ قسمتِ ہندوستاں

حسن تیرا تھا قوی تر لشکرِ جرار سے
اکبرِ فاتح کو اندیشہ تیری رفتار سے

دے کے دھڑکن اپنی مغلوں کے دل خاموش میں
سو گئی تو آہ! سنگ و خشت کی آغوش میں

طائرِ بامِ محبت کا انوکھا تھا قفس
پتھروں میں رہ گیا گھٹ گھٹ کے تیرا ہر نفس

داد دیتے ہیں فرشتے اس بساطِ عشق کی
جس میں اک حرفِ تمنا کی ہو قیمت زندگی

خاموشی نے بخش دی تاریخ کو تیری زباں
مٹ کے تو نے دی محبت کو حیاتِ جاوداں

خاک میں مل کر چھپے جو یہ وہ تابانی نہیں
سلطنت فانی جہاں کی عشق، پر فانی نہیں

بال جو تھا تیرے دل کے شیشۂ شفاف میں
بن کے کانٹا رہ گیا وہ سینۂ انصاف میں

گونج اٹھا عدلِ جہانگیری کی ہر آواز میں
آہ وہ نغمہ جو تھا تیرے شکستہ ساز میں

اس طرح ڈوبا سفینہ تیرا ساحل بن گیا
ٹوٹ کر قسمت کا تارا ماہِ کامل بن گیا

رشتۂ دل جوڑ کر ہستی سے ناتا توڑنے
خواب بن کر آئی تو بے خواب کر کے چھوڑنے

ناز ہے ہندوستاں کو آج تیرے بخت پر
چین آیا ایک سلطاں کو نہ تجھ بن تخت پر

کی جہانگیری خلشِ دل کی مٹانے کے لئے
کھیل تھی نورجہاں تجھ کو بھلانے کے لئے

دل بہلنے کو جھکائی ہر جگہ اپنی جبیں
مٹ سکا لیکن نہ دل سے تیرا نقشِ اولیں

تخت سے بد دل شہنشاہی سے اکتائی ہوئی
کہہ رہی ہے آج بھی اک روح گھبرائی ہوئی

تا قیامت شکر گویم کردگارِ خویش را
آہ گر من باز بینم روئے یارِ خویش را

مغربی ایشیا کی
مُسلم ریاستوں میں فوجی انقلابات

جناب شاہ عبدالقیوم

یہ بات دلچسپ بھی ہے اور کچھ عجیب بھی کہ گذشتہ چند برسوں میں جتنے بھی فوجی انقلابات آئے ہیں اِن میں سے اکثر مغربی ایشیا کی مسلم ریاستوں میں آئے ہیں۔ فوجی انقلابات کا یہ سلسلہ ۱۸۸۱ء سے شروع ہوتا ہے جب مصری فوج کے کرنل اعرابی پاشا نے مصری حکومت کے داخلی معاملات میں انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اثرات کے خلاف احتجاج کیا اور سرکاری ملازمتوں اور عہدوں میں عربوں کے جائز حقوق کی مانگ کی، ملک کی دولت اور تمام ذرائع آمدنی پر غیر ملکیوں کے تسلط کے خلاف جدوجہد کی، لیکن آپس کی نااتفاقی، فوجی تنظیم کی کمزوری اور اسلحہ کی کمی کے باعث انگریزوں کی منظم اور بے پنا طاقت کا مقابلہ نہ کر سکا اور اپنے ہی ملک میں غیروں کے سامنے جھکنا پڑا۔

اس کے بعد ترکی میں ۱۹۰۸ء میں "ینگ ٹرکس" کی تحریک نے خود غرض اور سخت گیر سلطان عبدالحمید کو دوبارہ دستوری حکومت قائم کرنے پر مجبور کیا۔ اس کے بعد پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر مصطفیٰ کمال اتاترک نے کمزور بنیادوں پر ٹھہری ہوئی عثمانی سلطنت اور خلافت کو ختم کر کے مغربی طرز کی جمہوری حکومت کی بنا ڈالی۔

عراق میں ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۱ء تک سات بار فوجی حکومتیں قائم ہوئیں جن میں راشد علی گیلانی کی وہ تحریک زیادہ مشہور ہے جس کا ایک مقصد جرمنی کی حمایت تھا۔

اسی طرح شام میں ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۴ء تک پے درپے پانچ مرتبہ فوجی حکومتیں قائم ہوئیں جن میں کرنل زعیم، کرنل حنّادی اور کرنل ادیب شیشکلی کے انقلابات کی داستانیں ابھی تازہ ہیں۔

اسی زمانے میں (جولائی ۱۹۵۲ء) کرنل ناصر اور جنرل نجیب کی قیادت اور سرپرستی میں مصر کا شاندار انقلاب" رونما ہوا، جس نے شاہ فاروق کو دیس نکالا دیا اور عدل و مساوات کی بنیادوں پر ایک نئے

نظام کی بشارت دی۔

جولائی ۱۹۵۸ء میں بریگیڈیر قاسم کی سرپرستی میں عراقی فوج نے شہنشاہیت کو ہمیشہ کے لئے مٹادیا۔ شاہ فیصل، نوری سعید اور دیگر سامراج نوازوں کو ختم کرکے حکومت کی ذمہ داریاں فوجی افسران کے سپرد کردیں۔

اسی سال ۷ اکتوبر کو جنرل ایوب نے پاکستان کے نااہل اور خودغرض حکمرانوں کو سیاسی اقتدار سے معزول کرکے فوجی نظام قائم کیا، جس کی گرفت آج بھی حکومت کے تمام شعبوں اور عوام کی سیاسی زندگی پر اسی قدر مضبوط ہے کہ جتنی انقلاب کے پہلے دن تھی۔

اس کے ایک ہی ماہ بعد، ۱۷ نومبر کو سوڈان میں فوجی انقلاب رونما ہوا جس میں سوڈانی فوج کے جنرل عبود نے جمہوری حکومت ختم کرکے فوجی حکومت قائم کی اور جہاں ابھی تک عوامی حکومت کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکا ہے۔

سوڈان کے انقلاب کے کچھ ہی عرصہ بعد، ۲ مئی ۱۹۶۰ء کو ترکی میں جنرل گرسیل کی رہنمائی میں فوج نے صدر جلال بائر اور وزیر اعظم مندریس کی سخت گیر حکومت کو ختم کرکے فوج کو ملک و قوم کی نگہبانی اور حکومت کی ذمہ داری سونپ دی۔ آج بھی ترکی حکومت کا سارا کام فوج کی نگرانی میں چل رہا ہے اور ابھی کچھ ہی دنوں کی بات ہے (اکتوبر ۱۹۶۱ء) کہ شامی فوج نے مصر کے ساتھ شام کے الحاق کو توڑ کر پھر سے شام کو ایک آزاد اور خودمختار ملک کی حیثیت دی ہے۔

فوجی انقلابات کی یہ داستان دلچسپ اس اعتبار سے ہے کہ ان سب ممالک میں انقلابات کی وجوہ تقریباً ایک سی ہیں، دوسرے جب بھی کسی ملک میں فوجی حکومت قائم ہوئی ہے وہاں کے عوام نے پوری طرح فوج کا ساتھ دیا ہے اور خوش آمدید کہا ہے، کہیں بھی عوام اور فوج کا ٹکراؤ نہیں ہوا۔ کوئی خونریزی نہیں ہوئی کوئی ہنگامہ نہیں ہوا۔ رات کو ناکارہ اور نااہل حکومت کے ستائے ہوئے عوام بے خبر سوئے ہیں، صبح اٹھے تو نقشہ ہی اور دیکھا۔ رات کے اندھیرے میں خاموشی کے ساتھ خودغرض حکمرانوں کی نکمی حکومت اپنے انجام کو پہنچ گئی اور صبحِ انقلاب اپنے ساتھ ایک پرسکون اور خوش حال زندگی کی امید لے کر آگئی۔

عجیب اس اعتبار سے ہے کہ باوجود اس کے کہ ہر ملک میں فوجی حکومت نے سیاسی زندگی کو بالکل

ختم کر دیا۔ سیاسی جماعتوں پر پابندیاں عائد کر دیں۔ اخبارات اور تقریر و تحریر کی آزادی چھین لی۔ رائج دستور کو منسوخ کر دیا، پارلیمنٹ اور اسمبلیاں توڑ دیں، تحریر و تقریر کے ذریعہ اظہار خیال پر فوجی نگرانی قائم کر دی لیکن پھر بھی وہاں کے عوام فوجی تحریک سے خوش ہوئے اور اس کا خیر مقدم کیا۔ ہم ہندوستانیوں کے لئے جو اپنی حریت اور آزادئ فکر و خیال جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں، اس سے زیادہ عجیب بات کیا ہو سکتی ہے۔

لیکن ان ملکوں کی تاریخ اور اخلاقی، سماجی اور مذہبی قدروں کے مطالعہ، تعلیمی حالت اور معاشی مسائل کے جائزے، کثیر آبادی اور بے روزگاری کی الجھنوں اور سیاسی زندگی کی پیچیدگیوں، عوام کی محرومیوں اور مایوسیوں پر غور کرنے سے شاید اس عجیب سی بات کا بھید کھل جائے اور ان ممالک میں جمہوری نظام کی نامقبولیت اور ناکامی کے کچھ اسباب معلوم ہو سکیں۔

تعلیم کی کمی

جمہوریت کی کامیابی کے لئے دراصل ایک تعلیمی معیار ہونا لازمی ہے۔ سیاسی شعور کی بیداری، حقوق سے واقفیت اور ذمہ داریوں کا احساس، اتفاق اور اتحاد کا جذبہ، ترقی کی لگن، خوشحالی کی تڑپ اور اس کے لئے جد و جہد کا جذبہ، مذہبی رواداری، قومی تمدن اور تاریخ سے آشنائی، یہ باتیں تعلیم ہی سے آتی ہیں اور یہی سب باتیں جمہوریت کو پائیدار اور کامیاب بناتی ہیں —— لیکن مغربی ایشیا کے تقریباً سب ہی ممالک میں تعلیم کا معیار بہت پست اور ناقص ہے، ترکی اور شام وغیرہ میں اگرچہ تعلیم کی طرف تھوڑی بہت توجہ کی گئی ہے، لیکن قومی تاریخ سے ناواقفیت، اور اپنے تہذیبی ورثہ سے روگردانی نظام حکومت کی ناپائیداری کا باعث بنی ہوئی ہے۔

خدائی بادشاہت

اس کے علاوہ اس خطۂ زمین پر صدہا سال سے بادشاہی نظام حکومت قائم رہا ہے جس میں بادشاہ کے حقوق و اختیارات اور حرکات پر کسی بھی فرد یا جماعت کو انگلی اٹھانے کا حق نہیں تھا، جس کا ہر حکم قانون اور مرضی انصاف کا درجہ رکھتی تھی۔ جہاں مذہب کے غلط تصور کا زندگی کے ہر شعبہ پر تسلط رہا ہے۔ اور "خدائی بادشاہت" کا نظریہ حکومت کی اساس سمجھا گیا ہے، یعنی اقتدار اعلیٰ خدا کے ہاتھ میں ہے اور بادشاہ اس کا خلیفہ ہے، لہٰذا وہ اپنے کسی فعل کے لئے اپنی رعایا کے سامنے جواب دہ نہیں۔ ایسے نظام میں حکومت کے

ادارے اور سیاسی و سماجی زندگی کے ہر شعبہ پر بادشاہِ وقت کا مکمل اختیار تھا ہر کام اس کی مرضی اور اجازت سے ہوتا تھا۔ سرکاری خزانے اس کی ذاتی ملکیت، فوج، سپاہی اور حکومت کے کارندے اس کے ذاتی نوکر خیال کئے جاتے تھے۔ جنگ اور امن کے معاملات اس کی مرضی پر منحصر تھے۔

ظاہر ہے ایسے ماحول میں رہنے والی قومیں جمہوریت کے تصور اور عوامی حکومت کی خوبیوں سے بالکل ناواقف ہوں گی۔ لیکن بیسویں صدی میں اور خاص کر پہلی جنگ عظیم کے بعد جب ان پسماندہ لیکن قدرتی دولت کر مالا مال ممالک میں معاشی فائدوں اور سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر مغربی طاقتوں کا اثر و اقتدار بڑھا تو انھوں نے ان اہم حقائق کو بھلا دیا۔ اور مغربی طرز کی جمہوریت کی ضرورتوں سے بے خبر قوم میں پارلیمنٹ سیاسی پارٹیاں، الیکشن، عوامی حکومتیں اور عدالتیں قائم کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ ایسے ماحول میں یورپی تصورات کا کھپ جانا یقیناً ایک معجزہ ہوتا۔

متوسط طبقہ کی عدم موجودگی

اس قسم کے مغربی اداروں کے قیام کے لئے چونکہ ماحول کو سازگار بنانے اور تغیر کو قبول کرنے کے لئے عوام کے ذہنوں کو تیار نہیں کیا گیا، اس لئے نہ صرف مذہبی جماعتوں نے مخالفت کی بلکہ کمیونسٹ تحریکات نے بھی جمہوریت میں کیڑے نکالنا شروع کر دیئے۔ مذہبی پیشواؤں نے اس لئے اس تحریک کی مخالفت کی کہ عوام کے باشعور ہو جانے سے ان کا اثر ختم ہو جائے گا، کمیونسٹوں نے شاید اس لئے مخالفت کی کہ غریبی دور ہونے اور تعلیم کے پھیلنے سے کمیونزم میں کوئی کشش باقی نہیں رہ جاتی۔ اس کے علاوہ تعلیم یافتہ نوجوانوں پر مشتمل ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو ماضی کے ہر نقش کو مٹانا چاہتا تھا اپنی تاریخ اور ادب کو بھول کر مغربی تہذیب اور صنعتی تمدن کو پوری طرح رائج کرنا چاہتا تھا، مصر میں خدیو اسمٰعیل ان خیالات کی سرپرستی کر رہا تھا۔ اس کے برخلاف مذہبی پیشواؤں پر مشتمل ایک دوسرا طبقہ تھا جو جمہوریت اور نئی تہذیب کا مخالف تھا۔ اور گذرے ہوئے زمانہ میں لوٹ جانا چاہتا تھا، جسے ماحول اور وقت کی تبدیلی کے ساتھ بدلنا نامنظور تھا، لیکن جب ان میں سے کوئی بھی تحریک یا جماعت اکثریت کو اپنے ساتھ نہ ملا سکی اور سیاسی زندگی کا شیرازہ بکھرنے لگا، ملک کی قدرتی دولت بیرونی ممالک میں جانے لگی حکمراں اپنی غرض کے بندے بن گئے، تو فوج کے لئے مداخلت کرنا ناگزیر ہو گیا۔

مغربی ایشیا میں انقلابات ہمیشہ فوج ہی کے ذریعہ آئے ہیں اس کی بڑی وجہ متوسط طبقہ کی

تقریباً عدم موجودگی ہو یہاں جاگیرداری نظام بہت پرانا اور بہت مضبوط ہے۔ ملک کی سیاست و معاشرت پر اسی طبقے کے نمائندوں کا قبضہ رہا ہے۔ اس لئے کبھی کوئی معاشی یا سماجی اصلاح کی تحریک کامیاب نہ ہو سکی۔

امیروں اور مفلسوں کے درمیان ایک متوسط طبقہ ہوتا ہے۔ جو غریبوں کے لیے ہمدردی رکھتا ہے اور ان کا درد محسوس کرتا ہے، لیکن نسبتاً زیادہ آسودہ حال اور تعلیم یافتہ ہوتا ہے۔ اس جماعت کا اگر سیاسی شعور بیدار ہو تو حکومت کے ظلم اور جاگیرداری نظام کی زیادتیوں کے خلاف آواز بلند کر سکتا ہے اور عوام کو اپنے ساتھ ملا کر متحدہ محاذ بنا لیتا ہے۔ جو کبھی انقلاب کی شکل اختیار کر لیتا ہے لیکن مغربی ایشیا کے ممالک میں اس جماعت کا وجود بہت کمزور ہے۔ کسان اور مزدور خستہ حال ہیں۔ زمیندار کا دیا کھاتے ہیں، اس کے کرم پر جیتے ہیں، لہٰذا اس کے خلاف احتجاج کا خیال بھی نہیں کرتے۔ صنعتی ترقی اگر یہاں عام ہوتی، بڑی بڑی ملیں اور کارخانے ہوتے، تعمیری کاموں میں حکومت کی دلچسپی ہوتی تو مزدور تحریک وجود میں آ سکتی تھی، ان مزدوروں میں ٹریڈ یونین کی تحریک بہت جلد مقبول ہوتی ہے، یہی ٹریڈ یونین مزدوروں میں ان کے حقوق کا احساس اجاگر کرتی ہیں اور پھر انہیں منظم کر کے انقلاب پر آمادہ کرتی ہیں۔ لیکن چونکہ مغربی ایشیا کے مزدور اور کسان بہت کمزور اور غیر منظم ہیں اس لئے انقلاب کی ذمہ داری فوج پر ہی آتی ہے۔ جو مستحکم ہوتی ہے اور منظم بھی۔

دوسرے ممالک کے فوجی افسران کے برخلاف مغربی ایشیا کے فوجی افسران جو عام طور سے خوشحال گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں اور فوج کو اپنی انفرادی ترقی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اپنے ملک کی سیاست اور قومی تحریکوں میں گہری دلچسپی لیتے ہیں۔ ان میں "قومیت" کا جذبہ پوری طرح اجاگر ہوتا ہے، ان افسران میں سے اکثر کی تعلیم اور فوجی تربیت یورپی ممالک میں ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے اپنے وطن واپس آکر وہ ایک سماجی انقلاب کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ملک کی بدحالی اور بگڑی ہوئی تقدیر پر آنسو نہیں بہاتے، بلکہ ترقی و خوشحالی پانے کی لگن کے ساتھ میدانِ عمل میں آتے ہیں۔ ان کے پروگراموں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تعلیم اور مذہب کا صحیح تصور رائج کرنا چاہتے ہیں، ملک کی بے پناہ قدرتی دولت سے جس سے باہر کی دنیا فیض اٹھا رہی ہے، وہ خود فائدہ اٹھا کر اپنی قسمت بدلنا چاہتے ہیں اسی لئے جب یہاں کسی ملک میں فوج نے اقدام کیا، وہاں کے عوام نے انہیں خوش آمدید کہا ہے، اور چونکہ اس قسم کا سماجی اور معاشی انقلاب خود غرض

سیاست دان اور تجربہ حکمران نہیں لاسکتے۔ اس لئے فوج ہی اس فرض کی ادائیگی کا ذمہ لیتی ہے۔

قوم پرستی کا جذبہ

پہلی جنگ عظیم کے بعد مغربی ایشیا کے ممالک میں دولت عثمانیہ کے اقتدار سے آزادی پانے کا جذبہ اور نسلی برتری کا احساس اُبھا رہا ہوا۔ فرانس کے شاندار انقلاب اور امریکہ و برطانیہ کے جمہوری نظام سے متاثر ہو کر آزادی اور قومیت کی تحریکیں زور پکڑ رہی تھیں۔ عربی زبان اور عرب تہذیب کو بچانے کے نام پر ترکوں کے خلاف جدوجہد عام ہو رہی تھی۔ اس وقت عرب قوم ہر اس جماعت کا ساتھ دینے کو تیار تھی جو انہیں ترکی کی گرفت سے آزادی دلا سکے اور ان کے نسلی و قومی افتخار کو تحسین کی نظر سے دیکھ سکے۔ چنانچہ اسی امید پر ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں عربوں نے حسین، شریف مکہ کے ساتھ دولت عثمانیہ کے خلاف انگریزوں کا ساتھ دیا۔ لیکن انگریز اپنے وعدہ پر قائم نہ رہ سکے، ملک شام، فلسطین اور عراق کو برطانیہ اور فرانس کے زیر نگرانی دے دیا گیا۔ مصر پہلے ہی سے انگریزوں کے زیر اثر تھا۔

اسرائیل کا قیام

تولیت (MANDATE) کے اس زمانے میں فلسطین میں یہودیوں کی آبادی اور اثر بڑھا۔ ہزاروں کی تعداد میں یورپی پناہ گزین فلسطین آنے لگے، جس سے وہاں یہودی حکومت کی مانگ کو بہت تقویت پہنچی۔

ظاہر ہے عرب اپنے سینے میں یہ ناسور کبھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ مصر، شام، عراق، اردن، سعودی عرب اور یمن نے اسرائیل کے قیام کی زبردست مخالفت کی۔ برطانیہ، جس نے یہودی ریاست کے خیال کو ہوا دی تھی اب عربوں کی مخالفت کے پیش نظر اپنے مفاد کی خاطر عربوں سے ہمدردی کا اظہار کر رہا تھا۔ یہودی پناہ گزینوں کے داخلے پر پابندی لگا دی۔ اقوام متحدہ میں بھی اس کا رویہ عربوں کی ہمدردی میں رہا، لیکن بالآخر امریکہ کی کوششوں اور تعاون سے ۱۴ مئی ۱۹۴۹ء کو فلسطین میں جہاں دو ہزار سال سے عربوں کی نوے فی صدی اکثریت تھی، ایک یہودی ریاست "اسرائیل" کا قیام عمل میں آیا، اور ہزاروں لاکھوں عربوں کو اپنے آباؤ اجداد کی زمین کو خیرباد کہنا پڑا اور جو آج اپنے وطن لوٹ جانے کی امید میں خیموں میں یو۔این کے ٹکڑوں پر پڑے ہوئے ہیں۔

۱۴ مئی کے اعلان کے ساتھ ہی عرب لیگ کی سب ممبر حکومتوں نے اسرائیل سے جنگ کا اعلان کر دیا لیکن جنگ میں شکست عربوں کو ہی ہوئی۔

اس ناکامی کا عرب ممالک کی سیاست پر گہرا اور مستقل اثر پڑا۔ جنگ میں ناکامی کی سب سے بڑی وجہ آپس کی نااتفاقی اور ذاتی اغراض تھیں۔ اس کے علاوہ جنگ میں فوجیوں کو پرانے اور نکمے اسلحے دیئے گئے تھے، جس کی ذمہ داری شاہ فاروق پر آتی ہے۔ میدان میں لڑنے والی فوجوں کو جنگ کا سامان اور غذا تک نہیں مل سکی، لڑائی کے نقشوں، راستوں اور پلاننگ تک سے واقف نہیں کیا گیا۔ حکومتوں کے سربراہوں نے جنگ کی کسی ضرورت میں دلچسپی نہیں لی، بلکہ الٹا جنگ میں ناکامی کی تمام ذمہ داری فوج پر ڈال دی۔ شام میں اس وقت فوج کے اخراجات گھٹا دیئے گئے جب کہ فوج کو اخراجات کی بہت ضرورت تھی۔

اور انہی سب وجوہات کی بنا پر شام اور مصر میں فوجی انقلابات کا سلسلہ شروع ہوا۔ ۱۹۴۹ء میں کرنل زعیم نے پہلی بار پارلیمانی حکومت توڑ کر فوجی حکومت قائم کی، لیکن اپنی سخت گیری کے باعث اور دیگر داخلی سیاست کے مسائل کے پیشِ نظر زعیم کے بعد کرنل حناوی اور کرنل ششاکلی نے حکومتیں قائم کیں۔ اسی طرح مصر میں کرنل ناصر کی قیادت میں فوج نے حکومت کا انتظام سنبھالا۔

اسی طرح عراق، پاکستان، سوڈان اور ترکی وغیرہ میں ہر وہ حکومت جس نے عوام کی منشا اور فلاح کو نظر انداز کر کے بیرونی ممالک سے ناطہ جوڑا، فوج کے عتاب سے نہیں بچ سکی۔ ان میں تقریباً ہر ملک میں فوج نے خود غرض، نکمی اور نااہل سیاسی جماعتوں اور نوری سعید اور مندریس جیسے سامراج پرست قوم فروشوں کو ختم کر کے کہ جن کے سینے میں اپنی قوم کی فلاح و بہبود سے زیادہ دوسروں کی ترقی اور حفاظت کا غم تھا، نئی زندگی کی اُمید دلائی ہے، اور یہ حقیقت ہے کہ آج ان میں ہر ملک کے عوام پہلے سے زیادہ مطمئن اور آسودہ حال ہیں، اگرچہ اس اطمینان اور آسودگی کی قیمت ان کی آزادیٔ فکر و خیال اور دوسرے بنیادی جمہوری حقوق ہیں۔

حالات حاضرہ

الجزائر اور فرانس

خبریں موصول ہو رہی ہیں کہ الجزائر کی عارضی قومی حکومت اور ڈیگال کی حکومت کے مابین عنقریب کوئی سمجھوتہ ہو جائے گا اور الجزائر میں سات سال سے قوم پرست آزادی کی جو لڑائی لڑ رہے ہیں وہ ختم ہو جائے گی۔ ابھی تک ہر چیز صیغۂ راز میں ہے لیکن فرانسیسی حکومت کے قریبی حلقوں کی اطلاع ہے کہ فریقین مندرجہ ذیل باتوں پر متفق ہو گئے ہیں:۔

(۱) صحارا الجزائر کے علاقے کا حصہ ہوگا اور فرانس کو وہاں معاشی حقوق حاصل ہوں گے۔

(۲) ہوائی اور بحری فوجی اڈے فرانس کو پٹے پر دئے جائیں گے۔

(۳) "حق خود ارادیت" سے متعلق جو استصواب رائے ہوگا اس کے بعد کئی سال تک (فوجی اڈوں کے علاوہ) فرانس کی کچھ فوجیں الجزائر میں رہیں گی۔

(۴) فرانس الجزائر کو کافی معاشی اور مالی امداد بہم پہنچائے گا۔

(۵) الجزائر میں یوروپ کے جو لوگ بس گئے ہیں ان کے شہری، مذہبی، قانونی اور ملکیت کے حقوق محفوظ رہیں گے۔

۱۱ فروری کو جب سمجھوتہ سے متعلق گفت و شنید کا دوبارہ آغاز ہوا تھا تو دو اہم معاملات طے ہونے کو باقی تھے۔ (۱) جنگ کے بند ہونے کے بعد استصواب رائے کے لئے جو عارضی حکومت قائم ہو اس کی تشکیل کس طرح ہو اور اس کے اختیارات کیا ہوں؟ یہ بات پہلے ہی طے ہو چکی تھی کہ جو حکومت بھی قائم ہوگی اُس کا چیئرمین مسلمان ہوگا۔)

۲۔ اگر استصواب رائے ایک آزاد الجزائری ریاست کے قیام کے حق میں فیصلہ دیتا ہے تو ہر اس یوروپین کو جو الجزائر میں پیدا ہوا ہے خود بخود الجزائر کی قومیت مل جائے گی یا نہیں؟

معلوم نہیں یہ تمام باتیں کہاں تک صحیح ہیں، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس بار ہر دو فریق صلح اور تصفیہ کے خواہاں ہیں اور صاف ظاہر ہوتا ہے کہ الجزائری شہیدوں کا خون رائگاں نہیں جائے گا۔ ہم یہاں اس خونیں داستان کو نہیں دہرائیں گے جو "مہذب جمہوری دنیا" کے دامن پر ایک بدنما داغ ہے، (اگرچہ یہ دنیا ایسے بدنما داغوں کی عادی ہو چکی ہے) ہم الجزائریوں کی جانی و مالی قربانیوں اور ان کے بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کی مصیبتوں اور آزمائشوں کا ذکر بھی نہیں کریں گے کہ 'دار و رسن' کی یہ حکایت خونچکاں سب کو معلوم ہے، ہم اُس خفیہ فوجی تنظیم سے بھی بحث نہیں کریں گے جو پلاسٹک بموں کی دہشتناکی کا مظاہرہ کرکے ڈیگال کو خوفزدہ کرتی رہی ہے اور آج بھی ایک طرف اہلِ فرانس کی نیندیں حرام کئے ہوئے ہے اور دوسری طرف الجزائر کے تمام بڑے شہروں پر خوف و ہراس کا سایہ ڈالے ہوئے ہے کہ یہ خبریں بھی ہر روز اخباروں میں آتی ہیں، ہمیں دراصل بحث اس سے ہے کہ آج جبکہ الجزائری قوم پرست آزادی کی منزل سے قریب آن لگے ہیں، اُن کے افکار و خیالات کے رنگ سے کل کے الجزائر کا کیا نقشہ مرتب ہوگا اور آزاد الجزائری حکومت کے خد و خال کیا ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج یہی چیز اہمیت رکھتی ہے اور ایک حد تک یہی بات اب تک فرانس کو "گومگو" اور "چہ کنم" کی کیفیت میں مبتلا کئے ہوئے ہے۔

الجزائر کا مستقبل

سامراجی نظام کے خلاف ایشیا اور افریقہ کی اُن قومی تحریکوں کی جو ایک عرصہ تک جدوجہد اور آزمائش و ابتلا کی گوناگوں منزلوں سے گزری ہیں، کم و بیش ایک خصوصیت یہ رہی ہے کہ بدیسی راج کے خلاف محکوم ملک کے مختلف النوع نظریات رکھنے والے سب ہی عناصر ایک جھنڈے کے نیچے جمع رہے ہیں آزادی کی جنگ کے دوران میں فکری اختلافات کسی نہ کسی شکل میں ظاہر ہوتے تھے لیکن محکومی سے نفرت اور آزادی کی تڑپ اُن اختلافات کو دبا دیتی تھی یا زیادہ گمبھیر صورت اختیار کرنے سے روک دیتی تھی، لیکن جب محکومی کا سنگ گراں راہ سے ہٹ گیا اور مثبت خطوط پر ایسی قوموں کو 'اثباتِ خودی' کا رنگ بھرنا پڑا اور نئے نظام کی تعمیر کا مسئلہ سامنے آیا تو نظری اختلافات شدت کے ساتھ اُبھرے، دائیں بازو اور بائیں بازو، رجعت پرستی اور ترقی پسندی کی بحثیں چھڑیں اور نئی آزاد قوموں کو نئے نئے چیلنجوں کا جواب دینا پڑا۔ الجزائر جدوجہد اور آزمائشوں سے گذرا ہے اور وہاں کے قومی

کیمپ میں بورژوا قوم پرست، سوشلسٹ، کمیونسٹ اور مذہبی رہنما شامل رہے ہیں، اس لئے آزادی کے بعد الجزائر والوں کو ان عناصر کے فکری اختلافات اور اُن سے پیدا ہونے والے نت نئے مسائل سے بھی دو چار ہونا پڑے گا۔ آزادی کے بعد کا الجزائر اس خاص نقطۂ نظر سے بھی "مغرب" میں ایک دلچسپ تجربہ گاہ ثابت ہوگا۔

دوسرا اہم سوال یہ ہے کہ قومی آزادی کے محاذ (الجزائر کی قومی تحریک FLN کے نام سے مشہور ہے، آئندہ اسے ہم محض قومی تحریک کہنے پر اکتفا کریں گے) اور اس کے فوجی پیروں کا فکر کیا ہے، اصول یا عقیدہ کیا ہے، یہاں مذہبی عقیدے سے بحث نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ نئے نظام کو تعمیر کن اصولوں پر کریں گے، اس وقت الجزائر میں برسوں کی مستقل جنگ کی وجہ سے ہر طرف بربادی اور تباہی کے آثار نمایاں ہیں، نئی نسل جس نے یہ جنگ لڑی ہے سنجیدہ اور منظم ہے، اس لئے یہ سوال اور بھی اہم ہو جاتا ہے کہ ان کے دلوں میں اپنے وطن عزیز کی تعمیر کی جو حسرت ہے وہ کس اصول اور طریقۂ کار کے سہارے پوری ہوگی۔

الجزائر کے قوم پرست انقلاب کے خواہاں کیوں ہیں؟ اُن کا جواب یہ ہے کہ ہم نے قومی جنگ کے سلسلہ میں جو بے پناہ قربانیاں دی ہیں اُن سے مقصود صرف یہی نہیں رہا ہے کہ ہم دنیا پر یہ ثابت کریں کہ ہمارا قومی شعور بیدار ہے اور قومی غیرت کی چنگاریاں ہماری رگوں میں موجود ہیں، ۱۹۵۴ء سے پہلے الجزائر اپنے نوّے فیصدی باشندوں کے لئے قحط، مفلوک الحالی اور مایوسیوں کا ایک ویرانہ تھا، آج یہ بربادیوں کا ایک وسیع صحرا ہے، اس لئے ہمارے سامنے دو مقصد ہیں۔ (۱) آزادی کی لڑائی جیتنا اور (۲) بالکل نئی بنیادوں پر الجزائر کی نئی تشکیل کرنا۔ اس سے کم میں دس لاکھ شہیدوں کے خون کی قیمت ادا نہیں ہو سکتی۔

تعمیر نو کی بنیادیں کیا ہوں گی؟

زرعی اصلاح، ظاہر ہے کہ پہلا قدم ہوگا، اس وقت الجزائر میں ۹۵ فیصدی آبادی ایسی ہے جس کے پاس ملک کی زمین کا دو تہائی حصہ ہے اور وہ بھی دوسرے اور تیسرے درجہ کی زمین کا۔ اور باقی ایک تہائی حصہ جو بہترین ہے، یورپین باشندوں کے قبضہ میں ہے، ۱۸۷۰ء کے بعد الجزائر میں صرف شراب کی پیداوار میں اضافہ ہوا ہے اور وہ بھی معمولی نہیں بلکہ چھتیس گنا، (اس شراب کا بڑا حصہ فرانس بھیجا جاتا ہے)

جبکہ اس صورت میں کہ ۱۸۷۰ء کے بعد یہاں کی آبادی تین گنا بڑھی ہے لیکن غلہ کی پیداوار میں کوئی اضافہ نہیں ہوا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ قحط اور فاقہ کشی کی لعنت میں تقریباً پورا ملک گرفتار رہا ہے ۔ لہٰذا قوم پرستوں کا پہلا کام یہ ہوگا کہ وہ زرعی اصلاح کی طرف فوری توجہ کریں، لیکن اس قسم کی زرعی اصلاح بیکار ہوگی اگر زمین کے ٹکڑے کسانوں میں تقسیم کیے جائیں، یہ تو وہی بات ہوئی کہ نوآبادیاتی نظام سے پہلے کی صورت حال پھر پیدا کر دی جائے، اس لیے قومی تحریک کے رہنماؤں کا کہنا ہے کہ وہ نجی ملکیت کے تصور کو خیرباد کہہ کر اجتماعی ملکیت کے اصول پر کاربند ہوں گے، دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ سوشلزم کے طریقۂ کار کو اپنائیں گے، ظاہر ہے کہ یوروپین زمینداروں کے مفاد پر اس کی ضرب کاری ہوگی، ہم نے شروع میں کہا ہے کہ الجزائر اور فرانس میں ہونے والے سمجھوتے کی جو غیر سرکاری خبریں مل رہی ہیں، ان کے مطابق الجزائر والوں نے یہ مان لیا ہے کہ یوروپینوں کے ملکیت کے حقوق محفوظ رہیں گے، ہم نے یہ بھی کہا ہے کہ معلوم نہیں یہ کہاں تک صحیح ہے، بہرحال، اگر سمجھوتے کی ایک شرط یہ ہے تو انقلابیوں کے اجتماعی ملکیت کے اس تصور سے اس کا تصادم ہوتا ہے، ہوسکتا ہے کہ انھوں نے یہ شرط مصلحتاً دفع الوقتی کے لئے مان لی ہو، اگر ایسا ہے تو آئندہ پیچیدگیاں ضرور پیدا ہوں گی، ممکن ہے اس طرح الجزائر خانہ جنگی کی مصیبت میں مبتلا ہو جائے، یہ بھی ممکن ہے کہ ڈیگال نے خود خفیہ فوجی تنظیم (OAS) کے زور کو کم کرنے اور یورپین آبادی کی عارضی تسلی کے لئے قوم پرستوں سے یہ بات منوالی ہو، لیکن اس صورت میں بھی پیچیدگی پیدا ہوسکتی ہے خواہ اس کا پیمانہ اول الذکر کے مقابلے میں چھوٹا ہو۔

قومی تحریک کے رہنما اپنے پروگرام کے دوسرے پہلوؤں پر بھی زور دیتے ہیں مثلاً تعلیم، سوشل سروسز وغیرہ، زندگی کی فراہمی اور صنعتی ترقی ۔ اُن سے جب یہ پوچھا جاتا ہے کہ OAS اور ان کے یوروپین حامیوں کے بارے میں ان کی کیا رائے ہے تو وہ اس پر مسکرا دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ جہاں تک ہمارا تعلق ہے OAS ہمارے لئے کوئی مسئلہ نہیں، اگر ڈیگال عبوری دور میں ہمارے ساتھ تعاون کرے تو ہم اس خفیہ تنظیم سے بہت ہی مختصر مدت میں نبٹ سکتے ہیں۔

یہ کہنا غلط ہے کہ آزاد ہوتے ہی الجزائر فرانس سے اپنے تمام تعلقات ختم کر لے گا، اگر فرانس نے آزاد الجزائر کو سمجھ لیا اور اس کی امنگوں کو سہارا دینے کا فیصلہ کیا، تو الجزائر کے رہنما اس کے اشتراک و تعاون کا خیر مقدم کریں گے، مگر قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ الجزائر کے لوگ فرانس کی خاطر کسی طرح بھی سرد جنگ کے معرکے

چکر میں مبتلا ہونے کے لئے تیار نہیں ہوں گے، فرانسیسی اور دوسری غیر ملکی کمپنیوں کو وہ صحارا میں تیل اور گیس کے ذخائر کی دریافت کے لئے مراعات دیں گے، لیکن دوسرے ملکوں سے بھی مالی اور تکنیکی امداد لینے سے گریز نہیں کریں گے، قومی تحریک کے تقریباً تمام ذمہ دار ترجمان اس رجحان کے حامل معلوم ہوتے ہیں، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آزاد الجزائر کی خارجہ پالیسی کم و بیش وہی ہو گی جو ہندوستان اور مصر کی ہے یعنی اشتراکی تعمیر نو اور آزاد اور غیر جانبدار خارجہ پالیسی، دیکھنا یہ ہے کہ جذباتی فرانسیسی قوم کہاں تک قومی تحریک کے ان عزائم کا ساتھ دیتی ہے۔

الجزائر کی قومی تحریک میں یہ رجحان بھی بہت قوی رہا ہے اور ٹیونس اور مراکش کے نوجوان قوم پرست بھی اس کے حامی ہیں کہ ٹیونس، الجزائر اور مراکش کا ایک وفاق ہو، یعنی کسی نہ کسی روپ میں مغرب کا اتحاد ہو جائے اور بقول فرحت عباس کے جو آج بھی اتنا ہی صحیح ہے، شمالی افریقہ کی ان ریاستوں کا وفاق اس طرح ہو کہ تعلیم، معاشی معاملات، صنعتی پروگرام، قومی دفاع اور خارجہ امور میں یہ ممالک ایک مشترک پالیسی اختیار کریں، اسی کے ساتھ یہ خیال بھی مقبول ہو رہا ہے کہ مغربی سوڈان سے بھی قریبی معاشی و اقتصادی تعاون کی راہ پیدا کی جائے تاکہ وہ بھی صحارا کے تیل اور گیس کے ذخیروں سے فیضیاب ہو سکے۔

الجزائر کی قومی جنگ میں عورتوں نے نمایاں حصہ لیا ہے اور اس جنگ کی وجہ سے معاشرہ کے روایتی نظام میں بڑی تبدیلیاں آگئی ہیں، عورتوں کی بیداری نئے الجزائر کا طرۂ امتیاز ہے، یہ فال نیک ہے، آزادی کے بعد معاشرتی سطح پر ایک چیلنج یہ ہوگا کہ عورتوں کی اس بیداری میں توازن کہاں تک قائم رہتا ہے، دوسرا مفید نتیجہ یہ ظاہر ہوا ہے کہ الجزائر کے مختلف قبیلوں کے درمیان جو پرانی دیواریں کھڑی تھیں وہ گر گئی ہیں اور شمالی علاقے اور جنوبی حصے میں جو اجنبیت تھی وہ بھی دور ہو گئی ہے، قومی تحریک نے قومی یکجہتی کی بڑی خوشگوار فضا پیدا کر دی ہے، لیکن یہ یکجہتی پائدار اسی وقت ہو سکتی ہے جب الجزائر میں کسی جماعت یا علاقے کو یہ شکایت نہ ہو کہ وہ قومی تعمیر و ترقی کے منصوبے میں نظر انداز کیا جا رہا ہے۔

یمن نے متحدہ عرب جمہوریہ سے اپنا ناتہ توڑ لیا

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ الجزائر کا عزم یہ ہے کہ آزاد ہونے کے بعد ہندوستان اور مصر کی طرح اپنی

معاشی اور معاشرتی تنظیم سوشلسٹ اصولوں پر کرے، مصر نے سوشلزم کو اپنا لیا ہے اور صدر ناصر اسے عرب سوشلزم کے نام سے پیش کرتے ہیں، یعنی مارکسی جدلیاتی تصور سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ یہ مذہب کی دشمن اور خدا سے منکر ہے، لیکن جہاں تک سوشلائزیشن کے اصولوں کا معاملہ ہے، صدر ناصر عرب ممالک کی ترقی کے لئے ان پر عمل درآمد ناگزیر سمجھتے ہیں اور بغیر کسی فقہی اجتہاد اور علمی استدلال کے وجدان کی بنا پر صاف صاف کہتے ہیں کہ عرب سوشلزم اور اسلام میں کوئی تفاوت و تضاد نہیں، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سماجی انصاف سے متعلق اسلام کا جو تصور ہے وہ سوشلزم کی حد تک پہنچتا ہے لیکن اس بحث میں پڑے بغیر اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ یمن جیسی قرون وسطیٰ کی خصوصیات رکھنے والی ریاستیں اور ان کا سیاسی اور سماجی نظام اسلام کے اجتماعی عدل کے عین خلاف ہے، عرب سوشلزم کے نظریے کو اگر تقویت ملتی ہے اور اسے شرف قبول حاصل ہوتا ہے تو اس سے مستبد شیخوں اور خود سر امیروں کے مفاد پر ضرب پڑتی ہے اور مذہبی رجعت پرستی کے رسوا ہونے کے امکانات بھی قوی ہو جاتے ہیں۔ شیخ یمن کو صدر ناصر کی اس آئیڈیالوجی سے خطرہ محسوس ہوا اور انھوں نے متحدہ عرب جمہوریہ سے یمن کی علاحدگی کا اعلان کر دیا اس موقع پر انھوں نے ایک قصیدہ بھی لکھا جو ہزاروں کی تعداد میں شائع ہوا، اس قصیدے میں اسلام اور انصاف کے نام پر بے عنان نجی ملکیت کے تصور کی حمایت کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ دوسروں کی کمائی پر قانون کی آڑ لے کر، قبضہ کرنا غصب ہے اور اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا، ظاہر ہے کہ روئے سخن صدر ناصر کی طرف ہے جنھوں نے سرمایہ داری کے خلاف ہلّہ بول رکھا ہے، یاد رہے کہ متحدہ عرب جمہوریہ سے شام کے الگ ہونے کا بھی یہی سبب تھا، شام میں سرمایہ داروں اور اجارہ داروں کا وہ گروہ جو خمسیہ کہلاتا ہے اور شام کی قومی آمدنی کے تقریباً ۸۰ فیصدی حصہ پر قابض ہے، صدر ناصر کی زرعی اور مالی اصلاحوں کو اپنے مفاد کے حق میں مضر تصور کرتا تھا، اس لئے اس نے فوجیوں سے ساز باز کر کے فوجی انقلاب برپا کیا اور متحدہ عرب جمہوریہ سے شام کا رشتہ منقطع کر لیا۔

عرب ملکوں کا اپنا الگ الگ سیاسی و معاشی نظام رہا ہے، تعلیمی و تہذیبی معیار بھی مختلف رہے ہیں کوئی ترقی کر رہا ہے، کوئی اپنی پسماندگی ہی پر قناعت کئے ہوئے ہے، کہیں ایک باشعور اور بیدار متوسط طبقہ ہے جو سیاست اور معاشرت پر اثر انداز ہوتا رہا ہے، کہیں متوسط طبقہ سرے سے ہی مفقود ہے، کہیں

عہد جدید کے جلیجوں کا احساس ہے تو کسی کو قرون وسطیٰ کے جاگیری نظام ہی میں ساری برکتیں نظر آرہی ہیں یا یعنی امیروں اور شاہوں کی ذاتی مصلحتیں اور خود غرضیاں ہیں کہ ترقی کی راہ کو روکے کھڑی ہیں، الغرض عرب ملکوں کا مسئلہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے اور اس کے حل ہونے میں دیر لگے گی۔

ہراساں ولرزاں لبنان

یکم جنوری ۱۹۶۲ء کی شب میں لبنان میں انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی گئی جو ناکام رہی، مغربی ایشیا کے پریس نے یہاں تک کہ لبنان کے ان اخباروں نے جو مغرب کے ہواخواہ اور ہمدرد ہیں ایک آواز ہو کر یہ بات کہی کہ انقلاب کی اس ناکام کوشش میں بدیسی حکومتوں کا ہاتھ ہے، اس وقت سے لے کر اب تک یہ بات کسی قدر واضح ہو چکی ہے کہ پی، پی، ایس (Parti Populaire Syrien) کی مدد سے برطانیہ اور اُردن مغربی ایشیا کے نقشے میں کوئی تبدیلی لانا چاہتے ہیں، اس علاقے سے جو خبریں موصول ہو رہی ہیں اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ لارڈ ہوم اور شاہ حسین کسی نئی مہم جوئی پر آمادہ ہیں، پی۔ پی۔ ایس ۱۹۳۲ء میں قائم ہوئی، انطون سعدہ ایک لبنانی اس کے بانی تھے، اس کے قیام کا سبب تقریباً وہی تھا جو نازی پارٹی کے قیام کا تھا یعنی یہ وارسائی کے معاہدۂ صلح کے خلاف ایک احتجاج تھا، نازی پارٹی کی طرح یہ بھی دائیں بازو کی آمرانہ اور تشدد پر ایمان رکھنے والی جماعت تھی، اس کے دو بنیادی تصورات تھے۔

(۱) عظیم تر سیریا — اس میں اس وقت کا شام، لبنان، اردن اور اسرائیل کا علاقہ شامل تھا، انطون کا کہنا تھا کہ یہ ایک جغرافیائی وحدت ہے اور یہاں کے رہنے والے سیرین ہیں عرب نہیں۔ اُس کے نزدیک عرب وہ بدّو تھے جو سعودی عرب کے باشندے تھے۔ اس تصوّر کی تبلیغ سے غالباً اس کا مقصد یہ تھا کہ انگلستان اور فرانس کی اُس اسکیم کو جس سے LEVANT کا علاقہ کئی حصوں میں منقسم ہو جاتا تھا، ختم کر دیا جائے۔

(۲) انطون کا دوسرا بنیادی تصوّر یہ تھا کہ مذہب کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیئے یعنی عظیم تر سیریا کی جو ریاست بنے وہ مکمل طور پر ایک سیکولر ریپبلک ہو، اور کسی قدر سوشلسٹ رجحان رکھتی ہو،

بعد میں عراق کا علاقہ اس منصوبے کا ایک جزو بنا لیا گیا اور سائپرس کا جزیرہ بھی اس تخئیلی

ریاست میں شامل ہوگیا، اس طرح عظیم تر سیریا اور FERTILE CRESCENT میں کوئی خاص فرق نہیں رہ گیا۔

ہم اس موقع پر اس جماعت کی تاریخ نہیں بیان کریں گے بلکہ اس کے ذکر سے یہ بتانا مقصود ہے کہ عراق اور مصر کی طرف سے مایوس ہوکر انگریزوں نے اپنی ساری امیدیں شاہ حسین سے وابستہ کر رکھی ہیں۔ عرب اتحاد کا نعرہ کافی مقبول ہے اور باوجود اس کے شام اور یمن نے متحدہ عرب جمہوریہ سے علیحدگی اختیار کرلی ہے، معقول اور صحیح عرب قومیت و اتحاد کے نظریے میں بڑی دلکشی ہے اور بہ دیر یا بہ زود عرب سوشلزم کے تصور کے سہارے قومیت و اتحاد کا یہ جذبہ بھی اتنا قوی ہوجائے گا کہ اس علاقہ میں بیرونی طاقتوں کا سیاسی اثر اور معاشی مفاد خطرہ میں پڑ جائے گا۔ شاہ حسین عرب قومیت کی کامیابی میں ناصر کا عروج دیکھتے ہیں، وہ اس بات کو بھی پسند نہیں کرتے کہ عرب قوموں کی رہنمائی کا اعزاز مصر کو ملے، اس لئے انھوں نے پی۔پی۔ایس سے اپنے قدیم تعلقات کی تجدید کی ہے، ۱۹۵۴ء سے کر اب تک یہ تعلق کسی نہ کسی شکل میں قائم رہا ہے، پی۔پی۔ایس نے بھی ایک عرصہ سے اپنی توقعات ہاشمیوں سے وابستہ کر رکھی ہیں، عراق میں انقلاب سے پہلے شاہ فیصل کی حکومت کے ساتھ مل کر وہ شام کی فتح کے خواب دیکھا کرتی تھی، لیکن اب شاہ حسین ان کی امیدوں کا مرکز ہے، ۳۱ دسمبر ۱۹۶۱ء کو لبنان میں حکومت کا تختہ الٹنے کی جو کوشش کی گئی تھی اس میں انھیں دونوں کا ہاتھ بتایا جاتا ہے۔ آج لبنان میں اگرچہ پی۔پی۔ایس کے کافی لوگ گرفتار ہوچکے ہیں اور امریکہ اور فرانس نے لبنانی حکومت کو اپنی اخلاقی اور مادی امداد کا یقین بھی دلادیا ہے، لیکن پھر بھی مغربی ایشیا اور مشرقی بحیرۂ روم میں انگریزی فوجوں کی نقل و حرکت کے پیش نظر لارڈ ہوم کی طرف سے لبنان کو اطمینان نہیں ہے، جانسن کے جو مراسلے جنوری اور فروری کے مہینے میں اسٹیٹسمین (دہلی) میں شائع ہوتے ہیں۔ اُن کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر مستقبل قریب میں ایشیا کے اس علاقے میں کوئی بڑا واقعہ ظہور پذیر ہوجائے تو وہ حالات و خیالات کے سلسلہ کا ایک متوقع منطقی نتیجہ ہوگا، اور دنیا کے باخبر حلقوں کو اس پر کوئی تعجب نہیں ہوگا۔

ڈھاکہ یونیورسٹی میں ہنگامہ

فروری کے پہلے ہفتہ میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبہ نے سہروردی کی گرفتاری کے سلسلے میں مظاہرہ کیا

اور پولیس اور فوج سے ان کا تصادم ہوا، حکومت نے جب سہروردی کو گرفتار کیا تو مشرقی پاکستان کے اخباروں کو اس کی ممانعت کردی کہ وہ اس سے متعلق کوئی خبر نہ شائع کریں، اس سے لوگوں میں اور خاص طور سے طلبہ میں بے چینی پیدا ہوئی، حکومت نے حالات کو ناقابل اطمینان دیکھ کر یونیورسٹی کے ذمہ داروں سے کہا کہ وہ رمضان شریف کے بہانے یونیورسٹی کو ایک ماہ کے لیے بند کردیں، چنانچہ اس کا اعلان کردیا گیا، یہ فیصلہ عام رواج کے خلاف تھا، غالباً مقصد یہ تھا کہ یونیورسٹی کے قریب ہوسٹلوں میں جو طلبہ رہتے ہیں وہ اپنے اپنے گھر چلے جائیں اور اس طرح فضا کی گرمی ٹھنڈی پڑ جائے۔ اس غیر متوقع چھٹی کی خبر پاکر طلبہ نے یونیورسٹی کے احاطہ میں ایک جلسہ کیا جس میں قراردادوں کے ذریعہ یونیورسٹی بند کرنے کے فیصلے کے خلاف احتجاج کیا گیا اور پاکستان میں جمہوریت کی بحالی اور سیاسی قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ کیا، پھر اس کے بعد جلوس نکلا، صدر ایوب کی قلمی تصویریں اور فوٹوگراف جلائے گئے، پولیس اور فوج سے تصادم ہوا، لوگ زخمی ہوئے اور کئی موتیں واقع ہوئیں۔

سہروردی پر حکومت نے یہ الزام لگایا ہے کہ اُن کی سرگرمیاں پاکستان کی سالمیت اور سلامتی کے حق میں مہلک تھیں اور ان کا تعلق اندر اور باہر پاکستان دشمن عناصر سے تھا، 'رموز مملکت' تو خداوند مملکت پاکستان کے سربراہوں ہی کو معلوم ہوں گے، ہاں تعجب ضرور ہے کہ سہروردی فوجی حکومت کی نگاہوں کے سامنے سے کس طرح بچ کر باغیانہ سرگرمیوں میں مصروف تھے، ایک خیال یہ بھی ہے کہ مشرقی پاکستان میں اب پھر اُن کا اثر بڑھنے لگا تھا، صدر ایوب کو مشرقی پاکستان کی بےچینیوں کا احساس ہے۔ چنانچہ پاکستان کے اس حصہ کے اپنے حالیہ دورے میں انھوں نے وہاں کے عوام کو مستحکم نظم ونسق کی بنیادوں کو متزلزل کرنے کے خلاف انتباہ دیا تھا اور کہا تھا کہ اگر انھوں نے غیر ذمہ دارانہ حرکتیں کیں تو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

مشرقی پاکستان کی ان بےچینیوں کا سبب کیا ہے؟ صدر ایوب کو اس طرف توجہ کرنا چاہیے، اس کی نوعیت سیاسی اور معاشی دونوں طرح کی ہے، اس کے علاوہ مشرقی پاکستان کے پڑھے لکھے لوگوں میں سیاسی بیداری بھی زیادہ ہے اور خاص طور سے طلبہ اس سلسلہ میں بہت زیادہ حساس ہیں، فوجی حکومت کی زندگی ایک معقول مدت سے زیادہ کی ہوگئی ہے اور چونکہ اس حکومت میں مقامی آزادی اور

شہری آزادیوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے، اس لئے مشرقی پاکستان کے عوام میں یہ احساس شدت سے بڑھ رہا ہے کہ مغربی پاکستان نے اس مشرقی صوبے کو اپنی نوآبادی تصور کرلیا ہے، یونیورسٹی کے احاطہ میں جو قراردادیں پاس ہوئیں اُن میں جمہوریت کی بحالی کا مطالبہ بھی کیا گیا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ آج کی دنیا میں جبر اور طاقت کا پنجہ زیادہ دنوں تک برداشت نہیں کیا جا سکتا، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ علاقائی عصبیت مبہم قومیت کے بھیس میں سر ابھارنے لگتی ہے، صدر ایوب نے اعلان کیا ہے کہ پاکستان کے دستور کا اعلان جلد ہی ہو جائے گا، اور جیسا کہ معلوم ہے اس دستور کا طرۂ امتیاز "بنیادی جمہوریت کا نظریہ" ہوگا، لیکن بنیادی جمہوریت کا پودا ایک دن میں پروان نہیں چڑھ سکتا، اس میں وقت لگے گا اور اس عرصہ میں اگر اسی طرح کے تصادم ہوتے رہے اور فوجی نظم کی چولیں بھی ڈھیلی ہو گئیں تو پھر کیا ہوگا؟ یہ ایک سوال ہے جو پاکستان کے اندر بھی اور باہر بھی پاکستانی معاملات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بڑی گمبھیرتا اختیار کرتا جا رہا ہے۔

(ض، ح، ف)

۲۰ فروری ۶۲ء

رسالہ "جامعہ" کے پُرانے پرچے

۱۹۴۰ء سے پہلے کے پرچے ہمارے یہاں نہیں ہیں بعض حضرات انھیں خریدنا چاہتے ہیں۔ اگر کوئی صاحب انھیں بیچنا چاہیں تو تفصیلات سے آگاہ فرمائیں۔

تعلیمی مسائل

اساتذہ کی تربیت

دولتِ مشترکہ کی دو ہفتہ تعلیمی کانفرنس امسال ۲۵ رجنوری کو دہلی میں ختم ہوئی۔ اس کانفرنس میں تیرہ ممالک کے دو سو مندوبین شریک ہوئے۔ اس موقعے پر تعلیمی معاملات میں اشتراکِ عمل کے دائرے کو وسیع کرنے کے لئے تجاویز منظور کی گئیں اور آپس کے تعاون کو وسیع بنانے پر زور دیا گیا۔ یہ کانفرنس پہلی بار ۱۹۵۹ء میں آکسفورڈ میں منعقد ہوئی تھی۔ پہلی کانفرنس کے مقابلے میں یہ کانفرنس کہیں زیادہ مختلف اقوام کی نمائندہ اور کہیں کم 'برطانوی' نظر آئی۔ تاہم تعلیم کے میدان میں برطانیہ کی مرکزی حیثیت اور اس کی فوقیت اب بھی مسلّم تھی۔ ادھر چند سال کے اندر، جامِ آزادی سے سرشار ہونے والے ممالک میں، ہندوستان کے علاوہ سب ہی نے اپنی اعلیٰ تعلیم کی درسگاہیں، انگلستان کے اداروں کی سرپرستی اور ان کے تتبع میں ہی تشکیل کی ہیں۔ اور اعلیٰ تعلیم کے معاملے میں بڑی حد تک محدود اور قدامت پسندانہ رویہ ہی اختیار کیا گیا ہے۔ ان حالات کے پیشِ نظر پنڈت نہرو کے الفاظ بڑے برمحل اور بصیرت افروز نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اپنے افتتاحیہ خطبے میں اس بات پر زور دیا کہ ترقی کی راہ پر گامزن ہونے والے نو وارد ممالک کو پوری سنجیدگی کے ساتھ اپنے آپ کو ذہنی اور تعلیمی وسائل میں خود کفیل بننے کی سعی کرنی چاہیئے۔

اگر پہلی کانفرنس کا کارنامہ دولتِ مشترکہ کے ممالک کے لئے وظائف اور تعلیمی امداد قرار دیا جا سکتا ہے تو اس کانفرنس کا طرۂ امتیاز یہ سمجھنا چاہیئے کہ معاشی اعتبار سے جن ممالک نے اب ترقی کے میدان میں قدم رکھا ہے، اُن میں تربیت یافتہ اساتذہ کی فراہمی کو اہمیت دی جائے۔ کانفرنس کے آغاز سے ہی اِن ملکوں نے اس بات پر زور دینا شروع کر دیا تھا کہ وہ ایک مدت تک اپنے آپ کو خود کفیل بنانے کے لئے ترقی یافتہ ممالک سے امداد کے خواستگار رہیں گے اور اُن کی سب سے اہم اور اشد ضرورت یہ ہے کہ ان کے یہاں تربیت یافتہ اساتذہ کی فراہمی اور ان کی تربیت کا بہتر انتظام

ہوسکے۔ اس ضرورت کی تکمیل کی غرض سے دولتِ مشترکہ کے سب ہی ممالک نے واضح طور پر اپنے خیالات
احساسات کا اظہار کیا اور اساتذہ کی تربیت اور فراہمی کے لئے متعدد نئے وظائف کا اعلان مختلف
ممالک کی طرف سے کیا گیا۔ وظائف کی اسکیم کا جائزہ لینے اور اس کی توسیع کے امکانات پر غور کرنے کے
علاوہ اس کانفرنس نے تعاون کی تین اور نئی راہیں تلاش کیں۔ اُن میں سے ایک چیز یہ ہے کہ ان مما
میں سماجی اور دیہی تعلیمی اداروں میں باہمی اشتراک پیدا کیا جائے۔ دوم، اجتماعی طور پر دولتِ مشترکہ
کے تمام ممالک میں انگریزی زبان کو 'دیگر زبان' کی حیثیت سے پڑھانے اور اس کی تدریس کے طریقوں
کو بہتر بنانے کی ضرورت کو واضح کیا گیا۔ تیسری بات درسی کتب کی فراہمی، فنی تعلیم اور توسیع تعلیم کے
مالی مسائل سے متعلق تھی۔ ہندوستان کی طرف سے اس موقعے پر یہ پیش کش کی گئی کہ ان ممالک میں
اساتذہ کی تربیت کے لئے سو مزید وظائف دئے جائیں گے۔ دوم انجینئرنگ کے اداروں میں
داخلے کے لئے چند جگہیں متعین کی جائیں گی اور حیدرآباد کی انگریزی زبان کی درسگاہ میں انگریزی
کو دوسری زبان کی حیثیت سے سیکھنے کے سلسلے میں تحقیقی کام کرنے والوں کی تربیت کا انتظام
کیا جائے۔

اس کانفرنس کی رپورٹ میں یہ بات واضح طور پر بیان کی گئی ہے کہ تعلیمی ترقی کا انحصار بڑی
حد تک اساتذہ اور ماہرینِ تعلیم کی ذات پر ہے۔ اس لئے اساتذہ کی تربیت، ان کی فراہمی اور افسرانِ تعلیم
کے لئے امدادی نصاب کا انتظام، ان کے نئے نئے آزاد ممالک میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ لہٰذا ان مسائل
کی طرف توجہ دینے پر زور دیا گیا۔ ریاضی، سائنس اور انگریزی زبان کے مخصوص اساتذہ کو مقرر کرنے کی
توجہ دلائی گئی۔ اس کانفرنس نے ابتدائی مدارس میں اساتذہ کے عالمگیر قحط کو بھی تسلیم کیا اور اس بات پر ز
دیا کہ ان اساتذہ کو رہنے سہنے کی بہتر سہولتیں فراہم کرکے اُن کی ملازمت کو برقرار رکھنے کی ضمانت کی جا
جہاں تک صنعتی تعلیم کے اساتذہ کا تعلق ہے یہ محسوس کیا گیا کہ ان کی کمی صرف اعلیٰ تعلیم کے مدارج پر ہی محسو
نہیں ہوتی بلکہ تعلیم کی ثانوی منزل پر بھی ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی تجویز کیا گیا کہ اساتذہ کی فراہمی کا جو بھی پر
مرتب کیا جائے اُس میں ان کی تربیت کرنے والے معلموں کی فراہمی کا بھی خیال رکھا جائے۔ کانفرنس میں انگر
کو 'دیگر زبان' کی حیثیت سے پڑھنے کی بابت کئی اہم تجاویز منظور کی گئیں۔ برطانیہ نے اس کام کے لئے نئ

اساتذہ کو تربیت دینے کا اعلان کیا۔ سماجی تعلیم کے کام کو بھی اس کانفرنس نے بڑے پیمانے پر کرنے کے لئے کہا اور زور دیا کہ اس کام کو بہتر اور پہلے سے زائد منظم طور پر ہونا چاہیئے۔ سماجی تعلیم کے بدلتے ہوئے تصورات اور اس کے اعلیٰ مفہوم کے پیش نظر اس طرف توجہ مبذول کرانے کی واقعی ضرورت تھی۔ آج سماجی تعلیم کا کام محض خواندہ بنانا نہیں ہے بلکہ شہریت کی تعلیم اور خواندگی کی منزل سے بڑھ کر علم کی روشنی کو مسب توفیق افراد تک پہنچانے کا انتظام و انصرام بھی ہے۔ دیہی تعلیم کے کارکنوں کو آپس میں معلومات فراہم کرنے اور ایک دوسرے کے کاموں کو دیکھنے اور سمجھنے سے متعلق تجویز منظور ہوئی اور اس طرح حاصل کردہ معلومات کو عام بنانے کی ضرورت جتائی گئی تاکہ وسائل کا پورا پورا استعمال ہو سکے۔

اب ذرا اس بات پر غور کیجیئے کہ آئندہ پانچ سال میں اساتذہ کی تربیت کے میدان میں ہمارے ملک کے اندر کیا کچھ ہو سکے گا۔ ہمارے تیسرے پنج سالہ قومی منصوبے میں اساتذہ کی تربیت کی طرف قابل لحاظ توجہ دی گئی ہے۔ اس دوران میں ابتدائی مدارس میں اکسٹھ فیصدی، آٹھویں جماعت تک کے مدرسوں میں اکیاسی فیصدی اور ثانوی مدارس میں چالیس فیصدی تربیت یافتہ اساتذہ کی تعداد میں توسیع کی گنجائش پیدا کی گئی ہے۔ اس پروگرام کی تکمیل کے ساتھ ہر ایک منزل پر تربیت یافتہ اساتذہ کی تعداد پچہتّر فیصدی ہو سکے گی۔ اساتذہ کی تربیت کی ان باضابطہ کوششوں کے ساتھ ساتھ توسیعی پروگرام اور اعادی نصاب کے ذریعے بھی تربیت یافتہ اساتذہ کی تعداد میں اضافہ کرنے کے لئے انتظامات کئے گئے ہیں۔ ہمارے سابقہ قومی منصوبے کے دوران میں سائنس اور حرفے کے اساتذہ کی خاصی کمی رہی۔ تیسرے منصوبے میں چار ایسے علاقائی کالجوں کو قائم کیا جا رہا ہے جو سائنس اور مخصوص صنعت و حرفت سے متعلق مضامین کے اساتذہ تیار کریں گے۔ تعلیم کے اعلیٰ اداروں میں بھی سائنس کے اساتذہ کی کافی مانگ رہے گی۔ یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس زمانے میں کالجوں میں جو تقریباً ستائیس ہزار مزید اساتذہ درکار ہوں گے، اُن میں سترہ ہزار سائنس کے اساتذہ کی تعداد ہوگی۔ اس کے علاوہ صنعتی تعلیم کے فروغ کے ساتھ نو ہزار مزید اساتذہ انجینئرنگ اور دوسرے فنی مضامین کے اداروں کے لئے مطلوب ہیں۔ اس سلسلے میں متعدد فوری اور وقتی اقدام کئے جا رہے ہیں تاکہ فنی ماہرین کی تعداد میں جلد از جلد اضافہ ہو سکے مگر ان تمام تدابیر کے باوجود تیسرے منصوبے کے زمانے میں بھی ایسے اساتذہ

کی کمی قائم رہے گی صنعتی اداروں کے لئے حرفے کے اساتذہ کی تعداد میں بہت کچھ اضافہ دوسرے قومی منصوبے کے دوران میں ہو چکا ہے۔ اس وقت ان اساتذہ کی تربیت کے لئے چار مرکزی ادارے موجود ہیں جو پانچ سو پچاس اساتذہ تیار کرتے ہیں۔ اب ان کے اندر اساتذہ کی تعداد ایک ہزار ہو جائے گی اور مزید تین ادارے قائم کئے جائیں گے۔ جو آٹھ سو استاد تیار کر سکیں گے۔ اس طرح اس تیسرے منصوبے کے اختتام تک آٹھ ہزار اساتذہ تیار ہو جانے کی توقع کی جاتی ہے۔ تاہم کثیر المقاصد ثانوی مدارس میں حرفے کے جتنے اساتذہ کی ضرورت ہے وہ اس سے پوری نہ ہو سکے گی۔

ہمارے یہ اقدام حوصلہ افزا تو ضرور ہیں لیکن مکمل نہیں کہے جا سکتے۔ اس باب میں مزید توجہ اور غیر معمولی مالی وسائل کی ضرورت ہے۔ کیونکہ تعلیم ہی سب سے موثر وہ واحد ذریعہ ہے جس کی مدد سے تیزی کے ساتھ دیس کے اندر اقتصادی ترقی، فنی مہارت اور صنعتی سوجھ بوجھ پیدا کی جا سکتی ہے۔ تاکہ جلد از جلد ایسا سماجی نظام قائم ہو سکے جہاں آزادی، سماجی انصاف اور افراد کو ترقی کے یکساں مواقع فراہم ہوں۔ لیکن اس علم و عمل کی کشتی کو کھینے والے یہ اُستاد ہیں جنھیں اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی کے لئے جذبۂ دل کے ساتھ ساتھ نہ صرف تربیتِ فکر و نظر درکار ہے بلکہ کسی قدر آسائشِ تن اور اِک سکونِ دل' بھی چاہیئے۔

"مُعلّم"

کوائف جامعہ

شیخ الجامعہ صاحب کی واپسی

شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب پانچ ماہ کے بعد، فروری کے پہلے ہفتہ میں جامعہ واپس تشریف لائے۔ موصوف کا زیادہ تر قیام مونسریل (کنیڈا) میں رہا۔ جہاں وہ میکگل یونیورسٹی کے ادارہ اسلامیات کے وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے تشریف لے گئے تھے، لیکن اسی زمانے میں متحدہ ریاستوں کی ریاست انڈیانا کے ایک ٹیچرس کالج میں بھی کچھ عرصہ قیام کیا اور وہاں لکچر دیئے اس کے علاوہ لندن، میونخ (مغربی جرمنی) اور پیرس بھی تشریف لے گئے۔

واپسی کے بعد جامعہ کے تمام تعلیمی اداروں اور اساتذہ اور طلبہ کی انجمنوں میں موصوف کو مدعو کیا گیا، جن میں انھوں نے یورپ وامریکہ کی موجودہ زندگی اور تہذیب وتمدن کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کئے۔ ہماری درخواست پر موصوف نے اپنے تاثرات قلم بند کر دئے ہیں اور وہ اس شمارہ میں شائع ہو رہے ہیں۔

ہندوستان کے مختلف ادب پر سمپوزیم

استادوں کے مدرسے کے طالب علموں کی لٹریری سوسائٹی نے ہندوستان کی اہم زبانوں کے ادب پر ایک سمپوزیم کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ سمپوزیم کی ابتدا ۱۶ر جنوری کو اردو ادب سے کی گئی ہے۔ اس جلسے کے مقرر خاص دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے قائم مقام صدر جناب ظہیر احمد صدیقی تھے۔ سمپوزیم کا افتتاح قائم مقام شیخ الجامعہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے فرمایا۔ موصوف نے اپنی افتتاحی تقریر میں فرمایا کہ آج کل جذباتی ہم آہنگی اور قومی یکجہتی کا ملک میں بڑا چرچا ہے، لیکن اس کا احساس ابھی پوری طرح نہیں ہے۔ جنگ آزادی کے موقع پر تو ایک ہونے کا احساس تھا لیکن آج ملک کی آزادی کے بعد یہ احساس کمزور پڑ گیا ہے۔ آج جب ہر طرف ترقی کی کوششیں ہو رہی ہیں تو

یکجہتی کی زیادہ ضرورت ہے، لیکن ہوا یہ کہ چھوٹی وفاداریوں کی اہمیت بڑھ گئی مثلاً صوبہ پرستی میں اضافہ ہوا ہے، زبان کے جھگڑے زیادہ بڑھ گئے ہیں کنبہ پروری اور ذات پات کا زیادہ خیال کیا جانے لگا ہے۔ یہ اس بہات کی علامت ہے۔ الگ ہونے کا جذبہ بڑھ گیا ہے اور ایک ہونے کا کم ہوگیا ہے۔ یہ تباہی اور بربادی کی نشانی ہے" آپ نے جذباتی ہم آہنگی اور قومی یکجہتی کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ "ہم آہنگی کے معنی یہ ہیں کہ ایک ہی طرح کی چیزیں ایک ہی طرح کا جذبہ طاری کریں، احساسات اور میلانات پر جو جذبات اثر ڈالنے والے ہیں، وہ یکساں اثر ڈالیں۔ ادب، شاعری، مصوری، موسیقی یہ تمام چیزیں انسان کے جذبات پر اثر ڈالتی ہیں، بعض خوشی کا جذبہ پیدا کرتی ہیں، بعض جذبات کو ابھارتی ہیں، بعض غم والم کا جذبہ پیدا کرتی ہیں، ان میں ایسی ہم آہنگی ہونی چاہیئے کہ یہ سب اچھے جذبات کو ابھاریں اور ملک کا اتحاد اور قومی یکجہتی اور مضبوط ہو۔ ہندوستان کی حالت یہ ہے کہ تہذیب و معاشرت میں بڑی حد تک یکسانی ہے، مگر اس کے باوجود زبانیں الگ الگ ہیں۔ زبانوں کے اختلاف نے جذباتی یکجہتی پر پردہ ڈال رکھا ہے۔ مثلاً ٹیگور کی شاعری سے لطف نہیں اٹھا سکتے اگر آپ بنگلہ سے واقف نہ ہوں۔ اگر آپ ایک دوسرے کی زبان سمجھنے لگتے ہیں اور زبان کا پردہ ہٹ جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اور ان کے جذبات ایک ہیں، سوچنے کا ڈھنگ ایک ہے، اور خیالات بڑی حد تک یکساں ہیں۔ آپنے ہندوستان کی مختلف زبانوں کی خصوصیات اور ان کے ادب سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے سیموزیم کا جو سلسلہ شروع کیا ہے مجھے امید ہے کہ اس سے قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی کو بڑی مدد ملے گی۔"

اس کے بعد جناب ظہیر احمد صدیقی صاحب نے اپنی تقریر شروع کی۔ موصوف کی تقریر کا عنوان تھا۔ "ہندوستانی کلچر میں اردو کا حصہ"۔ فاضل مقرر نے فرمایا کہ "میری تقریر کا عنوان اہم ہونے کے ساتھ پیچیدہ بھی ہے۔ اہم اس لئے کہ اگر کلچر اور ادب کا ربط قائم نہ ہو سکا تو دونوں لفظ مہمل ہو کر رہ جائیں گے پیچیدہ اس لئے کہ جب ہم ہندوستانی کلچر کا ذکر کر رہے ہیں تو ہمارے ذہن میں کونسا کلچر ہے۔ ہندوستان ایک وسیع ملک ہے اور یہاں کے ہر خطہ کی الگ تہذیب، اور جداگانہ زبان ہے پھر مذہب اور رسم رواج جداگانہ ہیں۔ اس لئے کلچر کو ہندوستانی کینوس پر وسیع معنوں میں سمجھنا ہوگا۔

کلچر میں لین دین ہمیشہ رہا ہے اور اس لین دین کو ہندوستانی کلچر میں سب سے زیادہ بہتر طریقہ ک

اردو ادب نے بھا۔ اس لئے کہ اردو ادب کی ایک مشترکہ میراث تھی مختلف رجحانات اور احساسات کی اور یہی سبب ہے کہ کلچر میں جو رنگا رنگی نظر آتی ہے وہ اُردو ادب کا احسان ہے۔

یہ ضرور ہے کہ مغربی ادب کو ہندوستان میں بنگالی ادب نے متعارف کرایا۔ مگر انگریزوں کی آمد پر جو کشمکش لوگوں کے ذہن میں پیدا ہوگئی تھی اور اس سے جو تنقیدی شعور اجاگر ہوا اس کا اردو ادب ہی میں اظہار ملتا ہے۔

اردو ادب کا ایک اہم ادارہ مشاعرہ ہے۔ ہندوستانی کلچر میں اس کا ایک اہم رول رہا ہے۔ مغلیہ تہذیب کی نمائندگی کرنے کے ساتھ ہندو مسلمانوں کو ایک اسٹیج پر یہ ادارہ ہی لایا۔ ہندو مسلمانوں میں استادی اور شاگردی کا رشتہ جو ماں باپ اور اولاد سے زیادہ مستحکم ہوتا۔

یہ ضرور ہے کہ اُردو شاعری کا ایک بڑا سرمایہ عربی اور فارسی سے ماخوذ ہے مگر یہ بھی اردو ادب کا احسان ہے کہ اس نے عربی اور عجمی تخیلات کو ہندوستان میں اجنبی نہ رکھا۔

سچ پوچھئے تو ہندوستان میں مساوات کا تصور اردو ادب ہی کے ذریعے عام ہوا۔ عربی عجمی برہمن کی تفریقیں یہاں آکر ختم ہوگئیں۔ اردو ادب کا نظریۂ حیات مساوات پر تھا۔ اس لئے برہمن اور غیر برہمن تو بڑی چیز ہے شیخ و برہمن کی تفریق بھی باقی نہ رہی۔

اس سمپوزیم کے سلسلہ میں ۱۰ فروری کو جناب رشید حسن خاں صاحب نے " اردو ادب کا اپنے سماج سے تعلق " پر تقریر کی۔ آپ نے تفصیل سے بتایا کہ اردو ادب میں سماجی حقائق کی مکمل عکاسی ہے۔ اس میں علیحدگی پسندی کے بجائے رواداری، میل ملاپ اور لین دین کا زیادہ گزر ہے۔ موصوف نے فرمایا کہ کسی ملک کی زبان اور اس کے ادب کی اچھائی کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جاتا ہے کہ اس میں دوسری زبانوں کے اعلیٰ ادب کی خوبیوں اور اس کی اچھی باتوں کو اپنے میں سمو لینے کی کتنی صلاحیت ہے۔ ہر زبان کے ادب میں کچھ بنیادی خیالات ہوتے ہیں، جن کا تعلق اس قوم اور اس ملک کی سماجی، مذہبی اور اخلاقی روایتوں سے ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ دنیا کی دوسری زبانوں کے ادب اور وہاں کی کچھ خاص روایتوں کا اثر بھی ڈھکا چھپا مل جائے گا۔ اس میل ملاپ سے زبان اور ادب دونوں کی دولت بڑھتی ہے، دونوں کے پھیلاؤ، بہاؤ اور گہرائی میں اضافہ ہوتا ہے اور ان سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ وہ ادب

جس پر کئی قوموں اور کئی زبانوں کے ہلکے یا گہرے اثرات پڑ چکے ہوں اور اس زبان و ادب میں لیسے گھل مل گئے ہوں جیسے سنگم پر کئی دریاؤں کا پانی مل کر ایک ہو جاتا ہے اُس ادب میں دنیا کے دوسرے رہنے والوں کے دل و دماغ، خیال اور جذبے کو متاثر کرنے کی صلاحیت کچھ اور بڑھ جاتی ہے۔

اس معیار پر اگر ہم اردو زبان اور ادب کو جانچیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ان دونوں میں یہ صلاحیت بہت سی زبانوں سے زیادہ ہے۔ اردو کی ابتدائی ترقی میں صوفیوں کے رسالوں کا بڑا دخل ہے۔ یہ رسالے اردو سے زیادہ اس زمانے کی بولیوں کے آئینہ دار ہیں، اس کا دوسرا دور دکن سے متعلق ہے۔ اس زمانے کے ادب میں فارسی عربی کے لفظوں کے بجائے دکنی لفظ اور اسلوب بیان کا غلبہ ہے۔ اور خیالات میں بھی فارسی کی روایتوں سے کہیں زیادہ وہاں کی مقامی روایتوں کو دخل ہے۔ پھر اس کی ترقی کا زمانہ دہلی میں شروع ہوتا ہے، جہاں زبان کی صفائی، سادگی اور تہذیب پر زور دیا گیا ہے۔ یہ بات بھی سامنے رکھنے کی ہے کہ اردو کوئی مفرد زبان نہیں ہے، وہ کئی زبانوں کے لفظوں کا ملا جلا مرکب ہے۔ دوسری زبانوں کے جو لفظ ہم آج بولتے ہیں، اگر وہ ان زبانوں کو واپس کر دیں تو ہمارے پاس سادہ کا غذ باقی رہ جائے گا۔ غرض اردو کی بنیاد ہی دوسری زبانوں سے بہت کچھ حاصل کرنے پر پڑی ہے۔ اس لئے اس زبان میں اور اس کے ادب میں دوسری زبانوں کی روایتوں خیالوں اور اسٹائل کو اپنانے کی بہت زیادہ صلاحیت ہے۔ شروع سے لے کر اب تک کے اردو ادب کو غور کے ساتھ پڑھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ اس نے ہر زمانے میں اپنی اس روایت کو باقی رکھا ہے۔ کسی زندہ زبان کے ادب کے لئے یہ بات بھی بہت ضروری ہوتی ہے کہ زندگی سے اس کا رشتہ برابر قائم رہے۔ وہ ایسا آئینہ ہو، جس میں ہر زمانے کی طرح طرح کی تبدیلیوں، سیاسی تحریکوں، رسم و رواج اور ملکی حالات کی صاف صاف تصویریں بھی دکھائی دیں۔ اردو ادب کا یہ پہلو بہت روشن ہے۔

اس کے بعد رشید حسن خاں صاحب نے بہت تفصیل سے تبلایا کہ اردو ادب میں ہر دور کے سیاسی و سماجی اثرات کس وضاحت کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔

رورل انسٹی ٹیوٹ کا کانووکیشن

جامعہ رورل انسٹی ٹیوٹ کا تیسرا سالانہ جلسۂ تقسیم اسناد ۱۳ فروری ۱۹۶۲ء کو تین بجے سہ پہر انسٹی ٹیوٹ ہی کے نئے "اوپن ایئر تھیٹر" میں منعقد ہوا۔ پلاننگ کمیشن کے رکن تعلیم جناب ڈاکٹر اے این کھوسلہ نے کانووکیشن کا خطبہ پڑھا اور شیخ الجامعہ صاحب نے جلسہ کی صدارت فرمائی۔

سورۂ فاتحہ کی تلاوت اور اس کے ترجمے کے بعد ڈائرکٹر صاحب جامعہ رورل انسٹی ٹیوٹ ڈاکٹر ہاشم امیر علی صاحب نے اپنی رپورٹ پڑھ کر سنائی جس میں انھوں نے اساتذہ اور طلبہ کی مختلف دقتوں اور مشکلات کے باوجود انسٹی ٹیوٹ کی پچھلی پانچ برس کی کامیابیوں کا ذکر کیا۔ انھوں نے جامعہ کالج اور حکومت ہند کی وزارت تعلیم کا بھی شکریہ ادا کیا۔

ڈائرکٹر صاحب کی رپورٹ کے بعد شیخ الجامعہ صاحب نے ۱۹۶۱ء کے فارغ التحصیل طلبہ کو ڈپلوما تقسیم کئے۔ ڈپلوما دینے سے قبل موصوف نے فرمایا: "میں بحیثیت شیخ الجامعہ، جامعہ کی طرف سے آپ کو یہ سند عطا کرتا ہوں اور تاکید کرتا ہوں کہ اپنے فرائض انجام دینے اور دوسروں کے ساتھ برتاؤ میں ہمیشہ اور ہر طرح سے آپ اپنی دینی اور تہذیبی قدروں اور روایتوں کا پورا لحاظ رکھیں"۔ اس کے بعد شیخ الجامعہ کی درخواست پر ڈاکٹر کھوسلہ نے اپنا خطبہ پڑھکر سنایا، جس میں موصوف نے دیہاتی لوگوں کو اعلیٰ تعلیم دئے جانے کی اہمیت بتائی اور جامعہ رورل انسٹی ٹیوٹ کے کام کو سراہا۔ آپ نے فرمایا کہ جو طلبہ ان اداروں میں تعلیم پا رہے ہیں وہ ملک کی بہت بڑی ضرورت کو پورا کریں گے اور تیسرے پنج سالہ منصوبے کے تحت دیہات کے لئے قومی تعمیر اور ترقی کے جو پروگرام اس وقت چلائے جا رہے ہیں۔ ان کو چلانے کے لئے یہ طلبہ خاص طور پر اہل ثابت ہوں گے۔ اس طرح ان اداروں کا دیہاتی معیشت میں اہم حصہ ہو جائے گا۔ آپ نے فرمایا کہ جامعہ رورل انسٹی ٹیوٹ میں سوشل ایجوکیشن، فنونِ لطیفہ اور سوشل ورک کے کورس پھر سے شروع کر دینے چاہئیں اور اس کے علاوہ کچھ کورس تجارت اور نقشہ نویسی کے بھی کھولنے چاہئیں۔ کچھ اداروں نے زراعتی سائنس کے کورس کے علاوہ سینیٹری انسپکٹر کے لئے بھی کچھ سرٹیفکٹ کورس کھولے ہیں۔ ڈاکٹر کھوسلہ نے فرمایا کہ ان کورسوں کے علاوہ رورل انسٹی ٹیوٹ بالغ لوگوں اور عام آدمیوں کی مزید تعلیم میں کافی مدد دے سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر اپنی توسیعی خدمات کے ذریعہ وہ کسانوں، دستکاروں، معمولی تجارت کرنے والوں اور گھر گرہستی والی عورتوں کو بھی ان کے روزمرہ کے کام میں مفید مشورہ فراہم کر سکتے ہیں۔

آپ نے یہ بھی فرمایا کہ سول اور رورل انجینئرنگ کے کورس میں عملی تعلیم کے ساتھ یہ بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ طلبہ تعلیم کے ساتھ ساتھ کچھ روپیہ پیسہ بھی کما سکیں۔

ڈاکٹر کھوسلہ کے اس خیال میں کامیاب طلبہ کو عطا کی جانے والی ڈپلوما کی سندیں زندگی کی دشواریوں کو حل کرنے کا وسیلہ یا پاسپورٹ ہیں۔ اور ان کے ذریعہ طلبہ اچھا روزگار حاصل کر سکیں گے۔

رابندرناتھ ٹیگور کی مشہور دعائیہ نظم ڈائرکٹر صاحب کے ساتھ سب نے کھڑے ہو کر پڑھی اور قومی ترانہ کے بعد یہ تقریب ختم ہوئی جلسہ میں شرکت کرنے والوں کی تعداد کافی تھی اور یہ حسن اتفاق تھا کہ دوسرے رورل انسٹی ٹیوٹ کے طلبہ بھی اس موقع پر موجود تھے جو آل انڈیا انٹر رورل انسٹی ٹیوٹ کے مباحثے کے مقابلوں میں حصہ لینے کے لئے پہلے ہی سے آئے ہوئے تھے۔

بیان بابت ملکیت رسالہ و دیگر تفصیلات

(فارم نمبر۴)

مقام اشاعت : جامعہ نگر۔ نئی دہلی نمبر ۲۵

وقفۂ اشاعت : ماہانہ

پرنٹر، پبلشر اور اڈیٹر کا نام : عبد اللطیف اعظمی

قومیت : ہندوستانی

پتہ : جامعہ نگر۔ نئی دہلی

ملکیت : جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ دہلی

میں عبد اللطیف اعظمی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم اور یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط پبلشر: عبد اللطیف اعظمی

۲۵ فروری سنہ ۱۹۶۲ء

مطبوعہ یونین پرنٹنگ پریس دہلی ۶

صرف ٹائٹل دیال پریس دہلی ۶ میں چھپا

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی



میٹھے اور پکے ہوئے انگوروں کے گچھے

روح افزا کے لیے

قدرتی اجزا کی روح سے تیار کیا ہوا مشروب

قدرت کی طرف سے انسان کو عطا کیے ہوئے انیس ۱۹ اجزا سے
کشید کردہ ایکسٹریکٹ کا نام روح افزا ہے۔
ان قدرتی اجزا میں سے ہر ایک جزو جیسے کاسنی، دھنیا، خرفہ، تربوز،
سنترے کا رس اور انگور وغیرہ جسم اور دماغ کو تازگی دینے کے لیے مشہور ہیں۔

ہر روز

روح افزا پیجیے

جو خاص طور پر موسم گرما میں آپ کے
نظامِ جسم کو تازگی اور ٹھنڈک بخشتا ہے



ہمدرد دہلی، کانپور، پٹنہ

جامعہ

سالانہ چندہ
چھ روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس نئے پیسے

جلد ۴۶	بابت ماہ اپریل ۱۹۶۲ء	شمارہ ۶

فہرست مضامین

والسانی
... حاصل نہیں کرتا رہا ہے بلکہ ۱۸۷۰ء میں

بڑی الجھن میں رہتا ہے، اور یہی الجھن اس میں تنہائی کا احساس پیدا کرتی رہتی ہے۔ علمی اور شخصی آزادی اس الجھن کو کم کرنے کے بجائے اور بڑھاتی ہے۔ علم کے معنی ہیں حقیقت کی تلاش، یہ تلاش جاری ہے، مگر اتنے عرصہ تک جاری رہ چکی ہے کہ جب تک کوئی نئی اور انوکھی بات نہ کہی جائے، اس کا کہنے والا تلاش میں شریک نہیں سمجھا جاتا، اور پرانی بات کو دہرانے اور اس کو صحیح ماننے کے لئے جو ہمت چاہیئے وہ صرف انہیں لوگوں میں ہوسکتی ہے جن کی پشت پر ہم خیال لوگوں کی جماعت ہو۔ نئی اور انوکھی بات کہنے والے شاعر، ادیب، ڈراما نویس، مصور، مفکر ہوتے ہیں، ان کی شخصیتیں ایسی نہیں ہوتی ہیں کہ جماعتی زندگی کی نئی طرح ڈال سکیں۔ ان کے تصورات اور خیالات کا محرک بڑی حد تک وہی تنہائی کا احسا[س] ہوتا ہے جو دوسروں کو پریشان رکھتا ہے۔ پریشانی کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ عادت بن جاتی ہے، اور جیسے نشہ کی عادت نشہ آور چیز کے استعمال سے بڑھتی ہے، پریشان طبیعت میں یہ میلان پیدا ہوجاتا ہے کہ اپنی کیفیت میں شدت پیدا کرے، اور اسی کو علاج سمجھے۔ انسان کا اپنے آپ کو کسی دھوکے میں رکھنا برا ہے، اور یورپی ادب میں حقیقت نگاری کی جو تحریک پچھلی صدی سے شروع ہوئی اس نے یورپی سماج کو اس کے بہت سے عیبوں سے آگاہ کردیا۔ لیکن محض حقیقت نگاری نفسیا[تی] اور روحانی مسائل کو حل نہیں کرسکتی۔ اگر اسے حق کی تلاش سمجھا جائے تو اس سے حقیقت نگاری [پر] کسی نہ کسی حد تک یہ ذمہ داری ضرور آتی ہے کہ وہ حق کے تصور کو بھی واضح کرے۔ شروع ک[ے] حقیقت نگار سماجی عیبوں اور نظر کے فریبوں کی پردہ دری کرکے کوئی نتیجہ نکالا کرتے تھے، اب سماج اور افراد کی اصلاح اور تربیت کا خیال ادب سے بالکل خارج کردیا گیا ہے، اور حقیقت نگاری آپ اپنا مقصد بن گئی ہے۔ ادبی ذوق لطف اندوزی کی ایک شکل ہے، اور ن[...] اور عام رواداری اشتہار کا اسی طرح پابند جیسے کہ خواتین کا لباس اور وضع قطع فیشن کی۔ دوسری طر[ف] انسان کی طبیعت کیفیتوں کا ایسا خزانہ ہے کہ بیان کرنے والے کی استعداد اور توفیق کو آزماتا ر[ہتا] ہے، اور کوئی بھی اس کا دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس نے انسان کے بارے میں جو کچھ کہا جا سکتا ہے کہہ دیا ہے۔ اس سب کا نتیجہ یہ ہے کہ آئے دن نئی حقیقتوں کا انکشاف ہوتا رہتا ہے اور انکشاف یہ ظاہر کرتا ہے کہ آدمی اب بھی حقیقت سے بہت دور ہے۔

حقیقت نگاری کی ادبی تحریک کو فروغ دینے میں کلیسائی مذہب کا ردِّعمل بھی شامل تھا۔ ہر مذہب کے ماننے والے سمجھتے ہیں کہ مذہب کی پیروی کرنے میں سلامتی ہے، اس سے دنیاوی زندگی بنتی ہے، اور عاقبت کا بھی مناسب انتظام ہوجاتا ہے۔ عیسائی مذہب بھی سلامتی کا ایک تصوّر پیش کرتا ہے۔ کلیسا اور عیسائی ملت کے روشن خیال باعلمی اور ادبی ذوق رکھنے والوں کے درمیان جو عداوت پیدا ہوگئی اس کی وجہ سے سلامتی کے اس تصور پر حملے کئے گئے، عقیدے اور اخلاق کی حیثیت حکم کی سی نہیں رہی، بلکہ عملاً اور اصولاً اختیاری ہوگئی، اور جوابدہی کی ذمہ داری اس شخص پر نہیں رہی جو اختیار کا غلط استعمال کرتا بلکہ اس شخص پر جو اختیار سے کام نہ لیتا، اور پرانے طریقے کو کافی سمجھتا یہی ردیہ بے چینی کا ایک اور سبب بن گیا ہے۔ بیشتر لوگ غلط اور صحیح کے درمیان تمیز کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور اس کی ذمہ داری نہیں لینا چاہتے، لیکن حالات نے ان کو خودمختار بنا دیا ہے۔ کلیسا اور مذہب کی رہنمائی وہ قبول نہیں کرسکتے، علم اور ادب بھی مانے ہوئے سماجی اصولوں اور طریقوں کی جانچ میں لگے ہوئے ہیں اور خود سماج فیشن اور اشتہار کے جال میں پھنسی ہوئی ہے۔

مذہب اور یورپ اور امریکہ کی موجودہ ذہنیت کے درمیان میل کرانے میں ازلی گناہ کا عقیدہ اور رہبانیت کا تصور بڑی رکاوٹیں ہیں۔ مسلمان کو اس کا یقین نہیں ہے کہ آدم اور حوا بہشت سے نکالے گئے تو انھوں نے واقعی کوئی جرم کیا تھا۔ عیسائی تعلیمات کے مطابق یہ اتنا بڑا گناہ تھا جس کا کفارہ خدا کا بیٹا دنیا میں آکر اور صلیب پر چڑھ کر ہی ادا کرسکتا تھا۔ اس دینی منطق کا حق ادا کرنے کے لئے جو آدم اور حوا کے گناہ کا سلسلہ حضرت عیسےٰؑ کے صلیب پر چڑھنے سے ملاتی ہے ضروری ہے کہ ہر عیسائی اپنے آپ کو پیدائشی گنہگار اور سزا کا مستحق سمجھے، اور حضرت عیسیٰؑ کے اس احسان کا ہر طرح سے اعتراف کرے کہ انھوں نے اپنے آپ کو قربان کرکے اسے عذاب سے بچایا۔ عیسائی مذہب میں رہبانیت کی طرف قوی میلان بھی ہے۔ نفس پر قابو رکھنے کے لئے ایک حد تک نفس کشی لازمی ہے، عیسائی تعلیمات نے حضرت عیسیٰؑ کی عظیم الشان مثال کو معیار مان کر نفس کشی کو ایک اعلیٰ دینی مقصد کا مرتبہ دے دیا۔ کلیسا نے بے شک دنیاداروں کے لہو ولعب اور نفس پرستی کو گوارا کیا، مگر نیک اور پاک زندگی اسی کو مانا جس میں نفس کشی نمایاں ہو۔ یورپ کی بڑھتی

ہوئی تہذیب نے انسان اور انسانی خواہشوں کو وہی مرتبہ دینا چاہا جو قدیم یونان نے دیا تھا، اور سولھویں صدی میں فرانسیسی ادیب رابلے نے فخریہ لکھا کہ ہنسنا انسان کا حق اور اس کی امتیازی صفت ہے۔ مگر انسان کی گنہگاری ایسا مسئلہ نہیں ہے جو ہنسی کے بل پر طے کر دیا جائے۔ انسان کی پیدائشی معصومیت ایک عقیدہ ہے، جو علم اور تجربے سے ثابت نہیں کیا جا سکتا، اور اسلام کی اس تعلیم کے باوجود کہ انسان معصوم پیدا ہوتا ہے گناہ اور شیطان کے وسوسہ کا خوف مسلمانوں کے ذہن پر حاوی رہا ہے۔ یورپی تہذیب کا میلان انسان کو معصوم قرار دینے کی طرف تو نہیں مگر اسے مجبور قرار دینے کی طرف رہا ہے۔ اور ازلی گناہ کی تعلیم صرف اس علم سے نہیں ٹکراتی ہے جو ماحول کو انسان کے بننے بگڑنے کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے بلکہ انسانی خودداری کے اس تصور سے جو علم کی ترقی نے یورپ اور امریکہ میں رفتہ رفتہ پیدا کیا ہے، اس وقت وہاں یہ کہنا کہ جنسی جذبات شیطانی وسوسہ ہیں یا زنا کرنا گناہ ہے انسانی فطرت کی توہین کرنے کے برابر ہے اگرچہ ان لوگوں کی عزت کی جاتی ہے جو اپنی طبیعتوں کو قابو میں رکھتے ہیں۔ اسی طرح نفس کشی کے دینی اور اخلاقی ورثہ کو یورپ اور امریکہ میں اسی نظر سے دیکھا جاتا ہے جیسے کسی پرانے اور بھدے رواج کو، اور اس کے علاوہ یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ نفس کشی کی تعلیم دینا صنعتی ترقی کو غلط اور مضر ٹھہرانا ہے۔ یورپی انسانیت کی مثال گوئٹے کا ڈاکٹر فاوسٹ ہے، جس نے کامل علم اور ہمہ گیر تجربہ کی خاطر اپنی روح کو شیطان کے ہاتھ بیچ دیا۔ اس وسودے کو وہ تمام لوگ برا کہیں گے جو علم اور تجربے سے ڈرتے ہیں، مغربی تہذیب نے یہ سودا کیا ہے اور شوق سے کیا ہے۔ وہ موت سے بے شک ڈرتی ہے اور بہت ڈرتی ہے، مگر اس کی وجہ سے علم اور تجربے کے حق سے دست بردار ہونا یا اس کے میدان کو تنگ کرنا نہیں چاہتی۔

یورپ امریکہ میں ڈاکٹر ایلبرٹ شوائٹزر کی بڑی قدر ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی افریقہ کے وحشیوں کی طبی خدمت کے لئے وقف کر دی ہے، اور حضرت عیسیٰ اور مہاتما گاندھی کی طرح قول اور عمل سے ایثار اور عدم تشدد کی تعلیم دیتے ہیں۔ بعض حلقوں میں ہندوستان کی رہنمایانہ کی بھی قدر ہے۔ ریڈ کراس کے بین الاقوامی نظام سے اور معاشی اعتبار سے پس ماندہ قوموں کی امداد کے جو مختلف طریقے اختیار کئے گئے ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ یورپ اور امریکہ میں انسانی ہمدا

کا جذبہ بہت قوی ہے، اگرچہ اسے ہر قدم پر سیاسی اور معاشی خود غرضی کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے
پہلی اور دوسری عالم گیر جنگوں نے تہذیب اور ترقی پر جو اعتبار تھا اس کو بہت کم کر دیا ہے۔ اور
اس وجہ سے اب ایسے سہاروں کی تلاش ہے جو ایٹم بم کی زد میں نہ ہوں ۔ کلیسا اور کلیسائی
مذہب کے ماننے والے اور ان کی مخالفت کرنے والے اب بھی ہیں، گناہ کا لفظ سن کر ناک بھوں
چڑھانے والے بھی ہیں، سب سے زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہے جو بغیر سوچے سمجھے زندگی گذارتے
ہیں، مگر ساتھ ہی ایک تحریک شروع ہوئی ہے کہ تمام مذہبوں کا احترام کے ساتھ مطالعہ کیا جائے
تنگ نظری کو دور کیا جائے، اور کسی نظام کی ماتحتی قبول کئے بغیر دینی جذبے کی ایسی تربیت
کی جائے کہ وہ انسانوں اور انسانی زندگی کو راہِ راست پر لا سکے گویا اب مغربی تہذیب
کا ایک علمی اور دینی منصوبہ غالب کے اس شعر کی تشریح ہے ۔

سر از حجاب تعین اگر بروں آید
چہ جلوہ ہا کہ بہر کیش می تواں کردن

غزل

حضرتِ مرزا احسان احمد

ذوقِ نظر تو دیکھئے ایک گدائے راہ کا
رنگ بدل دیا تمام حسن کی جلوہ گاہ کا

دستِ جنوں دراز کر، کام نہیں ہے آہ کا
پایہ بہت بلند ہے عشق کی بارگاہ کا

لطف اسی سے کچھ اُٹھا، طاقتِ دید بھی کہاں
شکوۂ رائگاں نہ کر خیرگیٔ نگاہ کا

گرم طواف جس کے گرد کعبہ و بتکدہ ہیں سب
ہے وہ خرام بےخودی عشق کے مرد راہ کا

چاہیئے اس کو اور کیا لذّتِ زیست کے لئے
حوصلہ ہو جسے نصیب غم سے ترے نباہ کا

لذّتِ خستگی سے گر دل نہیں آشنا ترا
طالبِ فیض پھر نہ بن عشق کی درسگاہ کا

چھوڑ دیں ہم تو میکدہ دل یہ مگر ہے کہہ رہا
کوئی مقام بھی تو ہو اس کے سوا پناہ کا

خار و خسِ چمن بھی دیکھ، یہ بھی ہیں زینتِ چمن
جانبِ گل ہی کیوں فقط رخ ہے تری نگاہ کا

اہلِ خرد کا کارواں کھائیگا یوں ہی ٹھوکریں
مل نہ سکا اگر نشان پیرِ مغاں کی راہ کا

بزمِ جہاں سجائی ہے اہلِ ہنر نے گو بہت
کر نہ سکے مگر علاج کچھ بھی دلِ تباہ کا

شکوۂ بے رخی نہ کر، اس کی نزاکتیں سمجھ
تجھ کو ہے ذوق کچھ اگر حسن سے رسم و راہ کا

جس نے بدل دیا جہاں میری نگاہ میں تمام
شکر ہو کس طرح ادا آپ کی اس نگاہ کا

المیہ کیا ہے؟

پروفیسر اسلوب احمد انصاری

یوں تو ڈرامہ کی کسی شکل کا تصور بھی عمل کے بغیر ممکن نہیں، لیکن المیہ کے اجزائے ترکیبی میں تو عمل، کشمکش اور نقطۂ عروج کو جو اہمیت حاصل ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں۔ ارسطو نے اپنی معروف کتاب بوطیقا میں المیہ کی تعریف ہی ان الفاظ میں کی ہے کہ وہ ایک ایسے سنجیدہ عمل کا نقشہ ہے، جو اپنی جگہ مکمل جزو اور اپنے اندر ایک خاص عظمت اور طوالت رکھتا ہے۔ پھر المیہ کی ہیئت کی تفصیل میں ارسطو نے پلاٹ کو کرداروں پر فوقیت دی ہے۔ ارسطو کا یہ نظریہ ممکن ہے بعض لوگوں کو مبالغہ آمیز اور عام تجربے کے خلاف معلوم ہو، لیکن غور کرنے پر پتہ چلیگا کہ اس میں ایک ہمہ گیر صداقت پنہاں ہے۔ اور اسطرح یہ ارسطو کی مخصوص بصیرت کا آئینہ دار ہے؛ کیونکہ ناول اور ڈرامہ دونوں میں صورتِ حال (Situation) ہی کے ذریعہ کرداروں کا ارتقار اور ان کی باہمی کشمکش نمایاں ہوتی ہے۔ پلاٹ کو چاہے آپ کہانی کہیں یا موضوع فکر، زندگی کی ایک قاش کا مرادف سمجھیں یا واقعات کے فریب تسلسل کا، کوائف کی ترتیب کا نام دیں یا خارجی تانے بانے کا، بہر صورت اس میں شبہ نہیں کہ یہی ایک وسیلہ ہے جس کے ذریعہ کرداروں کی شخصیتوں کے تہ در تہ حجابات نظر کے سامنے سے اٹھتے ہیں، یہی ایک کھونٹی ہے، جس کے توسط سے ہماری نظریں شخصیت کے چند نقوش یا گوشوں پر جم جاتی ہیں۔ المیہ اور طربیہ کے کرداروں میں جو فرق ہے، وہ بھی عمل کی نوعیت کے اس اختلاف ہی سے متعین ہوتا ہے، جو ان دونوں قسم کے ڈراموں کی کائنات میں جاری و ساری رہتا ہے۔ ناول میں بھی وہی مقامات توجہ کو جذب کرنے اور حافظہ میں محفوظ ہو جاتے ہیں، جہاں ناول کا پرسکون اور مجبط عمل کسی خاص موڑ پر پہنچ کر توانائی اور شہرت کے نقطہ کو چھولیتا ہے اور پڑھنے والے کے شعور اور ادراک میں حشر سامانی پیدا کر دیتا ہے۔ دراصل کردار خلا میں سانس

نہیں لیتے، اور نہ صرف تصور میں اپنی قوتوں کو شکار کر سکتے ہیں۔ ان کی اچھائی اور برائی قوت اور کمزوری رفعت اور پستی، ان کا جذبۂ مدافعت اور جذبۂ تسلیم و رضا، ان سب کا انحصار اس عمل پر ہوتا ہے، جو المیہ کی بساط پر پھیلا ہوا ہے۔ اس آئینے میں کرداروں کی شخصیتوں کے ہلکے اور گہرے نقوش ابھا گر ہوتے، اور پورے ڈرامہ کی فضا کی تشکیل کرتے ہیں۔ آج بھی جبکہ تحلیلِ نفسی کے نظریات اور پروسٹ جیمس جوائس اور ورجینیا وولف کے عملی اقدامات کی بدولت پلاٹ اور کردار کے مروجہ تصورات یکسر بدل چکے ہیں، کوئی شخص پلاٹ اور موضوع یا وسیع مفہوم میں عمل کے تقدم سے انکار نہیں کر سکتا۔ ڈرامہ میں عموماً اور المیہ میں خصوصاً کشمکش کا عنصر بنیادی ہے۔

ہیگل نے اس کشمکش کی توجیہہ اپنے مخصوص فلسفۂ زندگی کی روشنی میں کی ہے۔ ہیگل عقلِ محض کا پجاری ہے، اور اس لیے وہ اس کشمکش کو بھی جو المیہ کی روحِ رواں ہے، ریاضیاتی قسم کے فارمولوں سے سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ ہیگل تقدیر کو عقل پرستی کے تابع کر دیتا ہے۔ (Destiny is Rational) اور اس کا خیال ہے کہ المیہ میں نیکی کا تصادم نیکی سے ہوتا ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ کشمکش کا سرچشمہ یہ حقیقت نہیں ہے کہ ایک طرف چند اعلیٰ قدریں ہیں، اور دوسری جانب وہ موانعات ہیں، جو ان قدروں کو شکست دینا چاہتے ہیں، یا واقعاتی اور علیتی کائنات کے درمیان لامتناہی اور ناگزیر پیکار ہے۔ یا کرداروں کی ذہنی اور روحانی زندگی ان قوتوں سے متصادم ہے، جو شر کی نمائندگی کرتی ہیں۔ بلکہ ہیگل کا نظریہ پرانے شاعرانہ انصاف (Poetic Justice) کے نظریہ ہی کی توسیع ہے۔ ہیگل نے المیہ کے سلسلے میں اپنی تعمیمات کی بنیادیں سافیکلیس کے ڈرامے اینٹی گون پر رکھی ہیں۔ اور کریون اور اینٹی گون کے اعمال کو توڑ موڑ کر پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ ہیگل کے اس طریق استدلال میں جو سقم ہے، اسے گوئٹے کی شفاف اور بے خطا بصیرت قبول نہیں کر سکی اور اس نے محسوس کر لیا کہ المیہ کے تصور میں جو ایک ناقابلِ حل اور پُراسرار کیفیت مضمر ہے، اسے ہیگل نے اپنی سیاسی اور فلسفیانہ خیالات کی مدد سے قابلِ فہم بنانے کی جدوجہد کی ہے۔ اگر ہیگل کے نظریہ سے بجنسہٖ اتفاق کر لیا جائے، تو المیہ کی پوری روح ہی ختم ہو جائے۔ اور بہت سے المیہ کردار اور واقعات بے معنی معلوم

ہونے لگیں۔ ہیگل کے نظریہ کی روشنی میں واقعاتِ کربلا، جنہوں نے لاتعداد انسانوں کے جذبات واحساسات میں تموج پیدا کیا ہے، اپنی اثرانگیزی کھو دیتے ہیں۔

ہیگل کی رائے میں المیہ کرداروں کی کمزوریاں، المیہ کا جواز ہیں۔ یعنی چونکہ ان شخصیتوں میں وہ کمزوریاں بالطبع موجود تھیں، اور اب راسخ ہو چکی ہیں، اس لئے ہمیں ان کے انجام پر متعجب نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ علت اور معلول کے ہمہ گیر اصول کی روشنی میں ان کے انجام کا رشتہ اُن کی خامیوں سے جوڑ کر پورے المیہ کو ایک عقلی کل یا ایک عقلیت پر مبنی نظام سمجھ کر تحیر و تاسف کے بغیر قبول کر لینا چاہیئے۔ جس طرح ہیگل کا یہ نظریہ صحیح نہیں، اسی طرح ارسطو کا یہ خیال بھی غور طلب ہے کہ جب تک المیہ کردار میں عظمت، بلندی اور غیر معمولی خوبیوں اور صلاحیتوں کے ساتھ ہی کسی کمزوری، خامی اور عجز کی آمیزش نہ ہو، ہم دراصل اس کے المیہ کی قدر و قیمت متعین نہیں کر سکتے۔ شیکسپیئر کے المیہ ڈراموں میں بھی ہمیں مخصوص کرداروں کی سیرت کی تعمیر میں شروع ہی سے خرابی کی ایک صورت نظر آتی ہے۔ اور اسی لئے یہ کہا گیا ہے کہ یہ سیرت ہی ان کی تقدیر کی خالق ہے۔ لیکن اگر اس اصول کو بہ تمام و کمال قبول کر لیا جائے، تو بے شمار ناول، بے شمار ڈرامے، اور بیشمار مذہبی اور غیر مذہبی واقعات جنہوں نے انسانوں کے سینوں کو غمکدہ بنایا ہے، باطل قرار دے دئے جائیں گے۔ المیہ کے مؤثر ہونے میں فی الحقیقت جو عنصر بنیادی حیثیت رکھتا ہے، وہ حادثۂ عظیم Catastroph کا عنصر ہے۔ تجربہ اس بات کا شاہد ہے کہ جب ہم کسی کردار کو کسی آفتِ ناگہانی کا شکار بنتے دیکھتے ہیں، تو اس سے چشم زدن میں ہمارے جذبۂ ہمدردی یا رحم کو تحریک پہنچتی ہے۔ غیر منفصل ردِ عمل کے دوران میں ہم نجی ذمہ داری کے اصول کو کلیتہً فراموش کر جاتے ہیں۔ ہمارے لئے یہ بات قطعی غیر اہم ہوتی ہے کہ جس شخص پر یہ بپتا پڑی ہے، وہ اس کا مستحق ہے یا نہیں، اور کس حد تک یہ ابتلا اس کے اپنے اعمال کا پھل ہے، اور کہاں تک بے رحم قوتوں کی سفاکی کا نتیجہ۔ یہ سب امور ہماری توجہ کا مرکز اس وقت بنتے ہیں، جب ہم اپنے تاثرات کی بنیاد پر کوئی فلسفیانہ عمارت کھڑی کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس کے لئے ہمیں ایک نظم، ایک منطق،

ایک ہم آہنگی، اور تطابق کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس بالائی عمارت کی تعمیر میں ہمارے قیاسی تعصبات اکثر راہ پا جاتے ہیں جس کی ایک بیّن مثال میں آگے چل کر دوں گا۔

تو عام تجربہ کسی قدر ارسطو کے نظریہ کی تکذیب کرتا ہے، تاہم یہ امر قابل لحاظ ہے کہ ارسطو نے المیہ کردار میں غیر معمولی صلاحیتوں کے ساتھ ہی کسی خانی محرومی یا کمی کی موجودگی کو کیوں ضروری قرار دیا۔ بات یہ ہے کہ المیہ کردار کو اگر ہم معصومیت کا مجسم تصوّر کر لیں، تو اس آفتِ عظیم کا جس سے وہ دوچار ہوا ہے، اتنا شدید ردِ عمل ہمارے اوپر مرتب ہو گا کہ ہم نقطۂ اعتدال سے متجاوز ہو کر اپنے اندر وہ سکون اور ہم آہنگی پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں گے جو المیہ کا ایک بڑا مقصد ہے۔ اس سلسلہ میں ایک دلچسپ تضاد جس کی طرف ارسطو کے ایک شارح نے ہماری توجہ مبذول کرائی ہے، نظر کے سامنے آتا ہے۔ ارسطو کا کہنا ہے کہ المیہ کا عمل سامعین کے اندر رحم اور خوف کے ان جذبات کو، جو ان کے دل میں پہلے سے موجود ہوتے ہیں، اس حد تک برانگیختہ کرتا ہے، کہ برانگیختگی ایک خاص نقطہ تک پہنچ کر ان جذبات کی واگذاشت کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اور اس طرح ان جذبات کے دباؤ، گھٹن یا ان کی بندگی سے المیہ دیکھنے والے کو نجات دلا دیتی ہے۔ یہ معاملہ خاصا بحث طلب ہے کہ فاضل جذبات سے کیا مراد ہے؟ واقعی برانگیختگی کی انتہا اور اس کا انجام یہی ہے کہ ہمیں ان جذبات کی اطاعت اور غلامی سے خلاصی حاصل ہو جائے۔ افلاطون کی رائے اس کے قطعی برعکس ہے، اور اسی بنیاد پر وہ المیہ اور شاعری کے خلاف ہے۔ بہر حال جس امر کی طرف ارسطو کے مذکورہ بالا شارح نے اشارہ کیا ہے، وہ یہ ہے کہ رحم اور خوف کو ایک خانے میں رکھنا جیسا کہ ارسطو نے کیا ہے، صحیح نہیں ہے، کیونکہ خالص نفسیاتی نقطۂ نظر سے رحم کا تعلق دوسروں سے ہے، اور خوف کا علاقہ اپنی ذات سے ہوتا ہے۔ جب کسی دوسرے کا کسی آفتِ ناگہانی سے سابقہ پڑتا ہے، تو ہمارے دل میں اس کے لئے رحم کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ لیکن جب یہ آفت خود ہم پر پڑنے والی ہوتی ہے۔ تو ہم خوف زدہ ہو کر اسے ٹالنے یا اس سے را

فرار اختیار کرنے کی فکر کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ رحم اور خوف میں وہی فرق ہے، جو احساس اور جذبہ میں ہے۔ احساس میں رحم کی طرح شدت نہیں ہوتی، اور خوف جذبہ کی مانند شدت سے لبریز ہوتا ہے۔ اسی طرح احساس کا تعلق غیر خود سے اور جذبہ کا رابطہ شخصیت کی اکائی سے ہوتا ہے۔ جذبہ میں انانیت ہوتی ہے، احساس میں بے نفسی۔ احساس رحم کی طرح مرکز گریز اور جذبہ اور خوف مرکز جو ہوتے ہیں۔ احساس کسی اور کیلئے ہوتا ہے، جذبہ اپنے لیے۔ اسی طرح رحم اور ترس دوسروں کے مصائب سے متحرک ہوتے ہیں، خوف تحفظِ ذاتی کے سلسلہ میں ابھرتا ہے۔ ان دونوں الفاظ کو ایک خانے میں رکھنے کی توجیہ ایک طرح سے البتہ کی جاسکتی ہے اور وہ یہ کہ چونکہ کسی المیہ کو دیکھتے وقت ہم اس کے کرداروں سے اپنے آپ کو مکمل طور پر ہم آہنگ کر دیتے ہیں، اس لیے خوف میں جو ذاتی عنصر کی آمیزش ہے، وہ معتدل ہو جاتی ہے، اور خوف محض ذاتی رہ جانے کی بجائے نیابتی بن جاتا ہے۔ اسی طرح چونکہ المیہ دیکھنے کے دوران میں بھی ذہن کے پس منظر سے یہ خیال چمٹا رہتا ہے کہ افسانہ کی دنیا عمل کی دنیا سے دور اور مختلف ہے، اس لیے بھی خوف کا جذبہ ہم پر اس انداز سے نہیں ہوتا، جس طرح کہ وہ واقعاتی زندگی میں طاری ہو سکتا ہے۔ اور اس لیے رحم اور خوف کے جذبات کیفی اعتبار سے متضاد ہونے کے باوصف ارسطو کے بیان میں ایک ہی خانہ میں جگہ پا گئے ہیں۔

رحم اور خوف کے جذبات کی برانگیختگی اور ریا یانِ کاران کی واگذاشت کا مفہوم متعین کرنے کے سلسلے میں دو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ یعنی اسہال (Purgation) اور تطہیر و تزکیہ (Purification) ان دونوں اصطلاحات کا سراغ ارسطو کے طبی نظریے اور توازنِ جذبات کے قانون میں لگایا جا سکتا ہے۔ میری رائے میں موخر الذکر اصطلاح قابلِ ترجیح ہے، کیونکہ اول تو فاضل جذبات سے چھٹکارا حاصل کرنا یا انھیں کبیر خارج کر دینا نہ المیہ کا مقصد ہو سکتا ہے، اور نہ وسیع معنوں میں آرٹ کا مقصد ہے زندگی کے پراگندہ اور منتشر اجزا کو قابو میں لانا، تجربہ کی ابتری اور خلفشار میں ترتیب قائم کرنا، جذبات کا تزکیہ اور تہذیب و توسیع کرنا، اور ان کا عرفان حاصل کرنا۔ یہ چاروں مقاصد

(Purgation) سے حاصل نہیں ہو سکتے، بلکہ جذبات پر ہیئت کو عائد کرنے اور اس طرح ان کا شعور حاصل کر کے انھیں مہذب بنانے سے۔ اچھے آرٹ میں خام، ناپختہ بے لگام جذبات کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتے۔ جب خام اور ناپختہ جذبات شخصیت کی آنچ میں تپ کر کندن بن جاتے ہیں، یا جب وافر، شدید اور بے چین جذبات ہیئت کے شکنجے میں کسے جانے کے بعد ایک ہمواری، ایک اعتدال، ایک باقاعدگی اختیار کر لیتے ہیں اور قطع و برید یا نظم و ضبط کے بعد ان میں ایک ٹھہری اور سنبھلی ہوئی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے؛ یا جب فن کار ان کی بندگی قبول کر لینے کے بجائے ان سے عرفانِ ذات یا عرفانِ حیات کا کام لیتا ہے؛ تب ہی وہ موقر سمجھے جاتے ہیں۔ اس لئے ہمیشہ خطابت، نعرہ بازی اور جذباتیت اور آرٹ میں یا بہ الفاظِ دیگر پراپیگنڈے اور آرٹ میں حد فاصل قائم کی جاتی ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ ارسطو کی غایت کی صحیح تفسیر یہی ہے۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ ارسطو کے فکری نظام میں جسم اور روح اور مواد اور ہیئت کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس لئے خالص طبی نظریہ کے ساتھ ہی توازن جذبات جسم اور روح اور ہیئت اور مواد کے تعلق کو ذہن میں رکھنے اور ان سب تصورات کو باہم تطبیق دینے کے بعد ہی رحم اور خوف کے جذبات کی برانگیختگی اور ان کے انجام پر کوئی رائے قائم کرنی چاہیئے۔

نطشے نے المیہ کی کشمکش کا جواز اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ المیہ کی روح تخلیقِ اوہام اور شکستِ اوہام کے متوازی اور متواتر عمل میں پوشیدہ ہے۔ اپولو کا رویائے ہمارے سامنے ایک رزمیہ عظیم اور پر شوکت کائنات کی تعمیر کرتا ہے جسے اپنی انفرادیت میں مسرت کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن اس رویائے کے ساتھ ہی (Dionysius) کے نغمہ کا وحشت زدہ اور خود تخریبی وجد بھی شامل ہوتا ہے۔ یہی دونوں مل کر المیہ کو جنم دیتے اور اسی میں المیہ کا خاتمہ بھی ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح وہ پر سطوت دنیا محض خلا میں تحلیل ہو کر رہ جاتی ہے۔ وہ فرد جسے اپولو نے عرفانِ ذات کے لئے اکسایا تھا، زندگی کی طوفانی موجوں میں اپنے آپ کو کھو کر لذت حاصل کرتا ہے، اور اس کے تخیلات کے سارے شیش محل اس تصادم

سے پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ آئی۔ اے رچرڈس نے جس کا فنی نظریہ محرکات کے توازن پر قائم ہے، المیہ کو متضاد اور مخالف خواص اور کوائف کے توافق و تطابق سے تعبیر کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ المیہ میں رحم جو قربت کا جذبہ ہے اور خوف جو مراجعت کا جذبہ ہے، پایانِ کار ایک ایسی ہم آہنگی حاصل کر لیتے ہیں، جو ہمارے سکون کا سبب بن جاتی ہے۔ اس کا یہ بھی خیال ہے کہ ان دو قسم کے جذبات کے علاوہ المیہ میں اور نہ جانے محرکات اور جذبات کے کتنے گروہ ہوں گے، جو متضاد ہونے کے باوجود توازن قبول کر لیتے ہوں گے۔ اس کی رائے میں المیہ سے ہمیں جو آسودگی اور روحانی کیف اور وا گذاشت کا احساس حاصل ہوتا ہے، اس کا خاص سبب یہی توازن اور تطابق ہے۔ اس نظریہ پر بھی کم و بیش وہی اعتراض وارد ہوتا ہے۔ جو ہیگل کے نظریہ پر کیا گیا تھا، یعنی یہ کہ دونوں اپنے عام نظریہ کو المیہ پر مسلط کر کے نتائج اخذ کرتے ہیں۔ قربت اور مراجعت کے جذبات کی توجیہہ رچرڈس نے جس انداز سے کی ہے، عام تجربہ اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ اس کی یہ عمومی رائے بھی مشتبہ ہے کہ ادب اور آرٹ کا کام صرف محرکات و احساسات میں ایک نوع کا توازن پیدا کرنا ہے۔

فرانسیسی فلسفی روسو کا خیال ہے کہ المیہ دیکھنے سے جو لذت ہمیں حاصل ہوتی ہے، اس کی بنیاد بد باطنی اور کینہ پروری، یا موجودہ نفسیاتی اصطلاح میں ایذا پسندی (Masochism) پر ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ ان حادثات عظیم پر جن سے ہم خود محفوظ و مامون ہیں اور جن کا شکار ہوتے ہوئے ہم دوسروں کو دیکھتے ہیں، ہمیں ایک طرح کا اطمینان حاصل ہوتا ہے، اور ہم ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یہ نظریہ سر تا سر کلبیت (Cynicism) پر مبنی ہے اس سے زیادہ فلسفیانہ نظریہ شوپنہار کا ہے، جس کے نزدیک المیہ اس لئے پسندیدہ ہے کیونکہ وہ ہمارے اندر زندگی کی قوت ارادی کو کمزور کرتا، ہمارے اندر جذبہ تسلیم و رضا کو فروغ دیتا اور ہم پر زندگی کی نخبرا در لے حقیقی کو روشن کر دیتا ہے۔ اس نظریہ پر شوپنہار کے قنوطی فلسفہ زندگی کی چھاپ لگی ہوئی ہے اور یہ تمام تر موضوعی ہے۔ شوپنہار زندگی کو ایک مستقل اور مسلسل دکھ اور مصیبت کے مترادف جانتا

ہے۔ اس کا خیال ہے کہ زندگی مسرت کی جستجو سے زیادہ غم سے گریز کرلنے کا نام ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ مسرت اپنی جگہ مستقل، قائم بالذات، اور آزادا کائی نہیں، بلکہ صرف غم کی غیر موجودگی سے عبارت ہے؛ اور اسی لئے نفس کشی کے ذریعہ اگر ہم زندگی کی قوتِ ارادی سے چھٹکارا حاصل کرلیں، اور اپنے اندر تسلیم ورضا کا جذبہ پیدا کرسکیں، تو شاید غم اور دکھ کی غلامی سے نجات پاسکیں۔ شوپنہار تفکر کو عمل پر اور تسلیم ورضا کو پیکار و مدافعت پر ترجیح دیتا ہے۔

حکیم افلاطون نے ڈرامے کی مذمت اس لئے کی تھی، کیونکہ کرداروں کی نقل کرنے سے ہم اپنی خودی کی نفی کے مرتکب ہوتے ہیں، جو اخلاقی اعتبار سے ناقابلِ برداشت ہے۔ اقبال کی رائے، جو انھوں نے ضربِ کلیم میں ظاہر کی ہے، افلاطون کی رائے سے حیرت انگیز طور پر مماثلت رکھتی ہے ؎

یہی کمال ہے تمثیل کا کہ تو نہ رہے	رہا نہ تو تو نہ سوزِ خودی، نہ سازِ حیات

لیکن اس مسئلہ پر اس پہلو سے بھی غور کرنا چاہیئے کہ دراصل المیہ کردار سے ہم آہنگی قائم کرنے کا عمل، جسے (Empathy) کے لفظ سے تعبیر کرسکتے ہیں، واہمہ (Phantasy) کی دنیا میں ہوتا ہے جب یہ ختم ہوجاتا ہے، تو ہم دوبارہ واقعاتی زندگی سے اپنا رشتہ جوڑ لیتے ہیں۔ اور غالباً المیہ کردار کے تجربات میں شریک ہو چکنے کے بعد ہم اپنے اندر روزمرہ کی زندگی کے لئے ایک نئی اور پیچیدہ تر آمادگی پانے لگتے ہیں۔ ہمارا انفرادی نفس اپنی کاہلی اور خود پرستی کے خول سے باہر نکل آتا ہے، اور اس میں ایک نیا کس بل، ایک نئی وسعت اور ایک نئی معروضیت پیدا ہوجاتی ہے۔ اس کے برعکس شوپنہار المیہ کو اس لئے پسند کرتا ہے، کیونکہ اس سے زندگی کی بے حقیقی اور کم مائیگی ثابت ہوتی ہے۔ شوپنہار کو دنیا کے عظیم غم کا ایسا ہی گہرا اور شدید احساس تھا، جیسا کہ روسی ناول نگار دوستو وسکی کو، جس کا قول ہے کہ "صرف مصائب ہی شعور کا سرچشمہ ہیں"۔ قوتِ ارادی سے آزاد ہوجانے کا خیال جو شوپنہار کے یہاں پایا جاتا ہے، وہ ہندو فلسفہ سے بہت قریب ہے، جس میں نروان حاصل کرنے کی شرطِ اولین سوز و سازِ زندگی کے طلسم کو توڑنا ہے۔ شوپنہار المیہ کو اس لئے عزیز رکھتا ہے، کیونکہ وہ اسے اپنے فلسفۂ زندگی کی غایت کے اتمام اور جواز کا وسیلہ جانتا ہے۔ اس کے نظریہ میں صداقت

تو ضرور ہے، مگر مکمل صداقت نہیں، اور المیہ کے متعلق اس کے نتائج تصویر کے صرف ایک ہی رُخ کو پیش کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ غم زندگی کی بہت بڑی اور ناگزیر حقیقت ہے، اور المیہ کی بنیاد اس غم کے احساس پر ہے، جو انسانی زندگی کا چاروں طرف سے احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اس میں بھی شبہ نہیں کہ انسان بے رحم اور سفاک قوتوں کی ستم ظریفی کا ہدف ہے۔ مگر پھر بھی المیہ کو دیکھ کر زندگی کی بے حقیقی کا اور تحقیر کا تاثر قبول کرنا منفی اندازِ فکر کو ظاہر کرتا ہے۔ المیہ کردار کی غلطی اور زوال میں ہم انسانی فطرت کے امکانات کا وضاحت کے ساتھ احساس کرتے ہیں۔ برٹرینڈ رسل نے اپنے مشہور مضمون (A Free Man's Worship) میں، جسے ٹی ایس ایلیٹ نے بری نثر کی مثال بتایا ہے المیہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ "انسان چاروں طرف سے مخالف قوتوں کے نرغے میں پھنسا ہوا ہے، اور قدرت کا ظالم ہاتھ ہمہ وقت اس کی آرزوؤں اور خوابوں کو منتشر اور پراگندہ کرنے پر تلا رہتا ہے۔" تاہم انسانی ارادہ کی بلندی اس کی روح کی عظمت، اس کی ہمت کا استقلال، اس کے حوصلہ کی فراخی، اُس کی پامردی، اُس کا اپنے آپ کو قدرت کا مدِمقابل ثابت کرنا اور شکست اور ناامیدی اور بے چارگی کی حالت میں بھی اپنے آپ کو نمایاں کرنے کا جذبہ، یہی وہ تاثرات ہیں۔ جو المیہ سے ہمارے اوپر مرتب ہوتے ہیں۔ اس میں اس کی دلکشی کا راز ہے؛ اور یہی المیہ لذت کا سرچشمہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ المیہ کرداروں کی شکست و ریخت کے باوجود ہم ان کی عظمت کے قائل ہو جاتے ہیں۔ اور ان کا گہرا نقش ہمارے دل و دماغ پر باقی رہتا ہے۔ شیکسپیئر کے ڈرامے "وینس کے سوداگر" کا اختتام اس لئے غیر تشفی بخش اور ناقابلِ قبول ہے، کیونکہ شائی لاک جو ایک المیہ کردار ہے، بالآخر اپنی شکست کو قبول کرلیتا ہے۔ عموماً المیہ کردار میں پندار پایا جاتا ہے، وہ اپنی انا کا ادعا کرتا، اور اسے منوانا چاہتا ہے۔ وہ انسان کی طرف سے اُس کائنات کو جواب پیش کرتا ہے، جو اسے ہر طرف سے کچلنا چاہتی ہے، لیکن جو شخص المیہ کی حزنیہ فضا میں امید کی کرن کو نہیں پا سکتا؛ اس کا تاثر اور ردِ عمل المیہ کے بارے میں صحیح نہیں کہا جا سکتا۔

المیہ کا خاص مقصد بیرونی دھچکوں کی مدد سے انسانی نفس کو سنجیدہ اور مضبوط بنانا ہے۔ المیہ انسان

اس لئے تکلیف اٹھاتاہے، کیونکہ وہ معمول سے بڑھ کر ان تناقصات کا احساس رکھتا ہے، جو کائنات اور انسان میں پائے جاتے ہیں، اس خلیج کا جو خواہشات اور ان کی تکمیل اور حصول کے درمیان موجود ہے یا واقعی اور مثالی کائنات کے درمیان موازنہ کا۔ المیہ میں کشمکش ہی نہیں ہوتی، توازن بھی ہوتاہے دکھ اور لاپروائی کے وجود کا احساس ہی نہیں ہوتا، بلکہ اس سے ماوراء ایک امکانی حل یا خیر کی موجودگی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ دکھ جھیلنا اور مصائب برداشت کرنا ٹھوس اور ناقابلِ انکار حقیقت سہی، مگر کسی بنیادی اور عالمگیر قانون سے وابستگی بھی، جو غم کو وجد اور مسرت سے تبدیل کردے، المیہ کے پورے ماحول میں سرایت کئے ہوتی ہے۔ دکھ اور برائی کے مظاہر کے خلاف اچھائی کی کائنات کو نمایاں کرنا اور اس طرح تجربہ کے دو مختلف تاثرات کے درمیان توازن اور مطابقت قائم کرنا دنیا کے تمام بڑے المیہ نگاروں مثلاً ایسکائلس سافکلیس، شیکسپیئر اور ابسن کا وظیفہ رہا ہے۔ اسی کی وجہ سے المیہ میں ایک زندہ تناؤ پیدا ہوتاہے جس کے بغیر اس کا تصور ممکن نہیں۔ ایک نقاد کا کہنا ہے کہ المیہ کو بیک وقت قنوطی اور رجائی کہہ سکتے ہیں۔ قنوطی اس لئے کہ کائنات میں شر لاعلاج معلوم ہوتاہے، گویا وہ وجود کی ایک لابدی شرط ہو، اور رجائی اس لئے کہ اس میں توانائی کا عنصر پایا جاتاہے، اور وہ ایک آفاقی خیر میں ہمارے یقین کو تازہ کردیتاہے۔

میں نے شروع میں عمل، کش مکش اور نقطۂ عروج کو المیہ کے لازمی عناصر قرار دیا تھا۔ ان میں تحیر اور پراسرار کیفیت کا اضافہ ضروری سمجھتا ہوں، جو قدرت کے مبرم اور اٹل قانون کے نفاذ پر انسان کے دل میں پیدا ہوتی ہے، اور اسے یہ پر استعجاب سوال پوچھنے پر اکساتی ہے کہ کیا اس کی عزیز ترین صلاحیتیں اور عظیم ترین نصب العین شکست و تخریب ہی کے لئے وجود میں آئے ہیں؟ المیہ میں واقعات اور کرداروں کے منطقی ارتقاء کے باوجود ایک ناقابلِ فہم عنصر کی موجودگی کا احساس ہوتاہے لیکن ان سب امور سے زیادہ میں جس چیز کو اہمیت دیتا ہوں، وہ اس جذبہ کا ادراک ہے، جو المیہ کردار کو شکست قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہونے دیتا، بلکہ اسے موت اور اذیت کو بھی مقابلے کے لئے للکارنے پر اکساتاہے۔ وہ صرف سینہ کوبی سے مطمئن نہیں ہوتا، اور نہ مصائب کے سامنے انعام اور شفاعت کے پیش نظر سر تسلیم خم کردیتاہے۔ اس کے دکھ میں تحیر کا احساس ہوتاہے۔ اس میں برہمی اور قوت برداشت ہوتی ہے۔ وہ اضطراب اور تلخی محسوس کرتاہے۔ اور اپنی روح اور کائنات کو ٹٹول ٹٹول کر

دیکھتا ہے۔ وہ کائنات کے قلب میں ایک ناگہانی اور غیر متوقع لیکن دراصل قدیم و مسلسل شر کا مشاہدہ کرتا ہے جس نے تمام اشیاء کو مسموم بنا دیا ہے۔ نہ صرف اس کی انفرادی اور منظم زندگی بلکہ پورے انفس و آفاق میں کوئی خامی راہ پا گئی ہے، اس لئے وہ اپنی پوری شخصیت کو شر کی بیخ کنی کے لئے لا کھڑا کرتا ہے۔ ظاہری ناامیدی اور شکست کی تاریکی میں بھی انسانی عزم کی پختگی روشنی کے چراغ کو بادِ صرصر سے بچائے رکھنے کے لئے پیہم جد و جہد کرتی رہتی ہے۔ کائنات اور تقدیر کی مخالف قوتیں انسان کے نہاں خانۂ دل میں سلگتی چنگاری کو بار بار بجھانا چاہتی ہیں، لیکن چنگاری بار بار بھڑک اٹھتی ہے اور یہ شعلۂ لرزاں انسانی خودی کی حیاتِ پائندہ کے احساس کو تازہ کر دیتا ہے۔

المیہ سے جذبۂ تسلیم و رضا نہیں، جذبۂ احتجاج اور جذبۂ مقاومت کا تاثر پیدا ہوتا ہے۔ اس سے ایک نئی آمادگی اور قوت، اور حیاتِ زندگی کے خلیوں (Cells) میں ایک نئی توانائی اور تنظیم پیدا ہوتی ہے۔ المیہ کرداروں میں آخر آخر میں ایک خوشگوار اور ہمہ جہت تبدیلی نمایاں ہوتی ہے۔ مثلاً ہیملٹ اور پروڈیمیس میں ایک نئی آمادگی اور خود ضبطی، لیئر اور اوڈی پس میں محبت کی تفہیم اور توازن، اینٹی گون میں شخصیت کی لچک، نرمی اور انسان دوستی۔ یہ تبدیلیاں جو خیر کے اصول کا اثبات کرتی ہیں متعدی (Infectious) ہوتی ہیں۔ اور پڑھنے والا بھی ان روحانی تجربات سے سرشار ہو جاتا ہے۔ یہی المیہ کا مثبت پہلو ہے۔

مرزا غالب

حضرت سلام مچھلی شہری

یوم غالب کے موقع پر، مزارِ غالب (درگاہ حضرت نظام الدین اولیا، دہلی) پر ۱۵ فروری ۱۹۶۲ء کو سہ پہر کے وقت پڑھی گئی۔

سلام

—— قطب[1] کی محفلِ تخئیل کی اک ماہ پارہ تھی
جو موجِ رنگ و نکہت، نورِ نغمہ تھی، شرارہ تھی
مگر گھبرا بھی جاتی تھی خود اپنے خوابِ رنگیں سے
ابھی کمسن تھی اور واقف نہ تھی آدابِ تزئیں سے
—— زمانہ گزرا —— اور اُس نازنیں پر بھی شباب آیا
یہی دن تھے کہ فنِ شاعری میں انقلاب آیا
دیارِ تاج[2] سے اک شاعرِ اعظم ہوا پیدا
سراپا شعلۂ گل، نغمۂ شبنم ہوا پیدا
قطب کی محفلِ تخئیل میں اک روشنی آئی
نگارِ ناز اب آئینے میں لیتی تھی انگڑائی

---

[1] محمد قلی قطب شاہ
[2] اکبر آباد (آگرہ)

چراغِ سرد اس کے حسن کے پرتو سے جل اٹھا
وہ عالم تھا کہ خود شاہِ جہاں گویا مچل اٹھا!
— اُدھر شاعر بھی بچپن اور جوانی کی بہاروں میں
خود اپنی عظمتِ افکار کے نازک شراروں میں
نکھر کر دیوتا سا بن گیا تھا شعر و نغمہ کا
مگر اک عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ تھا
بس اک بزمِ قطب، بزمِ ولی کی ماہ پارہ تھی
جو اس کی جنتِ افکار کا رنگیں نظارہ تھی
— بہر صورت وہ اب دلی کی محفل کا ستارہ تھا
یہ مانا اپنی ہی پروازِ فکر و فن سے ہارا تھا
مگر خوشبو اسی کی گلفشاں محلوں میں رہتی تھی
اُسی کی لے ظفر کی دکھ بھری غزلوں میں بہتی تھی
— کہا ہے گفتگو سے پہلے مہ پارہ جسے میں نے
وہ اب اُلھڑ نہ تھی، واقف تھی ہر آداب تزئیں سے
نکل کر محفلِ گل، تنگ آکر شورِ بلبل سے
ضیائے فکر و دانش لے کے شاعر کے تخیل سے
اُلجھ سکتی تھی نورِ کہکشاں و ماہ و اختر سے
وہ اب آنکھیں ملا سکتی تھی درجل اور ہومر سے
— غرض اس نو بہارِ ناز کو اردو زباں کہیے
وطن کی مشترک تہذیب کا روشن نشاں کہیے!
— جو ہر فنکار سے آرائش اردو کا طالب تھا
خدائے شعر و نغمہ کی قسم وہ صرف غالب تھا

وہ غالبؔ، جس نے اُردو شاعری کو دلکشی بخشی
ضیائے علم و دانش دے کے تازہ زندگی بخشی
وہ غالبؔ حسن کارِ زہرۂ اردو جسے کہئے
گلستانِ ادب میں جانِ رنگ و بو جسے کہئے
وہ جس نے بربطِ ہندی پہ نغماتِ عجم گایا
وہ جو حافظ کو بھی فردوسِ خسرو کے قریں لایا
—— ہزاروں شاعرانِ نکتہ رس دلّی میں رہتے ہیں
بہ فیضِ یادِ غالبؔ ہم بھی یوں اشعار کہتے ہیں —!

اقبال کی ایک نظم پر بحث

مرتبہ: جناب عابد رضا بیدار

اقبال کی یہ مختصر سی فارسی نظم جو جنگ عظیم کے دوران اس کا ایک تا شہ ہے زمانہ (کانپور) کے جنوری ۱۹۱۹ء کے شمارے میں شائع ہوئی۔

"نصیب ما ز جہان است بقدر ہمت ما"

ہیچ می دانی کہ صورت بند ہستی با فرانس
فکر رنگین و دل گرم و شراب ناب داد

ملک و تدبیر و تجارت را بانگلستاں سپرد
جرمنی را چشم حیران و دلِ بیتاب داد

روس را سرمایۂ جمعیت ملت ربود
تہر او کوہِ گراں را لرزۂ سیماب داد

تا بر انگیزد نوائے حریت از سازِ دہر
صدر جمہوریۂ امریکہ را مضراب داد

ہر کسے در خوردِ فطرت از جناب او ببرد
بہر ما چیزے نبود و خویش را با ما سپرد

(زمانہ جنوری ۱۹۱۹ء)

زمانہ کے اگلے شمارے میں لفٹنٹ کرنل بھولا ناتھ (آئی، ایم، ایس) نے اس نظم میں اصلاح کی:۔
"نصیب ما ز جہاں شد بقدر ہمت ما" اس کا عنوان قرار دیا اور اصلاح شدہ نظم اس طرح لکھی:۔

صورت آرائے ازل دانی فرنسہ راچہ داد — طبع رنگین و دل شاد و شراب ناب داد
ملک و تدبیر و تجارت را بانگلستان سپرد — جرمنی را سرگراں داد و دل بیتاب داد
روس را شیرازہ جمعیتش از ہم گسیخت — نمسہ و بلغاریہ را لرزۂ سیماب داد
اٹلی و یونان را در مہد نازِ اتحاد — شانۂ جاپان بزلفِ چین بہرتاب داد
کردہ پُر ہسپانیہ را جام مے از پرتگال — مزرعۂ ہالنڈ را از چشم قیصر آب داد
نازِ عمر را قوت جانش در دل ماہی نہاد — زمہریر سوید را ہم قاقم و سنجاب داد
تا برانگیزد صدائے حریت از ساز دہر — صدر جمہوریۂ امریکہ را مضراب داد
تاجداران را گدا کرد و گدا را تا جدار — اوج و پستیٔ جہاں را گردش دولاب داد

پیش ہر یک بہرۂ از خوان الوانش نہاد
ہندرا بہر تماشہ چشم دو پُر آب داد — (زمانہ، فروری ۱۹۱۹ء)

اس نظم کے ساتھ بھولا ناتھ نے اڈیٹر کو ایک خط بھی لکھا جس میں اپنی اصلاحوں کی وضاحت کی۔

جناب اڈیٹر صاحب

جنوری کے زمانہ میں کلام اقبال کے عنوان سے چند فارسی اشعار درج تھے جو میری نظر سے گزرے۔ ڈاکٹر اقبال کی اردو شاعری میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا، بلکہ باوجود اہلِ زبان نہ ہونے کے آپ کی شستہ زبان اور جدت خیالات پر ہم اہل پنجاب جتنا بھی ناز کریں بجا ہے۔

بہت ہی اچھا ہوتا اگر ہمارے دوست اپنے سمندِ خوش خرام کا جولان اردو کے میدان ہی میں محدود رکھتے۔ فارسی کی زمین سنگلاخ پر آپ کا اسپ تازی ناخون لیتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

ان پانچ شعروں میں عروض اور محاورہ کئی جگہ پر سقیم ہے۔ مثلاً

(۱) صورت بند محاورہ نہیں، صورتگر یا صورت آرا کہتے ہیں۔ بند کے ساتھ نقشبند ہوا کرتا ہے۔

(۲) با فرانس سے مراد آپ کی فرانس را کی ہے۔ بہ فرانس کے معنی فرانس را کے ہو سکتے ہیں، با کے معنی ہمراہ یا معہ کے ہوا کرتے ہیں۔

(۳) ایرانی فرانس کو فرنسہ کہتے ہیں فرانس نہیں کہتے اور تقطیع میں ف متحرک پڑتی ہے جو صحیح نہیں

(۴) فکر رنگیں نہیں ہوتا، طبع رنگیں محاورہ ہے۔
(۵) دل گرم نہیں ہوتا۔ دل نرم، دل شاد و خوش اور سرد دل البتہ مستعمل ہے۔
(۶) چشم حیراں کی جگہ پہ سرگراں معنی نخوت و تکبر زیادہ موزوں ہے۔
(۷) نوا کی بجا صدا ہونا چاہیئے، ساز میں سے صدا نکلتی ہے نہ نوا۔
(۸) امریکہ کی تقطیع میں امریک آتا ہے۔
(۹) میں شاعر نہیں، البتہ شعر پڑھنے کا شوق رکھتا ہوں، اس لئے جو ذہن میں آیا بے تکلف عرض کیا۔

کرنل بھولا ناتھ کی اصلاحوں میں بیشتر ایسی ہیں جو شعر کو مدرستہ تک لے جانے پر ملتی ہیں لیکن اس کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ کرنل کا سا نکھرا ہوا شعری ذوق اور زبان فارسی پر ایسا عبور ہر جگہ آسانی سے نہیں مل جاتا۔

کرنل بھولا ناتھ کی اس تحریر کے جواب میں زمانہ کے اس سے اگلے شمارے میں مولانا ابو الکلام آزاد کے الہلال میں ان کے ہمکار خواجہ عبد الواحد ندوی نے اڈیٹر کے نام ایک طویل خط لکھا جو مباحثہ ڈاکٹر اقبال و کرنل بھولا ناتھ" کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس کے اہم حصے حسب ذیل ہیں:-

مکرمی اڈیٹر صاحب! آپ کے رسالہ کی فروری نمبر میں لفٹننٹ کرنل بھولا ناتھ کی مراسلت میری نظر سے گزری ..... ڈاکٹر اقبال شہرت کی حد سے گزر کے "ترجمان قوم" کے درجہ تک پہنچ چکے ہیں اس لئے ممکن ہو کہ بعض لوگوں کو ان کے کلام کی حرف گیری ناگوار معلوم ہو لیکن اگر پہلے ان کے کلام کی آزاد تنقید ضروری تھی تو اب بھی ازبس ضروری ہے۔ کیونکہ کامل سے کامل استاد بھی لغزش و خطا سے معصوم ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

...... مگر یہ لغزشیں ان کے ماہتاب کمال کے داغ ہیں۔ چاند میں بھی داغ ہیں مگر ان داغوں کی وجہ سے اس کے جمال جہاں آرا سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اقبال کی شعر مجسم طبیعت سے غلطیاں ہوتی ہیں اور اردو فارسی دونوں میں ہوتی ہیں۔ مگر ان غلطیوں کی وجہ سے میں کرنل بھولا ناتھ صاحب کے ہم آہنگ ہو کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ بہت ہی اچھا ہوتا اگر ہمارے دوست اپنے سمند خوشخرام کا جولان

اردو ہی کے میدان میں محدود رکھتے، فارسی کی زمین سنگلاخ میں آپ کا اسپ تازی ناخون لیتا ہوا دکھائی دیتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ طبع اقبال کے سمند خوشخرام نے اپنی خوشخرامی سے دونوں میدانوں کو مخترستان خیال بنا دیا ہے .....

اقبال کے پہلے شعر کے مصرعۂ اول پر کرنل بھولا ناتھ صاحب نے چند اعتراضات فرمائے ہیں. پہلا اعتراض یہ ہے کہ صورت بند محاورہ نہیں — بند کے ساتھ نقشبند ہوا کرتا ہے" مگر واقعہ یہ ہے کہ نقشبند کی طرح صورت بند بھی محاورہ ہے. لغت کی متداول اور مستند کتابوں کی تصریح موجود ہے. امیر خسرو فرماتے ہیں،

منظرے بوس کشیدہ بلند　　　چشم بند ہزار صورت بند

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ بافرانس معنی فرانس راکے صحیح نہیں. یہ اعتراض پڑھ کے میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی. با کا را کے معنی میں آنا اس قدر مشہور و معروف بات ہے کہ لغت و قواعد کی مشہور مستند بلکہ معمولی ادبی کتابوں میں بھی مذکور ہے. یہ مصرع سنداً عرض ہے.

سنجاب دہ زمیغ باکوہ

تیسرا اعتراض لفظ فرانس پر ہے. اس اعتراض کے دو جزء ہیں. جزء اول کا تعلق لفظ سے ہے اور جزء دوم کا تعلق وزن سے. اعتراض کے جزء اول سے تفریس اسماء کی ایک اصولی بحث پیدا ہوتی ہے. اصل یہ ہے کہ ۱۹ ویں صدی میں فارسی بولنے والے ممالک پر مغربی تہذیب کا اثر پڑنا شروع ہوا ہندوستان سیاسی اور علمی دونوں حیثیتوں سے انگلستان اور اس کے زیر اثر رہا مگر علمی حیثیت سے فرانس کا اثر قبول کیا. وسط ایشیا علمی اور سیاسی دونوں حیثیتوں سے روس کے زیر اثر رہا اور فرانس کا اثر اگر پڑا بھی تو اس کی وساطت سے. اس لئے مغربی ناموں کا تلفظ ہر ملک نے الگ الگ کیا. ہندوستان میں چونکہ یہ نام انگریزوں کی وساطت سے آئے تھے اس لئے تلفظ انگریزی کے قاعدہ سے کیا گیا. ایران میں یہ نام فرانسیسی زبان سے گئے تھے، اس لئے ان کا تلفظ فرانسیسی تلفظ کے مطابق کیا گیا...

اب لفظ فرانس کو لیجئے. انگریزی میں تو اس کا تلفظ فرانس ہی جو بعینہٖ اردو میں قائم ہے. فرانسیسی میں اسی کا تلفظ فرانسے اور فران کے بین بین ہوتا ہے جو غیر فرانسیسی کلام و زبان سے بغیر مشق کے مشکل سے

ادا ہوتا ہے۔ اس لئے اگر ایرانی فرانس کو فرانسہ کہتے ہیں تو یہ نہ تعریب ہے اور نہ کوئی مستقل نام بلکہ درحقیقت اختلاف تلفظ ہے جو درحقیقت انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کے اختلاف تلفظ کا نتیجہ ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جب مغربی نام فارسی زبان میں استعمال کئے جائیں تو ان کو معرب بنا لینا چاہیئے یا اپنی اصلی حالت پر قائم رکھنا چاہیئے اور اگر معرب بنایا جائے تو کس قاعدہ سے ؟ مگر واقعہ یہ ہے کہ اس کے متعلق کوئی اصول اب تک طے نہیں ہوا ہے۔ ایرانی ارباب قلم عام قدرتی طریقہ کے پابند ہیں۔ جس نے جو لفظ جس طرح سنا ہے اسی طرح استعمال کرتا ہے۔ بمبئی، کلکتہ، حیدر آباد سے جو فارسی اخبارات خود ایران یا ایرانیوں نے نکالے تھے ان میں مغربی ناموں کا تلفظ انگریزی قاعدہ سے ہوتا تھا۔ ترکستان، مثلاً باغچہ سرائے وغیرہ۔ سے جو فارسی اخبارات نکلتے تھے ان میں مغربی ناموں کا تلفظ روسی قاعدہ سے ہوتا تھا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال بھی اس عام قدرتی قاعدہ کے پابند ہیں۔ کرنل صاحب اس روش کو قابل اعتراض فرماتے ہیں۔ یہ درحقیقت محاورہ و زبان کی غلطی نہیں بلکہ اختلاف رائے ہے۔ لیکن ایک عجیب بات ہے کہ کرنل صاحب جس طریقہ کو پسند نہیں فرماتے خود اسی پر عمل کرتے ہیں۔ ایرانی اگر فرانس کو فرانسہ کہتے ہیں تو جرمنی کو المانیہ، اٹلی کو اطالیہ، جاپان کو ژاپون کہتے ہیں۔ مگر کرنل صاحب نے اپنی اصلاح میں ان تمام ناموں کا وہی تلفظ کیا ہے جو ہندوستان میں رائج ہے۔

پہلے شعر کے مصرعہ ثانی کے متعلق کرنل صاحب کا یہ ارشاد ہے کہ فکر رنگین اور دل گرم محاورہ نہیں کیا عرض کروں، اس وقت کوئی شعر یاد نہیں آتا تاہم کرنل صاحب اتنا تو ضرور تسلیم فرمائیں گے کہ خیال رنگیں اور رنگین خیال و نیز گرم دل بمعنی عاشق سوختہ آتا ہے۔ کیا اس کے بعد بھی فکر رنگیں اور دل گرم بمعنی سوختہ عشق غلط ہوگا۔ مگر بہتر یہ ہے کہ یہ اعتراض سند کے ملنے تک ملتوی رکھا جائے۔ اس لئے اس وقت سرسری اشارہ پر اکتفا کرتا ہوں۔

اقبال کے دوسرے شعر کے مصرعہ ثانی میں کرنل صاحب چشم حیراں کے بدلے سرگراں زیادہ موزوں خیال کرتے ہیں۔ معلوم نہیں کہ یہ موزونیت شاعری کے لحاظ سے ہے یا واقعہ کے خیال سے۔ شاعری کے لحاظ سے تو دل بے تاب کے لئے چشم حیراں ہی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ رہا واقعہ، تو اس کے متعلق وہ حضرات فیصلہ کر سکتے ہیں جو جرمن قوم کے اصلی کیریکٹر سے واقف ہیں۔ لیکن اگر واقعہ کے

لحاظ سے سرگراں زیادہ موزوں ہے جب بھی سرگراں چنداں مناسب نہ ہوگا کیوں کہ سرگراں کے معنی بقول کرنل صاحب متکبر اور مغرور ہوں گے اور آگے داؤ ہے اس لئے سرگرانی ہونا چاہیئے۔

چوتھے شعر کے پہلے مصرعہ پر اعتراض ہے کہ ساز سے صدا نکلتی ہے نہ کہ نوا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ نوا مطلق آواز کو بھی کہتے ہیں اور نغمہ کو بھی، موسیقی کے بارہ مقاموں میں سے ایک مقام کا نام بھی ہے۔ امیر خسرو فرماتے ہیں:

شد زن مطرب بہ نواگستری

حضرت نظامی گنجوی فرماتے ہیں:

بر زخمہ چون نے نوا سازم

کیا اب بھی "سازِ دہر" سے "نوائے حریت" کا نکلنا خلاف محاورہ ہے۔

آخر میں چند لفظ ان دونوں نظموں کی عام روح (اسپرٹ) کے متعلق عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اقبال کی نظم پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنی انفرادی شخصیت وطن کی اجتماعی شخصیت میں جذب کر دی ہے۔ اقبال، اس وقت اقبال نہیں بلکہ بدنصیب ہندوستانی ہے۔ اس کا دل ہندوستان کا دل ہے اس کی زبان ہندوستان کی زبان ہے۔ اس کا کلام اقبال کے خیالات کی تعبیر نہیں بلکہ ہندوستان کے جذبات کی ترجمانی ہے غرض وہ اس وقت ہندوستانی کے دل سے محسوس کر رہا ہے اسی کے دماغ سے سوچ رہا ہے اور اسی کی زبان سے بول رہا ہے۔ ——— اس لئے وہ جانتا ہے کہ اس موقع پر وہ واعظ ناصح یا خطیب نہیں بن سکتا، اسے شاعر اور صرف شاعر بننا چاہیئے یعنی الفاظ کے آب و رنگ سے وطن کے جذبات کی تصویر کھینچنا چاہیئے۔

تھوڑی دیر کے لئے چشم ظاہر بیں کو بند کیجیے اور ہندوستان کا دل بن کر تخیل کی نظر سے دیکھنا شروع کیجیے۔ عالم اور کاروبار عالم پیش نظر ہے، فرانس داد عیش و طرب دے رہا ہے، انگلستان تجارت حکومت کا نقارہ بجا رہا ہے اس حالت کو دیکھ کے جرمنی کی نگاہِ رشک حیراں اور دل حوصلہ تیار ہے۔ اس کا کوہ اسپند اد زیر و زبر ہو چکا ہے۔ امریکہ سے انسانیت پرستی اور حریت پروری کا غلغلہ بلند ہو رہا ہے۔ خیال کا مسافر بحیرۂ اٹلانٹک کے دونوں جانب سیر کرکے اپنی طرف لوٹتا ہے ہم یعنی

ہندوستان۔کون ہندوستان؟ جو کبھی روحانیت کا چشمہ فیض تھا جو کبھی آفتاب علم کا مطلع انوار تھا! جو کبھی تہذیب وتمدن کا گہوارہ تھا! جو کبھی عیش وعشرت کا جنت آباد تھا! آج اس کی کیا حالت ہے؟ دل پر ایک چوٹ لگتی ہے حسرت کی آنکھ سے یاس کے اشک خونیں ٹپکنا چاہتے ہیں ایک نہایت نازک موقع، ایک علم النفسی لحظہ، کمال شاعری کی امتحان گاہ، اقبال معمولی شاعر نہیں ورنہ ایک حسرت آمیز شعر کہہ کے اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتا۔ اس کی طبیعت نکتہ رس اور دقیقہ سنج ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ایک پس ماندہ قوم کے سامنے حسرت و یاس کی تصویر پیش کرنا اس کو موت کا پیغام دینا ہے۔ اس لئے وہ ایک ایسا مضمون تلاش کرتا ہے جو عبرت انگیزی اور خودداری دونوں کی روح سے معمور ہو۔ اسے معلوم ہے کہ ناامیدی کی حالت میں نفس انسانی تسلی آمیز خیال کے لئے تشنہ لب ہوتا ہے۔ اسے یہ بھی خبر ہے کہ یورپ و امریکہ اگرچہ مادیات میں اوج ترقی پر ہیں لیکن روحانیت میں ان کے یہاں صفر ہے۔ اس کے مقابلہ میں ہندوستان گو دنیادی حیثیت سے درماندہ و بے نوا ہے لیکن روحانیت و مذہب اس کی زندگی کا عنصر غالب ہے۔ ان حالات کو پیش نظر رکھ کے وہ ایک مرقع پیش کرنا چاہتے ہیں جس میں مغرب کی مادی ترقی اور روحانی تنزل اور ہندوستان کا مادی افلاس اور روحانی دولت مندی۔ پہلو بہ پہلو نظر آئیں۔ وہ یہ خوب جانتا ہے کہ خدا کا نام اس کے ہموطنوں کے لئے کیا کشش رکھتا ہے۔ اس لئے وہ ساز شاعری کے اسی تار کو چھیڑتا ہے اور ایک عبرت و تسلی آمیز نغمہ اس شعر کی صورت بن کے نکلتا ہو۔

ہر کسے درخورد الخ

کرنل صاحب کی نظم پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ناظم قوم کا ایک دردمند و غمگسار ناصح ہے۔ وہ دنیا کی چہل پہل، ہل چل، جدوجہد اور رونق و گرم بازاری اور اس کے مقابلے میں اپنے عزیز وطن کی بے چینی و بے بسی کو دیکھتا ہے، اس کا دل خون ہوتا ہے اور یہ خون دل شعر بن کے ٹپکنے لگتا ہے۔ وہ درد و غم سے بے چین ہو، اس بے چینی کے عالم میں اقبال کی سبق آموزی اور خودداری کا سر رشتہ ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہو۔ وہ اپنے وطن کی پس ماندگی کا ذمہ دار صورت آرائے ازل کو ٹھہرا کر اور ایک شکوہ سنج لہجہ میں چیخ اٹھتا ہو: پیش ہر یک بہرہ الخ

اصل یہ ہے کہ کرنل صاحب نے اقبال کے نقطۂ خیال کو نظر انداز فرما دیا۔ چونکہ نقطۂ خیال بدل گ
اس لئے اصلاح شدہ نظم میں نہ وہ روح رہی جو اصل نظم میں تھی اور نہ وہ اثر و کیف۔

محاکمۂ اقبال و بھولا ناتھ کے متعلق یہ چند سرسری اشارات ہیں۔ اقبال کی نظم میں بلاغت کے
جو لطیف و نازک نکتے ہیں وہ تفصیل کے طالب ہیں جو اس مختصر مراسلت کے لئے موزوں نہیں اس
لئے قلم انداز کرتا ہوں۔" (زمانہ مارچ ۱۹۱۹ء)

کرنل بھولا ناتھ کی تحریر کی یہ اہمیت ہے کہ ابھی یہ کل کی بات ہے کہ کسی زبان کا علم مذہب
اور مسلک کی بنا پر نہیں حاصل کیا جاتا تھا بلکہ اپنے ذوق اور اس علم یا زبان کی اہمیت کی بنا پر
بات ہے یا نہیں کہ اقبال جو ۱۹۱۹ء میں ٹیگور کی طرح بین الاقوامی ادبی میدان میں ہندوستان
نمائندگی کر رہے تھے اور فارسی کی دو عظیم مثنویاں لکھ چکے تھے جن کا نکلسن نے انگریزی میں تر
بھی کر ڈالا تھا (اسرار خودی)، اور دو تین سال کے اندر اپنا فارسی شاہکار پیام مشرق شائع کر
والے تھے، اقبال جو اس وقت دنیا کے چند گنے چنے شاعروں میں اپنا مقام بنا چکے ہیں، ان
کلام پر ایک ایسے مذہب کا ماننے والا اتنی صاف ستھری اور اچھی تنقید کر رہا ہے جس مذہب
ماننے والے اب فارسی تو کیا اردو کو بھی ایک خاص مذہب سے ملوث کرنے پر مصر ہیں!
ایں چہ بوالعجبی است۔ اور عبدالواجد ندوی کی تحریر کی اہمیت یہ ہے کہ ۱۹۱۹ء میں
حد تک اقبال کی عظمت کا اعتراف ہو چکا تھا۔

(کرنل بھولا ناتھ قوم کے راجپوت تھے آبا و اجداد کا وطن اصلی ضلع پرتاب گڑھ تھا، مگر رنجیت سنگھ کے
میں آپ کے دادا پنجاب میں آئے اور یہیں سکونت اختیار کر لی۔ ۱۸۶۶ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ ۸۲
میں لاہور میڈیکل کالج میں داخل ہوئے۔ ۱۸۸۸ء میں امتیاز کے ساتھ تعلیم سے فراغت حاصل کی اور ۸۹
میں ڈاکٹری کی مزید تعلیم کے لئے انگلستان گئے۔ ۱۸۹۳ء میں انڈین میڈیکل سروس میں داخل ہو
(اعظمی)

مضمون کی فرمائش کا جواب

جناب "دھرم سروپ"

جناب مجیب صاحب،

یوم آزادی کی شام کو آپ نے فرمایا کہ جامعہ کے میگزین کے لئے مضمون لکھوں، آپ کا حکم سر آنکھوں پر لیکن مضمون نویسی دماغ والوں کا کام ہے اور قدرت نے میری سرشت میں دل کو دماغ سے زیادہ جگہ دی۔

جہاں والوں کا کیا ہے وہ تو دیوانہ سمجھتے ہیں
مجھے کچھ عقل سے اپنے ہی بیگانہ سمجھتے ہیں

مضمون نویسی کے لئے قابلیت، نکتہ سنجی، تنقیدی نظر اور زبان پر دسترس لازم ہیں۔ میں ان تمام اجزا کو کہاں سے لاؤں کہ آپ کے لائق کوئی مضمون لکھ سکوں، کامیاب کلرکی کر لینا اور بات ہے لیکن کوئی معیاری چیز اردو میں لکھنا اور بات، یہی وجہ تھی کہ میں نے عدیم الفرصتی کا عذر پیش کیا تھا، جس پر آپ نے فرمایا تھا کہ کل پر چھوڑنے سے کب کوئی کام سرانجام ہوتا ہے، آپ کی اس بات پر غور کرنے کا نتیجہ ہے کہ یہ خط آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں۔

آج تک آپ سے میری ملاقات محض ایک سرکاری ملازم کی حیثیت سے ہوتی رہی ہے۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اب آپ سے اپنی شخصیت کے اس پہلو کا تعارف کراؤں جو میری نظر میں افسری سے کہیں زیادہ اہم ہے اور جسے میں نے اب تک اس ڈر سے لوگوں کی نظروں سے چھپائے رکھا کہ کہیں اس کا انکشاف مجھے سرکاری حلقوں میں بدنام نہ کر دے۔ میری مراد اپنی خاموش اور محدود سی ادبی زندگی سے ہے جس کا پس منظر میری غریبی ہے، افسری نہیں۔ میں ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوا میں نے سفید پوشی کی بے بسی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہی نہیں شدت سے محسوس بھی کیا ہے، میں

اب بھی دیوانِ امارت میں اپنے آپ کو اجنبی سا پاتا ہوں اور جانتا ہوں کہ جب تک ہماری غریبی کے نتیجہ میں صحت وتندرستی اور زندہ دلی کی لہر نہیں دوڑ جاتی میرے لئے حصولِ امن وآشتی ناممکن ہے، اپنی ذاتی غریبی سے جہاد کرتے ہوئے میں نے اپنے طبعی میلان کو بہت حد تک قربان کر دیا۔ ایک وقت تھا جب میں اپنی زندگی ادب کے لئے وقف کرنا چاہتا تھا۔ تقریباً پچیس برس ہوئے جب میری پہلی ادبی کاوش" ادبی دنیا " لاہور میں ایک افسانے کی صورت میں شائع ہوئی۔ لیکن آخر پیٹ کی جیت ہوئی اور میں نے اپنی ساری قوت مقابلے کے امتحان میں لگا کر سرکاری نوکری کرلی۔ ہم سنا کرتے تھے کہ افسری محض مفت خوری ہوتی ہے۔ لیکن میرا تجربہ بالکل مختلف ہے یہاں تو پچھلے پچیس سال سے تن من اس افسری پر نچھاور ہو گئے ہیں۔ آپ ہی بتایئے کہ جس شخص نے اپنی تمام قوتوں کو فائلوں وغیرہ کے لئے وقف کر دیا ہو، وہ ادبی کام کرے تو کیونکر۔ لیکن خدا کا کرم ہے کہ برسوں کی غنودگی کے بعد لکھنے پڑھنے کا سلسلہ از سر نو شروع ہو گیا۔

مجھے پچھلی جنگ عظیم میں ہندوستانی فوجوں کے ساتھ لام پر جانا پڑا۔ جنگ کے محاذ پر انسانی حیوانیت پوری عریانی کے ساتھ نمایاں ہو رہی تھی، زندگی بے معنی سی معلوم ہوتی تھی۔ اس وقت سوامی وِویکانند کے لیکچروں کا مجموعہ میرے ہاتھ لگا۔ اس قدر رسیدہ انسان نے میری روحانی پیاس کو بجھایا اور مجھے ایک مقصد حیات سونپ دیا، خدمت خلق کا راستہ اور ساتھ ہی رازِ حیات بھی بتا دیا۔ حقیقتِ عشق اس کے بعد زندگی پر معنی ہو گئی۔

چشمِ ساقی کی ترجمانی سے — زندگی بھر گئی معانی سے

اور سر شکرانے میں جھک گیا۔

ہم نے پائی مسرتِ ابدی — اپنے ہی سوزِ جاودانی سے
حاصلِ زندگی ہیں وہ آنسو — جو گرے فرطِ شادمانی سے

اس کے بعد میں نے اپنی زندگی کو ایک نئے سانچے میں ڈھال دیا، ساتھ ہی ساتھ ہر مناسب طریقے سے کوشش کی کہ میری نوکری کی کوئی ایسی صورت نکل آئے جس سے براہِ راست

لوگوں کی مشکلات دور کرنے میں ہاتھ بٹا سکوں لیکن ؏

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی

مجھے نہ تو کوئی اپنی پسند کا کام ملا اور نہ ہی میری کسی سکیم پر پوری طرح غور ہوا مثلاً میں یقین سے کہتا ہوں کہ دہلی کی گندی آبادیوں (سلم) میں رہنے والے لوگوں کو سینکڑوں کروڑوں کے بڑے بڑے پلان بنائے بغیر صاف ستھرے مکانوں میں بسایا جا سکتا ہے بشرطیکہ اس کام پر ایک ایسے شخص کو لگایا جائے جو غریبی سے دوچار ہو چکا ہو اور جس کے دل میں درد ہو اور جو اپنے عہدہ کو اپنی ترقی ہی کا ذریعہ نہ سمجھتا ہو، بہر حال اس طرح کا کوئی عملی کام میرے حصے میں نہ آسکا، شروع شروع میں تو مجھے شکایت رہی کہ شاید میرے نام کے پیچھے آئی سی ایس یا آئی۔ اے ایس کی دُم نہ ہونے کی وجہ سے مجھے نظر انداز کیا جا رہا ہے لیکن سوامی دویکانند کے مطالعہ کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ انسان کوئی کام اس وقت تک نہیں کر پاتا جب تک وہ اپنے آپ کو یزدانی مقصد کے موافق نہ بنا لے۔ ہماری تمام کوششیں، ہماری سب کاوشیں تب ہی بار آور ہوتی ہیں جب وہ رضائے الٰہی کے مطابق ہوں، میں یہ بھی جانتا ہوں کہ زندگی محض پچاس ساٹھ سال کے وقفہ پر مبنی نہیں ہے، انسانی ارتقا بار بار جنم لے کر ہوتی ہے یہاں تک کہ دوسروں کی بھلائی کے کام بھی ہماری روحانی ارتقا کے سلسلے کی ایک کڑی ہیں، اگر مجھے آج تک کسی ایسے کام کا موقع نہیں ملا جسے میں کرنا چاہتا ہوں تو میں سمجھتا ہوں کہ میں ابھی اس کے قابل نہیں ہو پایا اور مجھے اپنے آپ کو بہتر بنانے کی کوشش کرنا چاہیئے، دوسرے میں سمجھتا ہوں کہ سچے معنوں میں تعمیری کام ملازمت میں رہ کر نہیں ہو سکتا۔ سرکاری محکمے بہت سا مفید کام کرتے ہیں، رفاہِ عام پر بھی زور دیا جاتا ہے لیکن یہاں کچھ ایسی مجبوریاں ہیں کہ ملازمین کی اسّی فیصدی سے زیادہ قوت محض کاغذی کارروائیوں میں لگ جاتی ہے۔

ان جملہ ہائے معترضہ کے لئے معافی چاہتا ہوں، میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ میدانِ عمل میں براہِ راست گامزن ہونے کا موقع نہ پاکر میرے دل و دماغ کو فائلوں سے فرار کی ضرورت محسوس ہوئی۔ دوسروں کی اسکیموں پر مسلسل تنقید سے دماغ میں ایک قسم کا "نفی پن" آنے کا ڈر ہوتا ہے

اور ہم میں سے بہت سے افسر نوٹ لکھتے لکھتے اپنی قوتِ تخلیق کا گلا گھونٹ دیتے ہیں اور تعمیری کام کے قابل نہیں رہتے۔ اگرچہ اوائل جوانی میں مجھے بھی خودکشی کے خیال نے ستایا تھا لیکن مجھے دماغی اور روحانی خودکشی منظور نہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ میرے دماغی ہیجان نے ایک قسم کی بغاوت کی صورت اختیار کر لی۔ میں رشوت ستانی کو کم نہ کر سکا، بڑے بڑے لوگوں کو پبلک کا پیسہ ہڑپ کرنے سے نہ روک سکا، چاروں طرف جو چراغ بکف لوٹ پڑ رہی تھی اسے بے بس آنکھوں سے دیکھنے کے سوا کچھ نہ کر سکا، عوام کی بہبودی کی سیدھی سادی باتوں کو قانونی، سیاسی، اور مالی پیچ وخم میں الجھنے سے نہ بچا سکا لیکن بطور ردِ عمل میرے خیالات چھوٹے چھوٹے افسانوں میں ڈھلنے لگے مجھے اپنی قوم اور ملک کی ترقی کا پورا یقین ہے محض طنز اور نکتہ چینی میری فطرت نہیں، اِن افسانوں سے کچھ تو اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا منظور تھا اور کچھ اپنی امیدوں کو زندہ رکھنا، تاکہ تعمیر کے خواب پریشان نہ ہونے پائیں۔ ان "افسانچوں" کی تکنیک بھی روشِ عام سے قدرے مختلف ہے، اِن میں نہ تو پس منظر کو تعمیر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور نہ انجام کو واضح کیا جاتا ہے۔ ایک جانی بوجھی حقیقت کی جھلک نمودار ہوتی ہے اور جھٹ سے چھپ جاتی ہے اور بہت کچھ پڑھنے والے کے تخیل پر چھوڑ جاتی ہے یا یوں کہیے کہ افسانچہ "محض کلائمکس" پر منحصر ہوتا ہے۔ نمونہ کے طور پر اسے دیکھیے۔

"کمار کی حالت اُس ہوائی زکی سی تھی جس کے سارے انجن یکدم فیل ہو گئے ہوں اور جس کا مسافروں سے لدا ہوا جہاز پوری سرعت سے بھیانک موت کے منہ میں جا رہا ہو، اس کا ہاتھ آشا کی نیم برہنہ مرمریں کمر سے لپٹے ہٹ گیا جیسے اُس پر فالج گر گیا ہو، اس کا اُبلتا ہوا خون منجمد ہو گیا، اس کی زبان بند ہو گئی، آشا کے چہرے پر ایک زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوئی وہ ساڑھی کے سر کلئے ہوئے آنچل کو سنبھالتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"تو تم ارونا کو جانتی ہو" کمار نے بہ مشکل کہا۔

"جانتی تو نہیں لیکن سب کچھ سن چکی ہوں، تم اب بھی اس سندر ناری پر جان دیتے ہو۔ تم نے اُسے گھر سے نہیں نکالا، وہ خود ہی میکے چلی گئی ہے۔ تم نے دوسری شادی کا ناٹک کس مطلب کے لئے رچا ہے وہ بھی جانتی ہوں، کہتے کیوں نہیں "مجھے تم سے محبت ہے"۔ جھوٹے پیار کا ڈھونگ

پھلنے کی بھی ہمت نہیں رہی کیا جن باتوں سے مجھے دھوکا دے کر بیاہ لائے ہو وہ سب کیا ہوئیں خیر اب تمھاری زبان کیسے کھلے گی، اگر اتنا اور جان لو کہ آج تک تم نے مجھے غلط سمجھا ہے، میری اٹھتی جوانی کی فیشن پرستی کو تم نے بے شرمی اور بے حیائی سے تعبیر کیا ہے۔ میرے کنوارپن کی چنچلتا کو تم نے عشوہ و ادا سمجھا میری آزاد روی سے تم یہ سمجھ بیٹھے کہ میں ایک "چیپ" قسم کی عورت ہوں، تمھاری اس غلط فہمی کی کچھ ذمہ داری مجھ پر بھی عائد ہوتی ہے۔ اور یہی میری زندگی کی ٹریجیڈی کا کارن ہے کہ مجھے آج سے وہ راہ اختیار کرنا ہو گی جس پر تم پہلے سمجھتے تھے کہ میں گامزن ہوں۔ لیکن تم مجھے بڑے بڑے ٹھیکے حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں بنا سکو گے کمار، تم نے مجھے بیاہ کر میری پرورش اور حفاظت کا ٹھیکہ اٹھا لیا ہے، میرے "بزنس میں" تم نے جن پاک جذبات کو ہمیشہ کے لئے کچل دیا ہے وہ چنگاریاں بن کر اٹھیں گے، میرے پیار کی پھوار اب طوفان بن کر ٹوٹ پڑے گی۔ میرے حسن کی چاندنی بجلی بن کر چمکے گی۔ اب میں اپنی معصوم آرزوؤں اور امنگوں کے خون سے ہولی کھیلوں گی، آج سے میری سہاگ کی راتیں شروع ہوتی ہیں مگر تم ان میں حصہ دار نہیں ہو گے، میرے تاجر خاوند۔ ٹاٹا۔"

اس طرح میں نے اپنے ماحول سے متاثر ہو کر کئی ـــــ افسانے لکھے ان کا موضوع زیادہ تر ایسے واقعات تھے جن سے مجھے اپنی نوکری کے سلسلے میں واسطہ پڑا اور جن کا رخ میں اپنی مرضی کے مطابق نہ بدل سکا۔ ان کہانیوں سے دماغی کوفت تو ضرور کسی قدر کم ہوئی لیکن دل کو اطمینان نصیب نہ ہوا اس کے لئے مجھے اپنے لئے ایک اور شغل نکالنا پڑا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ دویکانند کے مطالعہ سے ہی یہ شغل مجھے عطا ہوا، میں نے اردو شاعری (خصوصاً صوفیانہ شاعری) کا برسوں سے ٹوٹا ہوا تعلق پھر سے تازہ کیا، اور کبھی کبھی اپنی پسند کے اشعار کا آزاد ترجمہ انگریزی زبان میں کرنے لگا۔ اس طرح ایک تو مجھے ان اشعار کے معنی کو سمجھنے میں مدد ملتی اور دوسرے دل و دماغ کو تسکین حاصل ہوتی۔ غالب، اقبال، اصغر، جگر، مجاز، مخمور اور دوسرے شعرا کا کلام خیالاتِ پریشان کی جگہ لے بیٹھا اور اگر کوئی چیز روح میں جذب ہو جاتی تو انگریزی کا جامہ پہن کر نمودار ہو جاتی، ایک آدھ بار ایسا بھی ہوا کہ انگریزی سے کوئی اچھی چیز اردو کے قالب میں بھی ڈھل گئی مثلاً ورڈز ورتھ کی مشہور نظم "ٹنٹرن ایبی" کے ایک جز کا ترجمہ حاضر ہے۔

میری عقل و خرد سو گئی ہے
ورنہ ایسی نہ کچھ بے ہوشی ہے
بند ہے آنکھ، پر دیکھتی ہے
سو گیا جسم، جان جاگتی ہے
رک گئی ہے مری سانس ایسے
بے خودی میں ہویدا خودی ہے
خون رگوں میں نہیں ہے رواں اب
دل کی دھڑکن میں اک شانتی ہے
کیسی حالت ہی میں کیا کہوں اب
مٹ گئے غم خوشی ہی خوشی ہے
حل ہوئے زندگی کے معمے
زیست معنی سے ایسی بھری ہے
دور ظلمت ہوئی نور پھیلا
ہر طرف اک نئی روشنی ہے
برکت و رحمتِ حق کی بارش
مجھ گناہ گار پر ہو رہی ہے
بوجھ ہلکا ہوا زندگی کا
ناچتی کھیلتی جا رہی ہے
روح خوشیوں سے بھرپور ہو کر
ساری دنیا کا منہ چومتی ہے
آج ہر شے پہ چھائی ہے مستی
اک مسرت میں فطرت لبی ہے
کوہ و دریا میں شاخ و شجر میں
دیکھتا ہوں کہ جان پڑ گئی ہے
ذرے ذرے میں خورشید لرزاں
قطرے قطرے میں دریا دلی ہے
انبساط و نشاطِ خودی سے
زیست احساس سے کانپتی ہے

اصلِ توحید ہے یہ نظارہ
اور یہی جانِ رنگِ دوئی ہے

یہ کچھ کم حیرانی کی بات نہ تھی کہ اس طرح کبھی کبھی کچھ شعر موزوں ہونے لگے۔ خیال کیجئے کہ ایک ایسا شخص جسے اردو داں طبقے میں رہ کر اس زبان کے محاورے اور تلفظ سیکھنے کا موقع نہ ملا ہو جو اس لحاظ سے تقریباً ان پڑھ ہو، شعر کہنے لگا اور وہ بھی تعلیم ختم کرنے کے کئی برس بعد۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہو سکتی ہے کہ ہر وہ انسان جسے قدرت نے کسی قدر اپنا راز داں بنایا ہو، اپنے لئے ایک فلسفہ حیات، ایک نظریہ قائم کر لیتا ہے اور اگر حالات موافق ہوں تو یہ فلسفۂ حیات کسی نہ کسی صورت میں مجسم ہو کر ظاہر ہوتا ہے، دوسرے یہ کہ زندگی میں کئی موقعے ایسے بھی آتے ہیں جب ہمیں اپنے یقین کو

اور بھی مستحکم کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ ایسے موقعوں پر ایک اندرونی آواز تلقین کرنے کو نکلتی ہے۔ اور خدا کے لطف و کرم کا ایک مزید ثبوت یہ ہے کہ نغمہ بردوش آتی ہے۔ بشرطیکہ ان نغموں کو ذریعۂ عزت نہیں بلکہ حصولِ نشاط کا وسیلہ بنایا جائے۔ میرے لئے شاعری محض منظوم تخیل کا نام نہیں، میں سمجھتا ہوں کہ شعر اصل میں ایک غیر مرئی نغمہ ہے جو ہمیشہ روح کی گہرائیوں میں گونجتا رہتا ہے، اس نغمہ کے سارے سروں کو سننے کی صلاحیت صرف خدارسیدہ اور خودشناس صوفی ہی میں ہوتی ہے، وہ جب چاہے اسے بہشت گوش کر سکتا ہے لیکن ایسا صوفی عموماً خاموش رہتا ہے یا اس کی زبان سے اناالحق کی آواز نکلتی ہے اور وہ بھی کبھی کبھی، شاعر اگرچہ بیک وقت کچھ ہی سروں کو سن سکتا ہے لیکن یہ اسی کا حصہ ہے کہ وہ ان سروں کو قوس و قزح کی صورت میں مجسم کر دیتا ہے اور وہ لوگ بھی جو براہ راست اس ابدی نغمہ کو سننے سے قاصر ہیں اس کی آوازِ بازگشت سے فیض یاب ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ روحانی نغمگی اس شاعر کو نصیب ہوتی ہے جو رنج و الم میں ڈوب کر بھی نشاط کا تقاضا کرے۔ ظلمات میں گھر کر بھی نور کا متلاشی ہو، گندگی اور سڑن کے ماحول میں بھی رنگ و بو کے خیال سے وابستہ رہے اور بدصورتی اور قباحت کے دائرہ میں بھی مرکزِ حسن سے غافل نہ ہو، جو شیطنت کے طوفان میں یزدانی لَو کو محفوظ رکھے، حیوانیت کے دور میں انسانیت کا علم بردار ہو۔ جھوٹ کے جابرانہ عہد میں سچائی پر جان دے، شور و غل میں نغمۂ ازلی کی لَے کو نہ بھولے، موت سے شکست نہ کھائے اور زندگیٔ جاوید کو اپنانے میں کوشاں رہے، ایسا شاعر فکر و عمل کے گنگا جمنی سنگم سے نغموں کی سرسوتی کو نمودار کرتا ہے اور اس پوتر (پاک) تریوینی میں اشنان کر کے زندگی تر و تازہ ہو کر نکلتی ہے۔

تو لیجئے یہ معذرت نامہ ایک مضمون کی صورت اختیار کر ہی گیا اب آپ کو یہ شکایت تو نہیں ہوگی کہ میں نے لکھنے کی کوشش نہیں کی، کچھ کام کی بات کہہ پایا ہوں کہ نہیں اس کا فیصلہ آپ ہی کر سکتے ہیں البتہ اگر آپ اجازت دیں اور زبان اور عروض کی خامیوں کی اصلاح کا ذمہ اپنے سر لیں تو میں خیالات کو منظوم کر کے بھی پیش کئے دیتا ہوں۔

غرض نہیں مجھے اس سے کہ سروری کیا ہے
میں جانتا ہوں مگر شانِ بندگی کیا ہے

بلندیوں کو جو عرشِ بریں کی چھو نہ سکے
وہ موجِ خاکِ فقیری و عاجزی کیا ہے

خدا ہے جس کے لئے بے قرار وہ سجدہ
جبیں میں جس کی نہ تڑپے وہ آدمی کیا ہے

وصال و ہجر کی جو قید سے نہ ہو آزاد
وہ عشق کیا ہے وہ اندازِ دوستی کیا ہے

خیالِ یار میں اپنے سے جو رہے آگاہ
بھلا وہ عاشقی کیا ہے وہ بیخودی کیا ہے

جو ارتقائے خودی سے خدا تک آ نہ گیا
فرشتہ رہ گیا بن کر جو آدمی کیا ہے

جو بے خودی کو سمو پائے اپنے دامن میں
جو رازِ مرگ نہ پا جائے وہ خودی کیا ہے

جو حسن و عشق کی جزئیات میں رہے محدود
جو اپنا آپ نہ پائے وہ آگہی کیا ہے

جو شورِ زیست کو اپنے میں جذب کر نہ سکے
نہ جس سے نغمے اٹھیں وہ بھی خامشی کیا ہے

نفس نفس میں نہ جس کے بہارِ تازہ ہو
جو رنگ و بو نہ بکھیرے وہ زندگی کیا ہے

جو جگمگا نہ سکے غم کدوں کی ظلمت کو
ستارہ زا بھی اگر ہو تو روشنی کیا ہے

جو آنسوؤں کو نہ شب کے بنا سکے موتی
جو آفتاب نہیں دل کی روشنی کیا ہے
جو صرفِ خدمتِ خلقِ خدا نہ ہو پائے
بسر جو اپنے لئے ہو وہ زندگی کیا ہے
وہ عشق عشق نہیں جس میں غم کا ہو احساس
تری خوشی میں خوشی ہے تو پھر غمی کیا ہے
جو رنگ دیوے تبسّم سے غنچۂ دل کو
مسرتوں سے نہ بھر دے وہ شاعری کیا ہے

یہ ہے "مایۂ خورش" جسے میں نے آپ کے سپرد کر دیا ہے اب مجھے آپ سے فقط اتنی درخواست کرنا ہے کہ اگر آپ اس خط کو یا اس کے کسی جزو کو اپنے میگزین میں جگہ دینے کا فیصلہ کریں تو دھرم سروپ کے نام سے چھپوائیں۔ اس نام سے نہیں جس سے مجھے لوگ سرکاری حلقوں میں جانتے ہیں۔ میرے عہدہ وغیرہ کا حوالہ بھی ازراہِ کرم مت دیجئے گا بہر حال اِسے واپس کر دیا تو عنایت ہو گی۔

آپ کا

دھرم سروپ

(بقیہ صفحہ ٣٧٦)

کو مطمئن کر دے۔ شمالی ہندوستان کی ترقی کے ساتھ جنوبی ہندوستان کی ترقی بھی ضروری ہے، ارسطو نے سیاسی انقلابات کے اسباب کا تجزیہ کرتے وقت اس طرف توجہ دلائی ہے کہ ریاست اور دستور کی پائداری کے لئے ضروری ہے کہ کسی طبقہ یا علاقہ کو یہ محسوس نہ ہو کہ وہ نظر انداز کیا جا رہا ہے، اس سیاسی دانشمندی کا آج بھی اتنا ہی وزن محسوس ہوتا ہے جتنا خود ارسطو کو محسوس ہوا ہوگا۔ ہندوستان کی مرکزی حکومت کے لئے ڈی، ایم، کے، کے مقاصد اور اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت ایک چیلنج ہے۔ یہ چیلنج وہ کس طرح قبول کرتی ہے، اس میں ہندو حکومت کی آزمائش ہے۔

ض، ح، ف،

١٥ فروری ١٩٦٢ء

حالات حاضرہ

عام انتخابات

ہندوستان کے عام انتخابات ختم ہوگئے اور ریاستوں میں وزارت سازی کا کام ہو رہا ہے، اس لئے
ابھی مبتی ہوئی سیاسی جماعت یعنی کانگریس کو انتخابات کا تجزیہ کرنے اور نتائج کا جائزہ لینے کا موقع نہیں
ملا ہے۔ اس لحاظ سے دوسری جماعتیں اس پوزیشن میں ہیں کہ وہ نئے انتخابات کی روشنی میں اپنی حیثیت اور
موقف کا جائزہ لیں اور اس سے کچھ نتائج نکالیں۔

راجستھان اور مدھیہ پردیش کے علاوہ جہاں کانگریس کو مطلق اکثریت نہیں حاصل ہوئی ہے، باقی
اور ریاستوں میں اور لوک سبھا میں کانگرس اکثریت سے کامیاب ہوئی ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا
ہے کہ ہندوستان کے عوام کی اکثریت کانگریس کی پالیسی اور پروگرام سے اتفاق کرتی ہے، لیکن یہ بات بھی اپنی
جگہ بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ گذشتہ انتخابات کے مقابلہ میں کانگرس کو مجموعی طور پر کم نشستیں ملی ہیں اور
اس میں برسر اقتدار پارٹی کے لئے ایک انتباہ ہے، جن سنگھ اور سوتنترا پارٹی کو جو کچھ کامیابی حاصل ہوئی
ہے اس کے پیش نظر بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ووٹ دینے والوں کی ایک غیر متوقع تعداد کا
جھکاؤ دائیں بازو کی طرف ہے یعنی سوشلزم اور ترقی پسندی کے منافی ہے۔

جمہوری ریاستوں میں جب انتخابات ہوتے ہیں تو مختلف النوع عناصر اور اثرات کام کرتے
ہیں اور ہندوستان ایسی نوزائیدہ جمہوری مملکتوں میں جو مختلف حیثیتوں سے پسماندہ ہیں اور جہاں جمہوری
اور دستوری ادارے ابھی نشوونما کی ابتدائی منزلوں میں ہیں، یہ عناصر اور اثرات پیچ در پیچ ہوتے
ہیں، پھر بھی حالات کی مجموعی کیفیت امید افزا رہی ہے، یہ ضرور ہے کہ گذشتہ انتخابات کے
مقابلہ میں اس بار تشدد کا کیف و کم کچھ زیادہ رہا ہے اور فرقہ پرستی، ذات پات کا تصور اور جاگیردارانہ
ذہنیت اور قدامت پسندی نے بھی رائے دینے والوں کو متاثر کیا ہے، لیکن یہ بھی ایک حقیقت

ہے کہ ایسے حلقوں کی تعداد اچھی خاصی رہی ہے جہاں اصولوں کے لئے انتخابی جنگ لڑی گئی ہے اور ایسے حلقوں میں کانگریس نے نمایاں کامیابی حاصل کی ہے، اس کی روشن اور واضح مثالیں شہر بمبئی کا شمالی حلقہ، امروہہ، بلرام پور اور نئی دہلی کے حلقے تھے، یہ مثالیں ایسی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کی جمہوریت کو فروغ حاصل ہو رہا ہے اور رفتہ رفتہ یہاں کے ووٹ دینے والے پختگی اور رسیدگی کی منزل کی طرف آگے بڑھ رہے ہیں۔

اس بار انتخابات کے موقع پر یہ خیال عام تھا کہ ہندوستان اور چین کے تعلقات میں کشیدگی کے سبب کمیونسٹ پارٹی کی بھاری شکست ہوگی، لیکن نتائج سے ثابت ہوا کہ یہ خیال صحیح نہیں تھا، البتہ مغربی بنگال میں کمیونسٹوں کی امیدوں کے مطابق نتیجہ نہیں نکلا، انتخابات کا ایک غیر متوقع نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ مخالف پارٹیوں کے بڑے بڑے ستون گر گئے، پرجا سوشلسٹ پارٹی جن سنگھ، ہندو مہا سبھا، سوتنترا پارٹی، کمیونسٹ پارٹی کے باحیثیت نیتا کیوں ناکام رہے، یہ وہ معمہ ہے جسے شاید ووٹ دینے والے بھی نہیں سمجھ سکتے، دوسری دلچسپ اور اہم بات یہ ہوئی کہ ریاستوں میں وزیروں کی اچھی خاصی تعداد ووٹ دینے والوں کے معیار پر پوری نہیں اتر سکی، اس کی ایک وجہ تو غالباً ریاستی حکومتوں کی بعض انتظامی خامیاں تھیں لیکن دوسری وجہ جو کانگریس کی تنظیم سے متعلق ہے اور دور رس نتائج کی طرف اشارہ کرتی ہے، کانگریسیوں کا اپنا اندرونی اختلاف ہے جو شخصی مناقشات پر مبنی ہے، ایسی مثالیں کافی ہیں کہ کانگریسیوں نے کانگریسیوں کی مخالفت کی اور دوسری جماعتوں کے امیدواروں کو کامیاب ہونے میں مدد دی، یہ صورت حال بڑی افسوسناک ہے کیونکہ اس وقت کانگریس ہی ایسی سیاسی تنظیم ہے جو ملک میں یکجہتی اور اتحاد قائم رکھ سکتی ہے، قوم نے اسے اقتدار بخش کر کانگریسیوں کو موقع دیا ہے کہ وہ اپنی تنظیم مضبوط کریں، اپنی پارٹی کے پروگرام سے متعلق اپنے ایمان کی تجدید کریں اور اسے عملی شکل دینے کے لئے اجتماعی کوشش کریں۔

انتخابات اور مسلمان

اس مرتبہ لوگوں کی نظر اس بات پر بھی تھی کہ مسلمانوں کا کیا رویہ ہوتا ہے، اس لئے کہ مدھیہ پردیش

کے فسادات اور رانچی، علی گڑھ اور یوپی کے مغربی اضلاع کے فرقہ وارانہ ہنگاموں اور کشیدگی کے دوران فرقہ پرستی اس طرح عریاں ہو کر سامنے آگئی تھی کہ مسلمان بہت بد دل ہو گئے تھے، اور ریاستی حکومتوں سے اُن کی شکایتیں بڑھ گئی تھیں، فرقہ پرستی کے اس طوفان میں جمعیتہ العلماء جیسی قوم پرست جماعت بھی غیر مسلموں اور بعض ذمہ دار حضرات کے نزدیک مشتبہ ہو گئی تھی اور اس کے قومی کردار پر بھی حرف گیری شروع ہو گئی تھی۔ صورت حال ایسی تھی کہ جمعیتہ کے ناظم اعلیٰ مولانا حفظ الرحمن صاحب کو اُن کے بعض رفقاء نے مشورہ دیا کہ لوک سبھا کے بجائے راجیہ سبھا میں آنے کی کوشش کریں، مولانا نے اس مشورہ کو قبول نہیں کیا، اسے فرقہ پرستی کے سامنے ہتھیار ڈال دینے سے تعبیر کیا اور عقبی دروازے سے پارلیمنٹ میں آنے کی تجویز رد کر دی، ان حالات میں یہ بجا تھا کہ مسلمان ووٹروں کا رویہ زیر نظر رہے۔

اس بار ایک خاص بات تو یہ تھی کہ ۱۹۵۷ء کے مقابلہ میں کانگریس نے مسلمانوں کو کسی قدر کم ٹکٹ دیئے، دوسری بات یہ تھی کہ مسلمان آزاد امیدواروں کی تعداد زیادہ تھی، بعض مسلمان ریپبلکن پارٹی کے پلیٹ فارم سے امیدوار کی حیثیت سے سامنے آئے اور دو چار کامیاب بھی ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ کانگریس امیدواروں کے مقابلے میں جن سنگھ اور دوسری جماعتوں کی تائید اور مدد سے بعض مسلمان الیکشن لڑے اور مسلم ووٹ تقسیم ہوئے، بعض حلقوں میں مسلمانوں نے بھی فرقہ پرستی کا مظاہرہ کیا اور طے کیا کہ وہ مسلمان امیدوار ہی کو ووٹ دیں گے خواہ وہ کسی پارٹی سے تعلق رکھتا ہو، غرض اس طرح کی خبریں موصول ہوئی ہیں، نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کہاں تک صحیح ہیں، لیکن اگر گزشتہ سال کے فسادات کا کچھ اثر مسلمانوں پر پڑا ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں، سوال یہ ہے کہ کانگریس کو اس بات کا کہاں تک احساس ہے اور خود کانگریس کے اندر کتنے کھدر پوش ایسے ہیں جو تہذیب، ترقی اور صحت مند قومیت کے دشمن ہیں دوسری طرف مسلمانوں کو بھی یہ سوچنا ہے کہ اُن کا منفی طریقہ کار خود ان کے لئے کہاں تک مفید ہو سکتا ہے، فرقہ پرستی کے ردعمل کے طور پر اگر ان میں بھی فرقہ پرستی پیدا ہوئی تو اس میں خود ان کا اور سارے ملک کا نقصان ہے۔ ہندوستان کے آزاد شہری کی حیثیت سے انھیں اس کا اختیار ہے کہ وہ جس

پارٹی میں چاہیں شریک ہوں اور جس امیدوار کو چاہیں ووٹ دیں، ہمارا مشورہ صرف یہ ہے کہ وہ تنگ نظر، رجعت پرست اور تعمیری پروگرام سے عاری کسی سیاسی جماعت کا ساتھ نہ دیں۔ خوب وزشت میں تمیز کریں اور ملک کے صحت مند اور ترقی پسند عناصر کے ساتھ قدم ملا کر چلیں۔

اب انتخابات کے بعد

اسٹیٹسمین کے نمائندۂ خصوصی کی رپورٹ ہے کہ ۱۱ر مارچ کو وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے دہلی میں کانگریس پارلیمنٹری پارٹی کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آئندہ پانچ سال کا زمانہ ہندوستان کے لئے فیصلہ کن ہوگا اور اس مدت میں ہندوستان کے مقدرات کا فیصلہ ہوگا۔ رپورٹ میں اس کی تفصیل نہیں ہے کہ ان کے اس اہم بیان کا کیا سیاق و سباق تھا، بہرحال رپورٹ کا بغور مطالعہ کرنے سے چند باتیں ذہن میں ابھرتی ہیں جو حسب ذیل ہیں:-

۱۔ انتخابات کے نتائج۔
۲۔ کانگریس کے اندرونی اختلافات۔
۳۔ ہندوستان اور چین کا سرحدوں سے متعلق تنازعہ۔
۴۔ پاکستان سے تعلقات
۵۔ ہندوستان کی صنعتی ترقی اور پنج سالہ منصوبہ۔
۶۔ قومی یک جہتی کا منصوبہ۔

یہاں ہم بین الاقوامی معاملات سے جن سے چین اور پاکستان کا معاملہ بھی وابستہ ہے تفصیلی بحث نہیں کریں گے کیونکہ ان کے بارے میں کسی قسم کی قیاس آرائی قبل از وقت ہوگی۔ لیکن جہاں تک کانگریس کے اندرونی اختلافات، قومی یکجہتی کی ضرورت اور پنج سالہ منصوبہ اور اس طرح کے دوسرے اہم امور کا تعلق ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ملک و قوم کا مستقبل بڑی حد تک ان ہی سے متعلق ہے۔

کانگریس کے اندرونی اختلافات کی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے، یہ اختلافات ایک طرف

توذاتی مناقشات پر مبنی ہیں تو دوسری طرف ایک خاص لیکن اہم حلقہ میں نظری حیثیت بھی رکھتے ہیں
ان ہی اسباب کی بنا پر کانگریس کا تنظیمی ڈھانچہ کمزور ہوتا رہا ہے اور نظم و نسق اور بنیادی پالیسی کو
عمل میں لانے کا منصوبہ اُس جوش اور شوق، محنت اور جدوجہد سے محروم رہا ہے جس کا کہ وہ
مستحق تھا اور اس سلسلہ میں ریاستی حکومتوں پر زیادہ ذمہ داری آتی ہے، لیکن مرکزی وزرا اور
کانگریس کے ہائی کمان کا اندرونی نظری اختلاف بھی کچھ کم ذمہ دار نہیں ہے، غالباً اب وہ
موقع آگیا ہے کہ سوشلزم کے خلاف جو عناصر ہیں انھیں پنڈت نہرو یہ جتادیں کہ کانگریس
میں ان کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے، پنڈت جی کو اپنی پارٹی کے اندر یہ نظری جنگ تیز کرنی
ہوگی، یہ کام اگر پنڈت جی نے ہمت اور حوصلہ کے ساتھ شروع کردیا تو اس میں کوئی شبہ نہیں
کہ ہندوستان کی اکثریت پنڈت جی کے ساتھ ہوگی، یہ بہت بڑا اور اہم کام ہوگا اور اس لحاظ
سے آئندہ پانچ سال کا زمانہ ملک کی تاریخ میں فیصلہ کن اہمیت کا حامل ہوگا۔ اگر کانگریس
کی جیت پارلیمانی طرز جمہوریت اور سوشلزم کی جیت ہے تو پنڈت نہرو کو اس کام کا بیڑا
اٹھانا چاہیئے، یہ کام وہی کر سکتے ہیں۔

الغرض، کانگریس آئندہ پانچ سال کی مدت میں اگر اپنی تنظیمی کمزوریوں کو دور نہیں کرتی
اگر وہ اپنا تنظیمی ڈھانچہ منفی طریقۂ کار سے یعنی وزارتیں اور عہدے تقسیم کرکے باقی رکھتی ہے اور
فکر و عمل کی دنیا میں یکجہتی اور اتحاد سے محروم رہتی ہے تو ملک کو ایک سخت آزمائش کا سامنا ہے
ہے۔ پنج سالہ منصوبے کی کامیابی اور ملک کی تعمیر و ترقی کا انحصار جہاں ایک طرف اس بات پر ہے
وہاں اس بات پر بھی ہے کہ آئندہ بین الاقوامی صورت حال کیا ہوتی ہے کیونکہ اسلحہ بندی کی آگ
کوئی صورت نہ نکلی تو ہر وقت کسی نہ کسی "آتش فشاں" کا خطرہ رہے گا۔ اور اس حالت میں بیرونی
امداد کا معاملہ نشیب و فراز کی غیر یقینی کیفیت سے وابستہ ہوجائے گا۔ چین اور پاکستان سے تعلقات
کی نوعیت کا بھی ملک کے تعمیر و ترقی کے پروگرام پر اثر پڑے گا۔

قومی یک جہتی اور ہم آہنگی

قومی اتحاد اور یک جہتی کا مسئلہ بھی کم اہم نہیں ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے

انتخابات سے کچھ عرصے پہلے ملک کے صائب الرائے اشخاص کی جن کا تعلق تقریباً ہر سیاسی جماعت سے تھا، ایک کانفرنس منعقد ہوئی تھی اور ملک میں انتشار و اختلافات کے رجحانات نے جو صورت حال پیدا کر دی ہے اس کی نزاکت اور قوم یکجہتی کی اہمیت کو شدت سے محسوس کیا گیا تھا، کچھ طریقہ ہائے کار بھی تجویز کیے گئے تھے، سیاسی جماعتوں سے یہ توقع کی گئی تھی کہ وہ انتخابات کے مواقع پر ایسے نعرے نہیں لگائیں گی اور ایسے ذرائع اختیار نہیں کریں گی جن سے قومی یکجہتی اور جذبہ باہمی ہم آہنگی کا تصور مجروح ہو اور انتشار و خلفشار کی طرف لے جانے والے عناصر اور رجحانات کو تقویت ملے۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ انتخابات میں شائع ہونے والے پوسٹروں اور اشتہاروں اور لگائے جانے والے نعروں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ سیاسی جماعتوں نے وہ توقعات پوری نہیں کیں، اور یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اس خاص معاملہ میں آج بھی ہم وہیں ہیں جہاں قومی یکجہتی کی کانفرنس سے پہلے تھے۔ یہ ضرور ہے کہ اس معاملہ کی اہمیت اور صورت حال کی نزاکت کا احساس شدید ہو گیا ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ اس بات سے تو کوئی اختلاف نہیں کرتا کہ اتحاد کی ضرورت ہے لیکن قومی اتحاد کا مفہوم زیادہ تر لوگوں کے ذہن میں صاف نہیں ہے اور ہر شخص اپنے تعصبات ذہنی کے ساتھ اپنا الگ مفہوم رکھتا ہے، اس الجھن سے وہ صائب الرائے اشخاص بھی محفوظ نہیں ہیں جو مذکورہ کانفرنس میں شریک ہوئے تھے اس لئے سب سے اہم اور اشد ضرورت یہ ہے کہ قومی اتحاد و ہم آہنگی کے سلسلہ میں ملک کے فعال عناصر میں نظری اتحاد ہو اور پھر خاصے وسائل، تعلیمی و تہذیبی پروگراموں اور انتظامی کمال و خوبی کے ساتھ ملک کے گوشے گوشے میں اسے ایک تحریک بنا دی جائے، بغیر ان تحرکات کے قومی آہنگی کی نیک خواہش شرمندۂ عمل نہ ہو گی۔

ڈی، ایم، کے،

ہندوستان میں ایسے لوگوں کی تعداد کافی ہو گی جنھیں مدراس میں ڈی، ایم، کے، (دراوڑ مونیتر کازگم) کی غیر متوقع کامیابی پر حیرت ہو گی، اخباری اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پارٹی کے دو خاص مقاصد ہیں:

۱۔ ڈریوڈین ریاستوں کی آزادی اور اُن کا وفاق۔

۲۔ ایک ایسے سوشلسٹ سماج کا قیام جہاں طبقات اور ذات پات کا کوئی تصور نہ ہو۔

فی الحال آندھرا، کیرالا اور میسور میں اس جماعت کو کوئی تائید حاصل نہیں ہے لیکن اس کا پروگرام ہندوستان کی یکجہتی اور اتحاد کے لئے بہت خطرناک ہے، کہا جاتا ہے کہ جہاں تک معاشرتی اصلاحات کا تعلق ہے ہندوستان میں اس سے زیادہ ترقی پسند جماعت کوئی اور نہیں ہے، لیکن شاید اس میں مبالغہ ہے اس لئے کہ کمیونسٹ آیڈیالوجی بھی اسی طرح کا سماج چاہتی ہے اور کانگریس بھی نظری حد تک ذات پات کے فرق کو ختم کرنا چاہتی ہے البتہ طبقات کو ختم کر دینے سے متعلق اس وقت اس کا ذہن صاف نہیں ہے، اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ کانگرس کا سوشلسٹ سماج غیر طبقاتی نہیں ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ مدراس میں ڈی، ایم، کے مقبول ہونے کے کیا اسباب ہیں؟ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل باتیں کہی جاتی ہیں:

۱۔ اس جماعت کا یہ خیال ہے کہ شمالی ہندوستان اپنی صنعتی پیداواروں کے لئے جنوب کو اپنا بازار بنانا چاہتا ہے اور آج کے ہندوستان میں یہ ممکن نہیں ہے کہ جنوبی ہندوستان کے ساتھ انصاف ہو سکے۔

۲۔ ہندی زبان ہندوستان کی سرکاری زبان ہے، یہ بات اس کے لئے مایوس کن ہے اس لئے وہ ہندی زبان کے سامراج سے تعبیر کرتی ہے اور کامراج حکومت کو اس سامراج کا آلہ کار تصور کرتی ہے۔

۳۔ ڈی، ایم، کے، کے تقریباً تمام رہنما تامل اور انگریزی زبان کے بہترین مقرر ہیں۔

مذکورہ بالا باتوں سے علاقائی اور لسانی عصبیت کی بو آتی ہے، ہوسکتا ہے کہ اس عصبیت کی بنیاد ایسے تلخ حقائق پر ہو جنھیں شمالی ہندوستان کے لوگ سننا پسند نہ کریں، لیکن اگر یہ حقائق ہیں تو شمالی ہندوستان کو اپنا رویہ بدلنا ہوگا ورنہ ملک کی وحدت پارہ پارہ ہوکر رہ جائے گی، شمال و جنوب کے تعلقات کی ایک مستقل تاریخ ہے جو ہزاروں سال پر پھیلی ہوئی ہے، اُس تاریخ کو معروضی نقطۂ نظر سے سمجھنے کی اور پھر کوئی ایسا معقول طرز عمل اختیار کرنے کی ضرورت ہے جو جنوبی ہندوستان

(باقی صفحہ ۳۶۹ پر ملاحظہ ہو)

تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجے جائیں)

اقبال کے آخری دو سال

از ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی

سائز ۱۸×۲۲/۸ حجم ۶۷۹ صفحات۔ کاغذ اور کتابت و طباعت عمدہ۔ مجلد قیمت نو روپے
تاریخ طباعت، اپریل سنہ ۱۹۶۱ء۔

اس کتاب میں یہ دکھلایا گیا ہے کہ علامہ اقبال نے اپنی عمر کے آخری دو برسوں میں یعنی یکم مئی ۳۶ء سے
ے اپنے یوم وفات یعنی ۲۱ اپریل ۳۸ء تک مسلم لیگ اور قائد اعظم کی مدد اور حمایت میں پوری گرمجوشی اور
جہ...ت کے ساتھ کام کیا۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں جلیان والا باغ کے حادثۂ خونین (۱۹۱۹ء)
... ۱۹۳۵ء تک سیاسی حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے، دوسرے میں علامہ مرحوم کے ان سیاسی کارناموں کو
...سے بیان کیا ہے، جن سے مسلم لیگ کے مقاصد کو تقویت پہنچی۔ فاضل مصنف کے بیان کے مطابق ۲۸ء
... داخر میں علامہ اقبال مسٹر جناح سے سخت بیزار تھے۔ اس وقت انھوں نے فرمایا تھا کہ "مسلمانوں کی سیاست
جناح نے جو الجھن پیدا کر دی ہے جب تک وہ اس پر ندامت کا اظہار کر کے آئندہ اس سے کلیتہً مجتنب
... وعدہ نہ کریں گے مصالحت نہیں ہو سکتی"۔ (صفحہ ۳۰۹) مگر مئی ۳۶ء میں جب مسٹر جناح ڈاکٹر صاحب
...ت کدہ پر جا کر ان سے ملے ... تو ڈاکٹر صاحب نے امداد و اعانت کا وعدہ کر لیا"۔ غرض، اس کتاب
...ق، اس دن سے آخر عمر تک علامہ اقبال پوری سرگرمی سے مسلم لیگ کا کام کرتے رہے۔

اقبال اور حیدر آباد

از نظر حیدر آبادی

سائز ۱۸×۲۲/۸ حجم ۲۳۲ صفحات کاغذ اور کتابت و طباعت عمدہ مجلد قیمت پانچ روپے تاریخ طباعت اپریل ۱۹۶۱ء۔

اس کتاب میں علامہ اقبال کے حیدر آباد سے غیر معمولی تعلقات کو دکھلایا گیا ہے کہ کس طرح وہاں کے عوام اور خواص نے ان کی، مختلف مواقع پر، پذیرائی کی اور وہاں کے شاعروں اور نثر نگاروں نے کس خلوص اور عقیدت کے ساتھ خراج تحسین پیش کیا، نیز خود شاعر مشرق کی کتنی شدید خواہش اور آرزو تھی کہ وہ حیدر آباد میں مستقل قیام کریں۔ مگر، مصنف نے لکھا ہے کہ "باخبر اور ہوشمند انگریز جس کے ذرائع معلومات بہت وسیع اور پوشیدہ تھے اور جس نے حیدر آباد میں وقار الملک، محسن الملک، ظفر علی خاں، عبد الحلیم شرر اور آخر میں علی امام کو ٹکنے" نہ دیا تھا، وہ حیدر آباد میں اقبال جیسے "خطرہ" کو پروان چڑھتے نہیں دیکھ سکتا تھا، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ حضور نظام سے لے کر ایک عام حیدر آبادی کی خواہش اور تمنا کے باوجود اقبال حیدر آباد میں مستقل قیام نہ کر سکے۔"

اسرار و رموز پر ایک نظر
از پروفیسر محمد عثمان

سائز ۲۲×۱۸/۸ حجم ۱۸۹ صفحات۔ کاغذ اور کتابت و طباعت عمدہ۔ قیمت مجلد ساڑھے چار روپے

اس کتاب میں شاعر مشرق کی دو مشہور مثنویوں اسرار خودی اور رموز بیخودی پر بسط و تفصیل سے بحث و گفتگو کی گئی ہے اور علامہ اقبال نے ان دونوں مثنویوں میں مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے متعلق جو فلسفہ بیان کیا ہے، اس کی وضاحت کی گئی ہے۔ مصنف نے لکھا ہے کہ "ان عظیم مثنویوں کے مطالعے سے اقبال کے فکر و فن کی خوبیوں کا جو اندازہ مجھے ہوا ہے، اس کو ملک کے عام تعلیم یافتہ طبقے اور بالخصوص کالجوں کے طلبہ و طالبات تک پہنچاؤں اور انھیں اس لطف و فیض میں شریک کروں جو ان منظوم شاہکاروں کی بدولت مجھے حاصل ہوا۔"

INTRODUCTION TO THE THOUGHT OF IQBAL
مترجم: ملا عبد المجید ڈار

لوس کلاڈ میٹر کی فرانسیسی کتاب کا یہ انگریزی ترجمہ ہے۔ ۴۳ صفحے کی اس مختصر کتاب میں علامہ اقبال کے حالات زندگی اور ان کے کارنامے، ان کے فلسفۂ خودی اور ان کے انسان کامل پر روشنی ڈالی گئی ہے اور صالح معاشرے اور مشرق و مغرب کے بارے میں اقبال کے خیالات اختصار کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔

اوپر کی تینوں کتابیں اقبال اکیڈیمی، کراچی (پاکستان) نے شائع کی ہیں، اور اسی سے خریدی جا سکتی ہیں۔

حدیث اقبال
از طیب عثمانی ندوی

سائز $\frac{20 \times 30}{16}$، حجم ۱۶۰ صفحات۔ کاغذ اور کتابت وطباعت عمدہ قیمت مجلد تین روپے تاریخ طباعت ۱۹۶۱ء

ملنے کا پتہ: دار الکتاب، بیا گدام۔ گیا (بہار)

یہ کتاب دراصل متفرق مضامین کا مجموعہ ہے، جن میں سے بیشتر مختلف رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں اور چند نئے ہیں۔ ان مضامین میں شاعر مشرق کے افکار و خیالات کا تعلیمات اسلامی کی روشنی میں تجزیہ کیا گیا ہے اور خود مصنف کے الفاظ میں اس کتاب کا مدعا یہ ہے کہ اقبال جو کچھ اور جیسا کچھ بھی تھا اس کی صحیح تصویر کلام اقبال کے آئینہ میں سامنے آجائے"۔

اقبال پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور برابر لکھا جا رہا ہے، لیکن زیر تبصرہ کتاب کے مصنف کا خیال ہے کہ "روح اقبال" "اقبال کامل" اور ان جیسی ایک آدھ کتاب کے علاوہ باقی اکثر ادبیات اقبال" مصور کے موئے قلم کی خیالی تصویریں ہیں، حقیقت کم، پرچھائیں زیادہ"۔ لیکن یہ ایک ایسا الزام ہے جو اقبال کے ہر مضمون نگار اور تنقید نگار پر چسپاں کیا جا سکتا ہے، یہاں تک کہ زیر تبصرہ کتاب بھی غالباً اس سے نہ بچ سکے گی۔

بیان اللسان یعنی عربی اردو ڈکشنری
تالیف: مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی

سائز $\frac{20 \times 30}{16}$، حجم ۸۶۲ صفحات۔ کاغذ اور کتابت وطباعت عمدہ۔ قیمت مجلد دس روپے غیر مجلد نو روپے۔

طبع ششم ۱۹۶۱ء۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ علمیہ۔ قاضی واڑہ۔ میرٹھ (یو۔پی)

عربی سے اردو میں لغت بہت کم ہیں اور جب زیر تبصرہ لغت مرتب کیا گیا تھا، تو اس وقت شاید کوئی بھی نہیں تھا، اس لئے فاضل مرتب کی یہ کوشش قابل داد ہے۔ ترتیب دیتے وقت جناب قاضی صاحب کے پیش نظر جہاں یہ تھا کہ عربی ادب کے اساتذہ اور طلبہ کے لئے یہ لغت زیادہ سے زیادہ مفید ہو، وہاں وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ اس کی قیمت اتنی ہو کہ غریب طلبہ بھی خرید سکیں۔ اس لئے ضخامت کو مختصر رکھنے کی شعوری کوشش کی گئی ہے۔

شکست شب
از محسن بھوپالی

سائز $\frac{20 \times 30}{16}$، حجم ۱۱۲ صفحات۔ کاغذ اور کتابت وطباعت عمدہ مجلد مع رنگین گرد پوش قیمت دو روپے۔

ناشر: فن کدہ "مامن" ٹھنڈی سڑک۔ حیدرآباد (پاکستان)

محسن بھوپالی ایک نوجوان اور آزادیٔ وطن کے دور کے شاعر ہیں، ان کی شاعری داخلی احساسات و تاثرات سے زیادہ خارجی اثرات اور تقاضوں کی رہینِ منت ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ انھیں پاکستان میں کن حالات سے دوچار ہونا پڑا، مگر ان کے اس مختصر مجموعۂ کلام کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ وہاں کے سیاسی حالات اور اپنے ہم وطنوں کی بے مہری و بیوفائی کے بہت شاکی ہیں۔ مثلاً اس مجموعے کا آغاز اس قطعہ سے ہوتا ہے:

تلقینِ اعتماد وہ فرما رہے ہیں آج ، راہِ طلب میں خود جو کبھی معتبر نہ تھے
نیرنگیٔ سیاستِ دوراں تو دیکھئے منزل انھیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے

ایک نظم کے دو بند ملاحظہ ہوں:

ظلم آزاد ہے اور جبر پہ تعزیر نہیں
بھرا یاں جو اٹھے کوئی بھی شمشیر نہیں
ہیں ستم خوردہ بہت عدل کو زنجیر نہیں
قصرِ انصاف تو ہے کوئی جہانگیر نہیں
پھر بھی کہتے ہو لگی دل کی بجھاؤ تو سہی
نغمۂ حسنِ جہاں تاب سناؤ تو سہی

باغباں کی نگہہِ لطف و کرم بدلی ہے
غنچہ و گل کو تبسم کی سزا ملتی ہے
رہزنی بھیس میں رہبر کے پھرا کرتی ہے
دیکھتے ہو کہ قضا سر پہ کھڑی ہنستی ہے
زندگی نوحہ بلب گریہ کناں پھرتی ہے
اپنے پہلو میں لئے سوزِ نہاں پھرتی ہے

زمانے کی شکایت کے چند شعر پیشِ خدمت ہیں:

اب شناسا بھی ملا کرتے ہیں غیروں کی طرح یہ صلہ ہم کو ملا آپ کے ہوجانے سے

ذیل کے اشعار میں بیشتر مہاجروں کے احساسات و تاثرات کی ترجمانی کی گئی ہے:

بچ کے گرداب سے ڈوبے ہیں قریبِ ساحل کس قدر خام تھا اندازۂ طوفاں اپنا
کس سے کہئے کہ بہاروں نے ہمیں زخم دیے کون مانے گا نہ تھا اپنا گلستاں اپنا

شاداب گلستاں کے بھی سائے ہیں گریزاں اک جرم ہوئی میری غریب الوطنی بھی

کوائف جامعہ

ایک تاریخی اور علمی مقالہ

شعبۂ دینیات کے ناظم مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کی دعوت پر جناب صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب، رفیق دارالمصنفین اعظم گڑھ، جامعہ تشریف لائے اور حسب ذیل عنوان پر ایک پر مغز مقالہ پڑھ کر سنایا:

"سلاطین ہند اور علماء و مشائخ میں کشمکش اور اس کا اثر تاریخ ہند پر"

جلسے میں شیخ الجامعہ، اساتذہ اور طلبہ کے علاوہ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا احمد میاں، مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی، قاضی سجاد حسین، حکیم عبدالحمید (متولی ہمدرد وقف) اور دیگر معززین شہر نے شرکت کی۔

مقالہ اتنا دلچسپ، طرز تحریر اتنا دلکش اور مباحث اس قدر اہم تھے کہ طویل ہونے کے باوجود حاضرین جلسے نے بڑی توجہ اور شوق سے آخر تک سنا۔ مقالے کے بعد متعدد سوالات کئے گئے اور یہ سلسلہ بھی بڑی دیر تک قائم رہا۔ آخر میں صدر جلسہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے مقالہ نگار کا شکریہ ادا کیا۔ موصوف نے فرمایا کہ یہ مقالہ بہت دلچسپ اور فکر انگیز ہے۔ سوالات جس کثرت سے کئے گئے، اور بحث و گفتگو میں جس ذوق و شوق سے شرکت کی گئی، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مقالے کے مباحث دلچسپ اور اہم تھے۔" ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ "تاریخ قوموں کا حافظہ ہے۔ حافظہ قوی ہو یا ضعیف ہر حالت میں کام کرتا ہے، لیکن اگر خلاق یا مصلحت اندیش ہو تو اس سے بہت سی مضرتیں پیدا ہوتی ہیں۔ تاریخ پر اگر تنقیدی نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے حافظے نے مصلحت اندیشی سے بھی کام لیا ہے، ایسی صورت میں یہ دعویٰ کرنا مشکل ہے کہ حقیقت کا دامن کبھی نہیں چھوڑا ہے۔ ہمارے مورخین گذشتہ نسلوں کے کمالات کو نمایاں کرکے دکھلاتے ہیں اور ان کی کوتاہیوں پر پردہ ڈالتے ہیں۔ یہ مسلم ہے کہ اگر مریض کی ہسٹری طبیب کو بے کم و کاست نہ بتائی جائے

تو طبیب علاج نہیں کر سکتا۔ ہماری قوم اخلاقی لحاظ سے مریض ہے اور ہماری عقل اور ضمیر طبیب مسیحا مورخ وہی ہے جو طبیب کو مریض کا اگلا پچھلا حال سچ سچ بتادے۔ خوشی کی بات ہے کہ مقالہ نگار نے مصلحت پرستی سے کام نہیں لیا، بلکہ حق گوئی کا حق ادا کیا ہے۔"

اس مقالے کے دو حصے ہیں، ایک علمائے اسلام سے تعلق رکھتا ہے، دوسرا صوفیائے کرام کا۔ پہلا حصہ معارف میں قسط وار شائع ہوگا اور دوسرے حصے کے اہم مباحث رسالہ جامعہ کی اگلی اشاعت میں شائع ہوں گے۔

اُردو زبان کے آغاز و ارتقاء پر ایک تقریر

پچھلی اشاعت میں ہم اطلاع دے چکے ہیں کہ طلبائے استادوں کے مدرسہ کی لٹریری سوسائٹی کے ماتحت ہندوستان کی اہم زبانوں کے ادب پر تقریروں کا ایک سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ اردو ادب پر دو تقریروں کا خلاصہ اس سے قبل شائع ہو چکا ہے۔ تیسری تقریر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ریڈر شعبہ اُردو دہلی یونیورسٹی کی تھی، جس کا عنوان تھا "اُردو زبان کا آغاز اور ارتقاء"۔ موصوف کی طویل تقریر کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

" یہ بات بڑی مسرت افزا ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے ہندی اور اُردو کے علاوہ دوسری ہندوستانی زبانوں پر بھی تقریروں کا آغاز کیا ہے۔ اس سے جذباتی ہم آہنگی اور قومی یک جہتی کے کام میں مدد ملے گی۔ یوں بھی ملکی اور قومی خدمت میں جامعہ ملیہ اسلامیہ ہندوستان کے دوسرے تعلیمی اداروں سے آگے ہے لیکن اس کام میں تو پہل کرنے کا شرف یقیناً اسے حاصل ہے۔ اس کا ایک فوری خوشگوار اثر یہ ہوا ہے کہ دہلی یونیورسٹی نے بھی جدید ہندوستانی زبانوں پر توسیعی لکچروں کا پروگرام بنایا ہے جو مارچ کے پہلے ہفتے سے شروع کیا جا رہا ہے۔

اردو زبان کے آغاز پر روشنی ڈالتے ہوئے نارنگ صاحب نے فرمایا اُردو میں ابھی لسانیات کا علم بہت محدود ہے۔ اُردو کی پیدائش سے متعلق سنجیدہ اظہار خیال کا سلسلہ محمد حسین آزاد کی آب حیات سے شروع ہوا تھا، جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ اُردو برج بھاشا سے نکلی ہے۔ تقریباً نصف صدی تک اس نظریے کی دھوم رہی۔ اس کی تردید بیسویں صدی کی تیسری دہائی

میں پروفیسر محمود شیرانی نے "پنجاب میں اردو" لکھ کر کی اور یہ ثابت کرنا چاہا کہ اردو زبان پنجابی سے نکلی ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اس کے دو برس بعد "ہندوستانی لسانیات" میں بھی بنیادی طور پر اسی نظریے کی تائید کی۔ اس وقت سے پروفیسر جولیس بلاک، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، پروفیسر احتشام حسین اور ڈاکٹر شوکت سبزواری اس موضوع پر اظہارِ خیال کر چکے ہیں۔ جولیس بلاک نے اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے ہریانی کی اہمیت پر زور دیا تھا۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے ہریانی اور کھڑی کو اردو کا ماخذ قرار دیا ہے۔ ان اسّی برسوں میں اس موضوع پر جو کام ہوا ہے اس سے کچھ گتھیاں تو ضرور سلجھ گئیں ہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ اردو کی پیدائش کا مسئلہ ابھی پورے طور پر حل نہیں ہوا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے محققین اپنے نظریوں کا شکار ہو کے رہ گئے ہیں اور اس پیچیدہ مسئلے پر معروضی نظر نہیں ڈال سکے۔ اگر اردو کے آغاز پر اس کے تاریخی اور سماجی پس منظر کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو صحیح نتائج اخذ کرنے میں زیادہ دقت نہیں ہوگی۔

موصوف نے کہا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کا پہلا باقاعدہ سابقہ گیارہویں صدی عیسوی میں پنجاب میں ہوا اور یہ تقریباً ڈیڑھ صدی تک جاری رہا۔ ہندوستان کی لسانیاتی تاریخ میں یہ زمانہ اپ بھرنشوں کا ہے۔ ڈیڑھ صدی کے طویل عرصے میں مقامی اپ بھرنش پر نو وارد زبان کے اثر سے یقیناً نئی ملی جلی زبان بننا شروع ہو گئی ہوگی جس میں محمد عوفی کی روایت کے مطابق لاہور کے مشہور شاعر مسعود سعد سلمان نے بھی اشعار کہے لیکن سرزمینِ پنجاب میں اختلاط کا یہ عمل زیادہ دیر جاری نہ رہا اور بارہویں صدی کے ربع آخر میں محمد غوری کے حملوں کے بعد پایۂ تخت دہلی قرار پایا۔ اس طرح وہ ناپختہ زبان جو پنجابیت کا اثر لئے ہوئے تھی، دہلی کی بولیوں سے متاثر ہونا شروع ہوئی، لیکن ابھی سو، سوا سو سال ہی گزرے تھے کہ محمد تغلق نے دہلی کی آبادی کو دولت آباد پہنچنے کا حکم دیا۔ اس طرح وہ نئی زبان دہلی کے باشندوں کے ساتھ دکن پہنچی جہاں اس کا ادبی ارتقا شروع ہوا۔ امیر خسرو کا انتقال اس سے پہلے ہو چکا تھا۔ ان کے وہ "ہندوی" اشعار جو ہم تک پہنچے ہیں، اپنی موجودہ شکل میں مشتبہ سہی لیکن امیر خسرو کے اپنے بیان کے مطابق انھوں نے اس ملی جلی نئی زبان میں کلام کہا تھا۔ بعض محققین اس بات پر زور دیتے ہیں کہ نئی زبان پنجاب کے زمانۂ قیام

میں نہیں بلکہ دہلی کے زمانے میں پیدا ہوئی۔ وہ لوگ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ پنجاب میں اختلاط اشتراک کا عمل ڈیڑھ سو برس جاری رہا جبکہ دہلی میں محمد غوری کے بعد سے امیر خسرو تک تہذیبی سلیقے کا زمانہ مشکل سے سوا سو سال کا ہے۔ اگر نئی زبان کی تشکیل کا عمل ڈیڑھ سو برس میں شروع نہیں ہوا تو سوا سو برس میں بھی نہیں ہو سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ ملی جلی زبان کی داغ بیل سرزمین پنجاب میں گیارہویں صدی ہی میں پڑ گئی تھی اور دہلی آنے کے بعد چودھویں صدی کے آغاز میں وہ بول چال کی اس سطح تک پہنچ گئی کہ صوفیا کے علاوہ دوسرے مصنفین بھی اسے منہ لگانے لگے۔ دکن میں بہمنی، قطب شاہی اور عادل شاہیوں کے زمانے میں اس کا ادبی سفر جاری رہا، جبکہ شمالی ہندوستان میں فارسی چھائی ہوئی تھی اور اس کے مقابلے میں سر اٹھانا آسان نہ تھا۔ چنانچہ اس زمانے میں یہ نوزائیدہ زبان صوفیا اور بھگتوں کے سہارے عوامی زبان کی حیثیت سے آگے بڑھتی رہی۔ اکبر کے زمانے میں پایۂ تخت آگرہ قرار پایا تو اس زبان نے جو اب تک پنجاب میں قدیم پنجابی اور لہندا اور دہلی میں ہریانی اور کھڑی کے اثرات قبول کر چکی تھی، آگرہ جا کر برج بھاشا سے بھی متاثر ہونے لگی۔ برج اس زمانے میں کرشن بھگتی تحریکوں کی وجہ سے خاصی مقبول تھی اور اسے ادبی وقار بھی حاصل تھا۔ لیکن شاہجہاں نے جب دوبارہ دہلی کو بسایا تو ایک بار پھر اس زبان کا ارتقا دہلی کی بولیوں کے اثر میں شروع ہوا۔ اب کی کھڑی بولی سب پر غالب آئی اور وہ زبان جس نے اٹھارہویں صدی کے آغاز میں "اردوئے معلیٰ" کا خطاب حاصل کیا اسی کھڑی بولی کی بنیادوں پر قائم ہے۔ غرض اردو زبان کا یہ ارتقائی سفر سات صدیوں تک جاری رہا۔ اردو پنجابی سے نکلی ہے نہ ہریانی سے، وہ نہ برج سے ماخوذ ہے اور نہ صرف کھڑی سے، بلکہ اس نے ان سب بولیوں سے اثر قبول کیا ہے۔ اردو کے قدیم نمونوں میں ان سب کی جھلک ملتی ہے اور اس کی تشکیل میں ان سب نے جو حصہ لیا ہے۔ اس سے انکار کرنا یا کسی ایک کو لے کر دوسری بولیوں کے اثرات کو نظر انداز کرنا صداقت کو ہاتھ سے دینا ہوگا۔ غرض ابتدائی اردو نے پنجابی لہندا، ہریانی، برج سب سے مدد لی ہے اور اس کا جدید ادبی روپ کھڑی سے تعلق رکھتا ہے۔

مطبوعہ یونین پرنٹنگ پریس دہلی ۶

صرف ٹائیٹل دیال پریس دہلی ۶ میں چھپا۔

P. O. Jamia Nagar, New Delhi-25

جامعہ

جامعہ ملّیہ اسلامیہ، دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ
چھ روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس نئے پیسے

جلد ۴۶	بابت ماہ مئی ۱۹۶۲ء	شمارہ ۷

فہرست مضامین

خط وکتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی

غزل کا مستقبل

ڈاکٹر سید عابد حسین

غزل کا مستقبل ایسا بے ڈھب موضوع ہے جس پر قلم اٹھاتے یا زبان کھولتے ڈر لگتا ہے۔ آنے والے زمانے میں ہونی یا ان ہونی چیزوں کے بارے میں کچھ کہنا ایک طرح کی پیش گوئی ہے۔ اور پیش گوئی خاصا جان جوکھم کا کام ہے۔ ابھی تھوڑے دن پہلے ۳ فروری کو قیامت کی پیش گوئی کرنے والوں کا جو حشر ہوا وہ آپ نے بھگتا نہیں تو دیکھا ضرور ہوگا۔ مگر ایک بات ہے کسی خاص واقعے کی ایک سیدھی ٹکی اور وہ بھی بہت قریب کی تاریخ بتلانے میں جتنا خطرہ ہے اتنا ایک غیر معین مستقبل کی طرف مبہم سا اشارہ کر دینے میں نہیں ہے۔ اس لئے ہم یہ کیوں نہ کریں کہ غزل کے کچھ دن پہلے گزرے ہوئے ماضی کی روشنی میں اس کے مستقبل کا کچھ اندازہ لگائیں اور پھر اس کے بارے میں اس انداز سے سنبھل سنبھل کر دو چار باتیں کہہ ڈالیں کہ قیامت کا ڈھنڈھورا پیٹنے والوں کی طرح آسانی سے پکڑے نہ جائیں۔

آپ نے دیکھا یا کم سے کم سنا ہوگا کہ اب سے چوتھائی صدی پہلے اردو سنسار میں پچھم کی طرف سے ترقی پسندی کی آندھی بڑے زور شور سے اٹھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان تند و تیز ہواؤں میں شعر و ادب کی پرانی رسمیں اور روایتیں سوکھی پتیوں کی طرح اڑ جائیں گی۔ سب سے زیادہ اندیشہ غزل کی طرف سے تھا۔ اس لئے کہ آندھی کا رخ خاص طور پر اسی طرف تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ نازوں کا پالا نرم و نازک پودا ان زبردست جھکڑوں کی تاب کیوں کر لائے گا۔ مگر ہوا کیا؟ شعر و ادب کے بڑے بڑے تنومند درخت مثلاً داستان، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، وغیرہ یا تو جڑ سے اکھڑ گئے یا ان کی جڑیں بری طرح ہل کر رہ گئیں اور غزل کا یہ فتنہ قد پودا طوفان ہوا کے تھپیڑے کے ساتھ مڑتا، جھولتا، جھکتا، لچکتا رہا مگر اکھڑنے کا کیا ذکر ہے ایسا لگتا ہے جیسے کچھ اور زیادہ جم گیا ہے۔ اس پر

ان لوگوں کو جو غزل کی ماہیت سے اور اس کے مزاج سے اچھی طرح واقف نہیں اچنبھا ہو تو ہو ان لوگوں کو کوئی تعجب نہیں ہوا جو یہ جانتے ہیں کہ موسیقی اور مصوری کے سانچے میں ڈھلا ہوا شعر انسانی فطرت کے بنیادی سروں سے ہم آہنگ ہے۔ اس لئے اس پر کبھی زوال نہیں آسکتا۔

آیئے ذرا ہم بھی سوچیں کہ موسیقی اور مصوری کے سانچے میں ڈھلنے کے کیا معنی ہیں اور انسانی فطرت کے بنیادی سروں سے ہم آہنگ ہونا کسے کہتے ہیں پھر شاید ہمیں اس کی کچھ اٹکل ہو سکے کہ غزل کا جادو آج کی طرح کل بھی سر پر چڑھ کر بولے گا یا نہیں۔

غزل دراصل غنائی شاعری کی جس کا نام یونانیوں نے (LYRIC) لرک رکھا تھا وہ قسم ہے جو پہلے عربی شاعری میں پھر فارسی اور اردو شاعری میں پروان چڑھی۔ مگر اس میں اور دوسری قسموں میں جنھوں نے اور زبانوں میں نشو ونما پائی۔ بڑا فرق یہ ہے کہ وہاں گیت سانیٹ بلیڈ وغیرہ میں اصل چیز موسیقی ہے شعر صرف موسیقی کی برقی رو کے لئے تار کا کام دیتا ہے۔ اور غزل میں اصل چیز احساسات وجذبات کی لفظوں میں کھینچی ہوئی تصویر ہے۔ جس کا کیف شراب کی طرح تصور کو سرشار کر دیتا ہے۔ موسیقی محض وہ ظرف ہے جس میں یہ شراب لنڈھائی جاتی ہے۔ غزل اور غنائی شاعری کی دوسری قسموں میں ماہیت اور مزاج کا جو فرق ہے اس کی وجہ سے آہنگ، طرزِ ادا موضوع اور زبان میں بھی فرق پیدا ہو گیا ہے۔ غنائی شاعری کے لئے عام طور پر وزن ایسے اختیار کئے گئے ہیں کہ آواز کی لے بہتی چلی جائے کہیں رکاوٹ نہ پڑے اسے ادا کرنے کے لئے سرگم کے سُر چنے گئے ہیں جن کے ہیر پھیر، اتار چڑھاؤ سے الگ الگ چیزوں کے لئے الگ الگ دُھنیں بنی ہیں جن میں مختلف نغمے گائے جاتے ہیں۔ لفظوں کے انتخاب میں خاص طور پر ان کے صوتی اثر کا خیال رکھا جاتا ہے مفہوم یا تصور کی حیثیت محض ضمنی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے لفظ جو نغمے کے دھارے میں آب رواں کی طرح بہ سکیں۔ ہر زبان میں کم ہوتے ہیں۔ اس لئے گیت سانیٹ وغیرہ کی زبان بہت محدود ہو کر رہ گئی ہے اور قدرتی طور پر ان کا موضوع بھی بہت محدود ہو گیا ہے۔ صرف چند سیدھی سادی جذباتی کیفیتیں

ان میں ادا کی جاسکتی ہیں۔ اب غزل کی طرف آیئے۔ یہاں چونکہ شعر صرف موسیقی کا نہیں بلکہ صورت آفرینی کا بھی کام لیتا ہے یعنی جذبات و معاملات کا جیتا جاگتا مرقع کھینچتا ہے اس لئے وہ ایسا وزن یا ایسی بحر چاہتا ہے جس میں موسیقی ضرور ہو مگر اتنی نہیں کہ اس کی دھن میں لفظ پوری طرح سمجھ میں نہ آئیں اور تصورات کا جو نقش ان سے بنانا ہے وہ سننے والے کے ذہن کے پردے پر نہ بن سکے۔ غزل گانے کے لئے نہیں بلکہ صحت اور وضاحت سے ہلکے سے ترنم کے ساتھ پڑھنے کے لئے ہے۔ چنانچہ صدیوں کی محنت اور تلاش کے بعد اس کے لئے بحریں ڈھونڈھی گئی ہیں۔ جن کا وزن غنائی شاعری کی اور قسموں کے وزن سے الگ ہے زبان غزل کی بھی محدود ہے لیکن ان کی حدیں دوسری ہیں۔ غزل کے لئے ایسے لفظ چُنے گئے ہیں جو کانوں کو بھی بھلے معلوم ہوں اور آنکھوں کے آگے کسی کیفیت یا حالت کا سماں بھی باندھ دیں۔ موضوع یہاں بھی محدود ہیں۔ یعنی جذبات کی کیفیتیں اور دل کے معاملات لیکن غزل کے پاس صرف مغنّی کی آواز ہی نہیں بلکہ مصوّر کا موقلم بھی ہے اس لئے وہ جذبہ و احساس کی باریکیوں اور نیرنگیوں کو دل کے معاملات کی الجھنوں اور پیچیدگیوں کو بھی دکھا سکتی ہے۔

اگر غزل کا یہ مفہوم آپ کے دل کو لگتا ہے تو پھر شاید آپ کو اس بات کے ماننے میں کوئی تامل نہ ہو کہ غزل انسانی فطرت کے بنیادی سروں سے ہم آہنگ ہے۔ سریلی آوازوں اور خوشنما شکلوں سے لطف اٹھانا انسان کے خمیر میں ہے اس لئے شاعری اور شاعری میں خاص طور پر غزل جس میں لحن اور تصوّر، اس طرح گھل مل جاتے ہیں کہ دونوں کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے قدرتی طور پر قلب انسانی کے تاروں کو چھیڑتی ہے اور اس کا اثر اس سے زیادہ بھرپور ہوتا ہے جتنا موسیقی اور مصوّری کا الگ الگ ہوا کرتا ہے۔

اب اس سوال کا جواب کہ غزل کا مستقبل کیا ہے خود بخود مل جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جب تک انسانی فطرت کے ساز میں ذوقِ نغمہ اور ذوقِ تصور کو بنیادی سُروں کی حیثیت حاصل ہے اور جب تک غزل کے سُر بہ یک وقت ان دونوں کے ساتھ میل کھاتے ہیں لوگ ہمیشہ غزل کے شعروں کو اسی ذوق شوق سے سنتے اور سر دُھنتے رہیں گے۔

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید غزل کو آنے والے زمانے میں زندہ رہنے کے لئے اپنے موجودہ رنگ و آہنگ کو ایک حد تک بدلنا پڑے گا۔ اس وقت اردو غزل میں دو رجحانات ایسے نظر آرہے ہیں جن سے شاید عارضی طور پر اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوا ہے لیکن آگے چل کر اس کے لئے مضر ثابت ہو سکتے ہیں۔ بعض حضرات غزل پر فلسفے کا رنگ چڑھانا چاہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ شعر اگر فکر سے خالی ہو تو فن کی ترازو میں اس کا کوئی وزن نہیں۔ مگر وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ فکر جب تک سرد اور بے شکل ہے۔ شعر ہرگز نہیں ہے۔ وہ شعر اس وقت بنتی ہے جب احساس کی گرمی سے پگھل کر تصور کے سانچے میں ڈھل جائے۔ جیسا اقبال نے کہا ہے۔

شعر گر سوزے نہ دارد حکمت است   شعر می گردد چو سوز از دل گرفت

آج ہم اُس دَور سے گزر رہے ہیں جب ہمارے اندر علمی ذوق نیا نیا اُبھرنا شروع ہوا ہے مگر ابھی تک ادبی ذوق میں اس طرح الجھا ہوا ہے کہ الگ کرنا مشکل ہے۔ آگے چل کر جب دونوں الگ الگ ہو جائیں گے تو راز دہر کے ڈھونڈھنے والے فلسفیانہ شعر کی راکھ کریدنے کے بجائے فلسفے اور سائنس کی زرخیز خاک چھانیں گے۔ اس لئے اگر ہماری غزل فلسفہ چھانٹتی رہی تو اس کا بازار سرد ہو کر رہ جائے گا۔ اسی طرح ایک دوسرا رجحان یہ ہے کہ غزل خالص موسیقی بن جائے یعنی اس کے لئے لفظوں کا انتخاب مفہوم یا تصور کے لحاظ سے نہیں، بلکہ اس خیال سے کیا جائے کہ سُر تال میں ٹھیک بیٹھ جائیں اور بجتی ہوئی آواز میں ادا کئے جا سکیں۔ اس طرح کی غزل بھی آج کل ان حلقوں میں مقبول ہے جہاں ذوق موسیقی اور ذوق ادب کی حدیں ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوتی ہیں۔ جب ان دونوں میں تفریق ہو جائے گی تو لوگ گیت کا روپ دھارنے والی غزلوں کو گیت کی کسوٹی پر کسیں گے۔ اور مغنی شاعروں کو فن کار گانے والوں کے معیار پر پرکھیں گے اگر پورے اُترے تو دونوں کو کھرا ورنہ کھوٹا ٹھہرائیں گے۔ لیکن بہرحال ایسی غزل کو غزل اور ایسے شاعر کو شاعر کوئی نہیں کہے گا۔

یہ اندیشے تو ہیں مگر اردو غزل کی پوری تاریخ پر نظر ڈالنے سے یہ خیال ہوتا ہے کہ جب غزل سیدھے راستے سے ہٹنے لگے گی تو کوئی میر، کوئی غالب، کوئی مومن کوئی حسرت کوئی جگر پیدا ہو کر اسے راہ پر لگا دے گا اور وہ پھر ہمارے سازِ دل کے لئے مضراب کا، ہماری چشم تصور کے لئے سرمے کا کام دینے لگی۔ (بہ شکریہ آل ہند ریڈیو)

ہندوستان کے سلاطین علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر

(۱)

جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن

[ذیل کا مضمون اس طویل مقالہ کا آخری حصہ ہے جسے سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب رفیق دار المصنفین، نے جامعہ میں پڑھا تھا۔ پہلا حصہ موقر نامہ 'معارف' میں بالاقساط شائع ہو رہا ہے۔

سلاطین اور صوفیہ کرام

سلاطین صوفیہ کرام کے آستانہ پر برابر جھکتے رہے، مشہور ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی ہی کی دعوت پر شہاب الدین غوری ہندوستان آیا۔ ایلتمش حضرت قطب الدین بختیار کاکی کا مرید تھا۔ اور رات کو ان کے پانوں بھی داتبا تھا، حضرت جلال الدین تبریزی دہلی تشریف لائے۔ تو اس نے خدم حشم کے ساتھ دہلی سے باہر جاکر ان کا استقبال کیا، قاضی قطب الدین کاشانی اس کے دربار میں آئے تو ان کو اپنے پہلو میں بٹھایا، اسی طرح دربار میں قاضی حمید الدین ناگوری کا خیر مقدم تخت سے اتر کر کیا، اور ایک موقع پر ان کے قدموں پر بھی گر پڑا، بلبن اپنی شاہانہ شوکت و عظمت کے باوجود مشائخ کی بے حد تعظیم کرتا تھا، اور حصول برکت کے لئے ان کے گھروں پر بے تکلف جاتا۔ وہ شیخ علی چشت کا بڑا گرویدہ تھا، ان کو لینے کے لئے چشت سے کچھ لوگ آئے، تو ان کے قدموں پر گر کر ان کو چشت جانے سے روکا جلال الدین خلجی حضرت بو علی قلندر پانی پتی کا مرید تھا۔ علاء الدین خلجی بعض اسباب کی بنا پر خواجہ نظام الدین اولیاء سے مل تو نہ سکا، لیکن اس نے اپنے دونوں لڑکوں خضر خاں اور شادی خاں کو ان کے حلقہ ارادت میں دے دیا، اور جب حضرت خواجہ کی مجلس سماع کے اشعار اس کے سامنے دہرائے جاتے تو وہ ان کو آنکھوں سے لگاتا، اور

بار بار پڑھتا، قطب الدین مبارک خلجی سہروردیہ سلسلہ کے ایک بزرگ ضیاء الدین رومی کا مُرید تھا، سلطان محمد تغلق حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر کے پوتے حضرت شیخ علاء الدین کا مرید تھا۔ اس نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے جنازے کو کاندھا دیا، ان کے روضہ مبارک کی عمارت اسی نے بنوائی۔ حضرت شرف الدین یحییٰ منیری اور حضرت شیخ رکن الدین ملتانی کی خانقاہیں بھی اسی نے تعمیر کرائیں، سلطان فیروز شاہ تغلق مشائخ کی تعظیم و تکریم میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتا تھا حضرت جلال الدین بخاری جہانیاں جہاں گشت اس کے دربار میں تشریف لاتے تو دونوں تخت پر ساتھ بیٹھتے، سلطان سکندر لودی حضرت سماء الدین کا مرید تھا، بابر حضرت عبدالقدوس گنگوہی کے آستانہ پر خود حاضر ہوا تھا، اور حضرت گنگوہی نے بھی اپنے ایک مکتوب کے ذریعے اس کو نصیحت کی کہ وہ عدل قائم کرے، اوامر نواہی کی پابندی کرائے، نماز با جماعت کا پابند رہے، اور علماء کو دوست بنائے، ہمایوں حضرت غوث گوالیاری کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گیا تھا۔ اکبر کو شیخ سلیم چشتی سے جو محبت و عقیدت رہی وہ اس کی زندگی کا اہم جزو ہے، اور ان ہی کی خاطر اس نے فتح پور سیکری کو تمام شہروں کا سرتاج بنا دیا، اس کو جب کبھی ملکی اور فوجی کاموں سے فرصت مل جاتی، تو حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے آستانہ پر حاضر ہوتا میدان جنگ میں حضرت خواجہ سے حصول برکت کے لئے یا معین کا نعرہ بھی لگاتا، شہزادہ سلیم کی پیدائش کی خوشی میں ان کے مزار پر حاضری دینے کے لئے آگرہ سے اجمیر تک پا پیادہ گیا، جہانگیر تو حضرت شیخ سلیم کے سایۂ عاطفت ہی میں پلا، اس لئے بزرگوں، درویشوں حتی کہ سنیاسیوں سے بھی بجد عقیدت رکھتا تھا، کچھ دنوں اس کو حضرت مجدد سے اختلاف ضرور رہا، لیکن جب اس کی غلط فہمی دور ہوئی تو وہ حضرت مجدد کا بہت گرویدہ ہو گیا۔ ایک مشہور روایت ہے کہ وہ کہا کرتا تھا، کہ میرے پاس ایک دستاویز نجات ہے، اور وہ حضرت مجدد کا ارشاد مبارک ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھ کو جنت میں لے جائے گا تو تیرے بغیر نہ جاؤں گا۔ شاہجہاں بچپن ہی میں حضرت مجدد کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گیا تھا۔ عالمگیر نے سلوک و طریقت کی تعلیم حضرت مجدد کے صاحبزادے حضرت محمد معصوم سے پائی۔ اور اس تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں کہ وہ تمام مشائخ سے کس قدر والہانہ لگاؤ رکھتا تھا، آخری دور میں شاہ عالم کو حضرت شاہ فخر الدین دہلوی سے بڑی عقیدت

رہی، شاہی خاندان کے افراد ان ہی کے حلقۂ ارادت میں تھے، بہادر شاہ ظفر بھی ان ہی کا مرید تھا، اور جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے صاحبزادے مولانا قطب الدین سے بیعت کی، اور جب ان کا وصال ہوا تو ان سے خورد سال صاحب زادے غلام نصیر الدین عرف کالے صاحب سے وہی عقیدت قائم رکھی۔

یہ پیری مریدی محض رسمی اور روایتی نہیں رہی۔ ایلتمش، بلبن، محمد تغلق، فیروز شاہ اور اورنگ زیب کے مذہبی خیالات وجذبات کے نشو ونما میں ان بزرگوں کے فیوض وبرکات کا بڑا دخل رہا، اور جب بعض سلاطین علماء کی سخت گیریوں سے گھبرا جاتے تھے، تو صوفیائے کرام کے روحانی دامن میں ان کو پناہ ملتی تھی، وہ ظواہر کی پابندی میں سختی کرنے کے بجائے ان میں اسلام کی اخلاقی اور باطنی روح پیدا کرنے کی کوشش کرتے، اس سے شریعت کی گرفت تھوڑی ڈھیلی ضرور ہو جاتی لیکن اسلام کے باطنی مزاج کا استیلاء ان پر قائم رہتا، جس سے غیر شعوری طور پر حکومت و سلطنت کو فائدہ پہنچتا۔ ایلتمش جیسے دیندار بادشاہ کے دربار میں مولانا سید نور الدین مبارک غزنوی نے یہ وعظ کہنے میں تامل نہیں کیا کہ بادشاہوں کی زندگی کے جو لوازم ہیں، جس طریقہ سے وہ کھاتے ہیں، جو کپڑے پہنتے ہیں، جس طرح وہ اٹھتے بیٹھتے ہیں، اور سواری کرتے ہیں، وغیرہ وغیرہ وہ تمام چیزیں دین مصطفےٰ کے خلاف ہیں، لیکن حضرت بختیار کاکی اپنے مرید سلطان ایلتمش کو شاہانہ شوکت وحشمت کو ترک کرنے کی تلقین کے بجائے اس کو خدا ترسی، پارسائی، تزکیہ نفس، غم خواری دین اور خدمت خلق کی تعلیم دیتے رہے۔ سلطان غیاث الدین بلبن کے دربار کی نمائش، اور فر کیخسروی کو علماء رسوم جبابرہ کہتے رہے۔ وہ دربار کی ظاہری نمود ونمائش میں عجمی فرمانرواؤں کی تقلید کرتا تھا، جس کا رنگ مشرکانہ تھا، لیکن وہ اپنے عہد کے اکابر بزرگان دین سے فیوض وبرکات حاصل کرتا رہا، اس کی درباری زندگی خواہ کیسی ہی رہی ہو، لیکن اس کو حمیت اسلام اور شعائر اسلام کا بڑا خیال رہا اس لئے اس کے مرنے کے بعد حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء اور دوسرے بزرگ جب بلبن کا نام لیتے تو اس کے نام کے ساتھ رحمۃ اللہ علیہ، طاب ثراہ اور انار اللہ برہانہ بھی کہتے، خواجہ نظام الدین اولیاء نے اپنی مجلس میں اس کے دربار کے بعض مشرکانہ رسوم کے باوجود

اس کے مذہبی عقائد کی تعریف کی ہے۔

حضرت سید جلال الدین بخاری مخدوم جہانیاں جہاں گشت اپنے ملفوظات میں فرماتے ہیں کہ ہندوستان میں شب برات میں جو تقریبات منائی جاتی ہیں، وہ غزنین، خراسان اور عرب میں دیکھنے میں نہیں آتیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کا کوئی تعلق مسلمانوں سے نہیں ہے، بلکہ ہندوستان کے عوام سے ہے جو دین سے بے خبر ہیں، اور وہ اس رات کو غیر شرعی چیزوں میں مشغول رہ کر اپنے اعمال کو سیاہ کرتے ہیں، وہ فیروز شاہ تغلق سے بھی ملتے رہے، جس نے ان سے مذہبی اور روحانی فیوض حاصل کیے، لیکن اس کے دربار میں شب برات کی تقریب بہت دھوم دھام سے منائی جاتی، بے شمار مشعلیں روشن کی جاتیں طبل بجتے، آتشبازی کے طرح طرح کے تماشے ہوتے، مگر حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت سلطان کی اس شاہانہ تقریب کے ختم کر دینے پر مصر نہیں ہوئے۔

بعض سلاطین اور صوفیہ کرام میں کچھ کشمکش ضرور رہی، لیکن اس کی تاریخ بہت زیادہ طویل نہیں، پہلی مثال سلطان جلال الدین خلجی اور سیدی مولہ کی ملتی ہے، ان کی خانقاہ میں بڑی مقدار میں کھانا پکتا تھا، اور کھانا ایسا ہوتا تھا، کہ اس زمانے کے امرار کو بھی میسر نہ تھا، روزانہ ہزاروں من میدہ خرچ ہوتا تھا، پانچ سو جانور ذبح کیے جاتے تھے، دو تین سو من شکر صرف ہوتی تھی، اور لوگوں کو یہ پتہ نہ چلتا کہ یہ سب کہاں سے آتا ہے، امرار کی آمد و رفت بڑھ گئی تھی، یہاں تک کہ جلال الدین خلجی کو خبر دی گئی کہ یہ خانقاہ سازشوں کا مرکز بن گئی ہے، اس نے اشتعال میں آکر ان کو ہاتھی کے پاؤں سے سلوا ڈالا، ضیاء الدین برنی نے لکھا ہے کہ ایسے حلیم اور بردبار بادشاہ نے ایسا حکم صادر کیا، جس سے درویشی کی عزت جاتی رہی، لیکن جس روز سیدی مولہ کا قتل ہوا، اس روز اتنی زبردست آندھی آئی کہ معلوم ہوتا تھا کہ قیامت آگئی ہے، جلال الدین خلجی نے اس کے بعد محسوس کیا کہ اس سے ایک غلط کام ہو گیا ہے۔

قطب الدین مبارک خلجی کو برابر اصرار رہا کہ حضرت خواجہ نظام الدین اس کے دربار میں حاضری دیں، لیکن حضرت خواجہ اس کے لیے تیار نہیں ہوئے، سلطان نے ایک دن مقرر بھی کیا، کہ اگر اس روز تک وہ نہ پہنچے تو پھر وہ ذلت دے سے کام لے گا لیکن اس روز محل کے اندر شورش ہوئی، اور خسرو خاں

کے ہاتھوں سلطان قطب الدین کا قتل ہوگیا۔ سلطان غیاث الدین تغلق تخت نشین ہوا تو بعض علما نے اس سے حضرت خواجہ کے خلاف سماع کی ممانعت کا ایک عام شاہی حکم جاری کرا دیا، جس کی بنا پر حضرت خواجہ سے اختلاف پیدا ہوا اور یہ روایت عام طور سے مشہور ہے، کہ جب غیاث الدین تغلق بنگالہ کی مہم سے واپس آرہا تھا تو اس نے محبوب الٰہی کے پاس پیام بھیجا، کہ وہ شہر سے باہر نکل کر اس کا استقبال کریں، لیکن انھوں نے کہلا بھیجا کہ

" ہنوز دلی دور است "

اور اس کے بعد وہ خیمہ گر جانے سے دب کر ہلاک ہوگیا، تذکرہ نویسوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ سلطان محمد تغلق کو حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی اور حضرت فخر الدین زرادی سے اختلاف رہا، اور ان کو ایذائیں پہنچائیں، عام طور سے تذکرہ نگار جب بوریہ نشینوں کے تعلقات کا ذکر کرتے ہیں تو کچھ نہ کچھ ایسی باتیں تخت نشینوں کے متعلق ضرور قلم بند کر دیتے ہیں، جن سے ان کے خیال میں درویشی کی شان عظمت و جلالت بڑھ جاتی ہے، لیکن تنقید و تجزیہ کے بعد ان کے بیانات میں بڑا سقم پیدا ہو جاتا ہے مگر کچھ مورخین ایسے بھی ہیں جو تذکرہ نویسوں کے ان بیانات سے فائدہ اٹھا کر سلاطین کے کردار کو اس طرح پیش کرنے لگے ہیں، جس سے اس دور کی تاریخ بدنام ہو جاتی ہے، اس طرح تذکرہ نویسوں کی غیر ذمہ دارانہ تحریروں سے اس عہد کی تاریخ کو نقصان پہنچا ہے۔

مغلوں کے عہد میں سلاطین اور صوفیہ کے تصادم کی ایک مثال تو حضرت مجدد الف ثانی کی ہے، لیکن یہ تصادم تصوف کے محاذ پر نہیں ہوا بلکہ اس کے پیچھے اور محرکات تھیں، اسی طرح اورنگ زیب کے عہد میں حضرت سرمد کی شہادت کا واقعہ ہے، وہ دارا شکوہ کے حامی تھے، اور اورنگ زیب کے مخالف تھے، عریاں رہتے تھے، اور جب اس عہد کے قاضی اور فقیہ شیخ عبد القوی نے ان کی عریانی کی وجہ پوچھی تو جواب دیا کہ شیطان قوی است، یہ طنز شیخ عبد القوی کو گراں گزرا، پھر جب وہ دربار میں طلب کئے گئے، تو ان سے کلمہ پڑھنے کے لئے کہا گیا، تو صرف لا الہ پڑھا، اور جب دوسرا جز پڑھنے کو کہا گیا تو فرمایا ابھی نفی میں مستغرق ہوں، مرتبۂ شہادت پر نہیں پہنچا ہوں ان کی ایک رباعی سے یہ بھی استدلال کیا گیا، کہ وہ معراج جسمانی کے منکر ہیں، آج تک یہ اتفاق نہ ہو سکا کہ ان میں سے کون سے جرم پر

علماء نے ان کے قتل کا فتویٰ دیا لیکن جب وہ دربار سے قتل گاہ کی طرف چلے تو تمام شہر ٹوٹ پڑا اور اس قدر ہجوم تھا کہ راستہ چلنا دشوار ہو گیا قلعہ معلیٰ سے جامع مسجد کے پاس لائے گئے۔ راستے میں بڑے اطمینان اور سکون کے ساتھ بیسیوں رباعیاں کہہ ڈالیں، اور مردانہ وار سر تلوار کے نیچے رکھ کر اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی اور کہا جاتا ہے کہ شہادت کے بعد سر کشتہ سے تین بار لا الہ الا اللہ کی بھی صدائیں بلند ہوئیں۔

صوفیا کرام کی باہمی محبت

صوفیا کرام کی زندگی کا ایک بڑا روشن پہلو یہ ہے کہ ان میں باہم کش مکش نہیں رہی اور مختلف خانوادے اپنے مرکز پر بیٹھ کر اپنے فرائض انجام دیتے اور ایک دوسرے کا احترام کرتے رہے، بلکہ باہمی محبت اور یگانگت کی بعض ایسی مثالیں ہیں، جو دوسروں کے لئے قابلِ تقلید ہیں، مثلاً سہروردیہ سلسلہ کے شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی نے ایک موقع پر کسی بات کی معذرت کرتے ہوئے حضرت فریدالدین شکر گنج کو لکھا کہ میان ما و شما عشق بازی است بابا شکر گنج نے اس کا جواب دیا کہ میان ما و شما عشق است بازی نیست۔

علاؤالدین خلجی کے جانشین قطب الدین خلجی کو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء سے ذاتی مخاصمت پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے مخالفت و عناد میں دوسرے مشائخ سے مراسم پیدا کئے، اس سلسلے میں اس نے ملتان کے سہروردیہ خانوادہ کے بزرگ حضرت شیخ رکن الدین سے بھی اپنی گرویدگی اور شیفتگی کا اظہار کیا۔ اور ان کو ملتان سے دہلی آنے کی دعوت دی، جب وہ دہلی تشریف لائے اور سلطان سے ملنے گئے تو اس نے پوچھا کہ دلی میں سب سے پہلے کس شخص نے آپکا استقبال کیا، گو ان کو حضرت محبوب الٰہی سے سلطان کے عناد کا حال معلوم تھا تاہم انھوں نے جواب دیا کہ اس نے جو اس شہر کا سب سے اچھا آدمی ہے، یعنی حضرت نظام الدین اولیاء نے ایک بار حضرت مخدوم الملک شرف الدین احمد منیری نے حضرت سید جلال الدین بخاری جہانیاں جہاں گشت کے پاس کفش بھیجی جس کا مطلب یہ تھا کہ میں آپ کا کفش پا ہوں۔ حضرت جہانیاں جہاں گشت نے اس کے بدلے میں اپنی دستار بھی جس سے مراد یہ تھی، کہ آپ میرے سر تاج ہیں۔

لیکن یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ صوفیہ کرام کے خانوادے جب بڑھتے گئے، تو اکابر صوفیہ کے نہ رہنے کی وجہ سے وہ یکانگت اور موانست باقی نہیں رہی، چشتیہ سلسلہ میں کئی خانوادے ہوگئے صابریہ، نظامیہ، جمالیہ، پھر سہروردیہ، فردوسیہ، شطاریہ، قادریہ، نقشبندیہ، مجددیہ کی خانقاہیں بھی الگ الگ تھیں، اور یہ کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا، کہ ان خانقاہوں میں چشمک نہیں رہی، ان سلسلوں کے پیر اگر خاموش بھی رہتے تو ان کے مُریدا پنے اپنے سلسلہ کی فضیلت بیان کر کے کھچاؤ پیدا کر دیتے، جس سے عوام میں بھی ایک ذہنی انتشار پیدا ہو جاتا۔

صوفیہ اور علماء

تمام اکابر صوفیہ نے علماء ہی کی طرح تعلیم حاصل کی۔ حضرت بختیار کاکی نے تمام ظاہری علوم کی تعلیم پائی تھی، حضرت بہاؤالدین زکریا سہروردی نے کلام پاک ساتوں قراتوں کے ساتھ حفظ کیا تھا، اور پندرہ سال تک خراسان اور بخارا میں تحصیل علم کرتے رہے، حضرت فریدالدین گنج شکر نے بھی کلام پاک حفظ کیا، اور فقہ کی کتاب نافع مولانا منہاج الدین ترمذی سے پڑھی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء راہ سلوک کی ابتدائی منزل میں کسی شرعی مسئلہ پر غور و فکر کر رہے تھے کہ ایک مجذوب نے آکر کہا کہ مولانا نظام الدین! علم بہت بڑا حجاب ہے، حضرت شیخ نظام الدین اولیاء کے دل میں یہ بات کھٹکی کہ علم حجاب تو ہو سکتا ہے لیکن بڑا حجاب کیوں کر ہو سکتا ہے، مجذوب نے کہا جب اس جگہ پہنچو گے تو یہ معلوم ہو جائے گا۔ اس کے بعد حضرت شیخ نظام الدین اپنے مرشد حضرت گنج شکر کی خدمت میں پہنچے، اور مجذوب کی باتیں کہہ سنائیں، حضرت فریدالدین گنج شکر نے فرمایا کہ حجاب دو قسم کا ہوتا ہے، ایک ظلمانی، دوسرا نورانی، گناہ اور برائیاں ظلمانی حجاب ہیں، جو شخص ان سے توبہ کرے گا۔ اس کا گناہ معاف کر دیا جائے گا، لیکن علم ایک نورانی حجاب ہے، جس کو ہر شخص نہ عبور کر سکتا ہے اور نہ اس کے کنارے سے اٹھ سکتا ہے، جس وقت تک شرعی علوم میں بھی دستگاہ نہیں ہوگی، خدا کی محبت، معرفت اور قربت حاصل نہیں ہو سکتی، اس لئے علم ایک بڑا حجاب ہو گیا ہے۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء نے قدوری، حریری، مشارق الانوار کی باضابطہ تعلیم پائی اور جب ان کی دستار فضیلت باندھی گئی، تو بدایوں کے علماء اور مشائخ دونوں اس تقریب میں شریک تھے۔

ان کا شمار متبحر علماء میں ہوتا رہا، ان کے مریدان کے علمی تبحر سے بھی استفادہ کرتے تھے، اسی لئے ان کی خانقاہ میں رشد وہدایت کے ساتھ درس وتدریس کا بھی سلسلہ جاری تھا، اکابر صوفیہ کی علمی فضیلت کے معترف سب ہی رہے، مثلاً مولانا قطب الدین کاشانی دہلی آئے، اور حضرت حمید الدین ناگوری کی تصانیف پڑھیں تو اپنے ہمراہی علماء سے کہا کہ اے یارو! جو کچھ ہم نے اور تم نے پڑھا ہے، وہ سب ان تصانیف میں موجود ہے، اور جو کچھ نہیں پڑھا ہے، وہ علم بھی ان کتابوں میں موجود ہے، اسی طرح حضرت شیخ صدر الدین عارف حضرت شیخ ابو الفتح رکن الدین حضرت شیخ برہان الدین غریب، حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی، حضرت شرف احمد منیری حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت، حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی، حضرت خواجہ گیسو دراز، حضرت بہاء الدین نقشبندی، حضرت عبد القدوس گنگوہی اور ان کے دوسرے ہم پایہ مشائخ کا درجہ علوم ظاہری میں جید علماء سے کم نہیں، اور وہ علماء کے صف میں شمار کئے جانے کے مستحق ہیں، لیکن اس حقیقت کے باوجود علماء اور صوفیہ کی تفریق پیدا ہوگئی اور غلط یا صحیح یہ دو علیحدہ گروہ سمجھے گئے۔

صوفیہ کرام اور تبلیغ اسلام

اور جو کام علماء انجام نہ دے سکے، وہ صوفیہ کرام محض روحانی جلووں سے پورا کرتے رہے اسلام کی روحانی طاقت ان ہی بزرگوں کے ذریعہ سے ظاہر ہوتی رہی اور انھوں نے نفس کشی، فقر وفاقہ مجاہدہ، عبادت وریاضت، حلم وعفو، صبر وتحمل، محبت ومودت، جود وسخا، فیاضی، حقوق ہمسایہ تواضع وانکسار کے وہ اعلیٰ نمونے پیش کئے، کہ وہ لوگ بھی جو مسلمان فاتحین کی تلوار کو اسلام کی تلوار سمجھ کر، اسلام سے بدگمان ہوگئے تھے، وہ ان بوریہ نشینوں کے اخلاق کو اسلام کا اخلاق سمجھ کر ان کے ایسے گرویدہ اور فریفتہ ہوگئے، کہ اسلام کی ساری دلآویزی اور رعنائی ان ہی کی ذات میں نظر آنے لگی، اور گو اسلام کی تبلیغ کی باضابطہ کوشش کبھی نہیں کی گئی، لیکن ان بزرگوں کی صحبت کیمیا اثر سے اسلام کا دائرہ خود بخود وسیع ہوتا گیا، حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی کوششوں سے بہت سے ہندو مسلمان ہوئے۔ مشہور ہے کہ جب حضرت خواجہ اجمیر سے دہلی جاتے تھے، تو راستہ میں بہت سے ہندو اسلام قبول کرتے، حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانی اور بابا فرید الدین گنج شکر کے ہاتھ پر پنجاب

کے بہت سے ہندو اسلام لائے، جواہر فریدیہ کے مصنف نے لکھا ہے، کہ بابا فرید نے سولہ قوموں کو تعلیم و تلقین سے شرف بہ اسلام کیا، بوعلی قلندر پانی پتی نے پانی پت میں تین سو راجپوتوں کو مسلمان کیا حضرت جلال الدین تبریزی نے بنگال میں رہ کر اسلام کو پھیلایا، شیخ جلال الدین نے آسام کے علاقہ سلہٹ میں جاکر تبلیغ کی، کشمیر میں بلبل شاہ اور سید علی ہمدانی کی وجہ سے اسلام پھیلا، خواجہ سید محمد گیسو دراز نے پونہ اور بلگام میں بہت سے لوگوں کو مسلمان بنایا۔

ان بزرگوں نے یہاں کے باشندوں کی تسخیر قلوب کے لئے بہت سی صورتیں اختیار کیں، اور یہ تسخیر قلوب امیر خسرو کی تحریروں میں زیادہ نظر آتی ہے، جن کی نگاہوں میں ہندوستانی پھولوں سے زیادہ دلاویز پھول کہیں اور نہیں ہیں، ہندوستانی عورتوں سے زیادہ کسی اور جگہ کی عورتیں حسین اور وفا شعار نہیں، حتیٰ کہ وہ سنسکرت زبان کو فارسی پر ترجیح دیتے ہیں، اور ہندو مذہب کو اسلام کے علاوہ ہر مذہب سے بہتر اور برتر قرار دیتے ہیں، تسخیر قلوب ہی کی خاطر مسلمانوں کے بعض حلقے کبیر پنتھی اور سدا سہاگ جیسے فرقوں کی طرف مائل ہوئے، اور انھوں نے ان کے ذریعہ ہندوؤں سے قریب تر ہونے کی کوشش کی، کشمیر میں تو کچھ مسلمان فقراء ایسے بھی تھے، جو اپنے کو رشی کہتے تھے۔ کچھ صوفیوں نے ہندو رشیوں کے یوگ، ذکر، مراقبہ، حبس دم، دھیان گیان، اور ریاضت کے طریقوں کو بھی اپنایا، اور وحدت الوجود کے مسئلہ میں انھوں نے بہت سے دلائل ویدانت کے فلسفے سے اخذ کئے۔ اسی لئے ایک گروہ ایسا بھی تھا جو تصوف اور ویدانت کو ایک ہی چیز سمجھتا رہا، لیکن علماء ایسے عقائد رکھنے والے گروہوں کو گمراہ سمجھتے رہے۔

(باقی آیندہ)

تعلیم اور فلسفہ کا باہمی تعلق

ڈاکٹر سلامت اللہ

تعلیم کا منصب دراصل ان عقائد، رجحانات، خیالات، اقدار، وغیرہ کی اشاعت کرتا ہے، جو کسی مخصوص سماج میں کسی خاص دور میں جاری و ساری ہوتے ہیں۔ اب سوال اٹھتا ہے کہ کیا یہ تمام چیزیں ایک دوسرے سے الگ تھلگ اور بے تعلق ہیں یا ایک ہی رشتے میں منسلک ہیں حقیقتاً یہ سب ایک ہی نظام فکر کی حامل ہوتی ہیں، جسے علمی اصطلاح میں فلسفہ کہا جاتا ہے وسیع معنوں میں دیکھئے تو کوئی بھی فلسفہ کل کائنات کا ایک جامع تصور پیش کرتا ہے اور یہ متعین کرتا ہے کہ کائنات میں انسان کا کیا مقام ہے۔ یہ تو ہے فلسفے کا مرکزی موضوع۔ مگر اس کے دامن میں چند نظریات ایسے ہیں جنھیں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ مثلاً وہ نظریات جو حقیقت، علم اور اخلاقیات کی ماہیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ان نظریات کی بنا پر ہی انسان کائنات میں اپنے مقام کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یعنی اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ ہم معلوم کریں کہ کائنات کی حقیقت کیا ہے، اس کا علم کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے اور اس پر قابو پانے کے لئے کون سے مقاصد پیش نظر ہونے چاہئیں۔

عملی لحاظ سے دیکھئے، تو فلسفے کے دائرے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ بتاتا ہے کہ انسان کی منزل مقصود کیا ہے، اس کی راہ میں کس کس قسم کی رکاوٹیں ہیں اور انھیں کیوں کر دور کیا جا سکتا ہے، انسان کی تگ و دو کا مقصد کیا ہونا چاہیئے، وہ کن بلندیوں کو چھو سکتا ہے اور وہ چیزیں جو آج اس کی دسترس سے باہر ہیں، کل کس طرح اس کے پنجۂ اختیار میں آسکتی ہیں۔ غرض فلسفہ مقصد حیات کی محض تعبیر ہی نہیں کرتا، بلکہ ان اقدار اعلیٰ کا معیار بھی مقرر کرتا ہے جن کی رہنمائی میں انسان کو اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کی جدوجہد کرنی چاہیئے۔ لہذا فلسفہ فقط غور و فکر اور خیال

کی فضاؤں میں پرواز نہیں کرتا بلکہ وہ عمل کا محرک اور رہنما بن جاتا ہے۔ اس طرح فلسفہ عمل کو بصارت عطا کرتا ہے اور عمل فلسفہ میں بصیرت پیدا کرتا ہے، خیال اور عمل کے غیر فطری تضاد کو مٹاتا ہے اور فکر اور تجربے کو ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ کرتا ہے۔ اس طرح دیکھئے تو فلسفہ صرف دنیا کے مظاہر کی تشریح و توجیہہ پر اکتفا نہیں کرتا۔ وہ اُن میں بقول کارل مارکس انسانی ضروریات کے مطابق مناسب تبدیلیاں پیدا کرنے کا آلہ بنتا ہے۔ چونکہ تعلیم اس مقصد کو حاصل کرنے کا ایک موثر ذریعہ ہے اس لیے فلسفہ کے نزدیک تعلیم کی بڑی اہمیت ہے اور تعلیم کے لیے فلسفہ ایک رہبر اور ہادی کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

یوں تو یہ بات بہت سیدھی سادی معلوم ہوتی ہے کہ فلسفہ کو تعلیم کی رہنمائی کرنی چاہیئے لیکن ماہرین تعلیم میں اس بارے میں اختلاف رائے ہے۔ جو حضرات تعلیم کو اقدار اعلیٰ کا خادم بنانا چاہتے ہیں، ان کے نزدیک فلسفہ کی حیثیت مقدم ہے۔ وہ پہلے ہی سے جانتے ہیں کہ انسانی زندگی کی تشکیل کیوں کر ہونی چاہیئے اور وہ اس مقصد کے حصول کے لیے تعلیم کو آلۂ کار بنانا چاہتے ہیں۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جن کا عقیدہ یہ ہے کہ فلسفہ دراصل تعلیمی عمل کا نتیجہ ہے نہ کہ سبب پیرو ہے نہ کہ رہبر۔ وہ فلسفہ کو تعلیم کی جڑ نہیں پھول سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک فلسفۂ تعلیم کی سی اگر کوئی چیز ہے تو وہ محض ان اصولوں کا مرکب ہے جو تعلیمی عمل سے اخذ کیے گئے ہیں۔ لیکن حقیقت میں، جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، فلسفۂ تعلیم جہاں ایک طرف تعلیمی عمل اور تجربے سے کسب نور کرتا ہے؛ وہاں دوسری طرف وہ تعلیمی عمل کو روشنی عطا کرتا ہے۔ فلسفہ تعلیم کے لیے نظریہ مہیا کرتا ہے؛ جس کے مطابق تعلیم عمل کے قالب میں ڈھلتی ہے۔ لیکن یہ عمل بجائے خود پرانے نظریے میں تبدیلی کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔ اور ایک نئے نظریے کی تخلیق کا سبب بنتا ہے۔ اس طرح نظریہ اور عمل مسلسل ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ نظریے کا نکتہ چیں دراصل اس نظریے کی تنقید کرتا ہے، جس کا حقیقت سے کوئی رشتہ نہیں۔ اسی طرح جو "عمل" پر تنقید کرتا ہے اس کے پیش نظر ایسا عمل ہے جس میں غور و فکر کا کوئی دخل نہیں۔ جو اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتا ہے، جس کے سامنے کوئی واضح منزل نہیں ہے۔ فلسفہ کا کام ہر منزل متعین کرنا اور عمل کی رہنمائی کے لیے عام اصول

وضع کرنا جہاں تک راستہ اختیار کرنے کا تعلق ہے اسے تجربے کے لئے چھوڑ دینا چاہیئے۔

اگر تعلیم فلسفہ کے ساتھ مناسب طور پر مربوط ہو جائے، تو وہ اُن خطروں سے خود کو محفوظ رکھ سکے گی، جو اسے عمل کی وادیٔ پُرخار میں پیش آئیں گے۔ فلسفہ ہی تعلیم کو ایک مقصد سے آشنا کرتا ہے اور اس کے لئے ایک سمت مقرر کرتا ہے۔ اگر تعلیم کا مقصد واضح نہ ہو، تو تعلیم ایک رجعت پرست قوت بن سکتی ہے۔ مثال کے طور پر، ہمت، جواں مردی، وفا شعاری، مستقل مزاجی، فرماں برداری وغیرہ اپنی جگہ قابل تعریف محاسن ہیں۔ مگر یہی خوبیاں ڈاکوؤں کے کسی گروہ میں پیدا کردی جائیں تو متمدن سماج کے لئے عذاب جان بن جائیں گی۔ اس لئے اس بات کی وضاحت بہت ضروری ہے کہ ہم تعلیم کے ذریعے کس قسم کے فرد کی تخلیق کرنا چاہتے ہیں اور ہمیں کس نوع کے سماج کی تعمیر کرنی ہے۔ محض تعلیمی طریقوں کو بہتر اور موثر بنانے سے کام نہیں چلے گا۔ تعلیم کے مقاصد پسندیدہ نہ ہوں، تو تدریس کے اچھے سے اچھے طریقے ایسے رجحانات پیدا کرسکتے ہیں، جو ہیئت اجتماعی کے حق میں سم قاتل ثابت ہوں۔ مثال کے طور پر انگلستان کے "پبلک اسکول" کو لیجئے۔ اس کا طرۂ امتیاز اس مشہور کہاوت سے ظاہر ہوتا ہے: "واٹرلو کی جنگ دراصل ایٹن اور رگبی کے کھیل کے میدانوں میں جیتی گئی"۔ بے شک انگلستان کا پبلک اسکول اپنے موثر تربیتی پروگرام اور سخت ضبط کی بدولت ایسے جانباز اور بہادر فوجی لیڈر اور ہوشیار اور جابر حکمراں پیدا کرنے میں کامیاب ہوا، جنھوں نے برطانوی سامراج کی توسیع اور استحکام کی مہم کی سرغنائی کی، اور جو محکوم ممالک میں اپنی حکمت عملی سے بہت "قابل" ثابت ہوئے۔ لیکن ان کی قابلیت کا راز یہ تھا کہ وہ محکوم قوموں کے ساتھ گھٹیا سے گھٹیا سلوک کو روا رکھتے، کسی قسم کے ظلم و تشدد سے دریغ نہ کرتے اور اپنے محکوموں پر اس قدر خوف و دہشت طاری کرتے کہ وہ بے چارے سر اٹھانے کی جرأت نہ کرسکتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا اسکول کسی صالح اور انسانیت پرور فلسفہ کا حامل نہیں ہوسکتا۔ تعلیم کے مقاصد، طریقے، نصاب، امتحانات، وغیرہ، غرض پورے تعلیمی عمل میں بالآخر اخلاقیات کے اصول پوشیدہ ہیں۔ لہٰذا ہمیں ایک ایسے فلسفۂ تعلیم کی ضرورت ہے جو ایک بہتر عالم انسانی کی تخلیق میں مددگار ثابت ہوسکے۔

فلسفۂ تعلیم داقعی سماجی نظام کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس لئے ہر ایک سماج میں ایک مخصوص فلسفۂ تعلیم کارفرما ہوتا ہے۔ مختلف قسم کے سماجوں میں "بہتر دنیا" کے متعلق جو تصورات عادی ہیں، وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے جُدا جُدا ہیں۔ مثلاً کسی سماج کے نزدیک استقلال دائمی سب سے بڑی قدر ہے وہ اپنی موجودہ حالت کو بہر کیف قائم رکھنا چاہتا ہے اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ دوسرا سماج ایسا ہو سکتا ہے کہ جس میں کوئی بھی قدر قطعی نہیں سمجھی جاتی۔ وہاں قدر کی حیثیت محض اضافی ہے، جس چیز سے اپنا کام بنے، اپنی ضرورت پوری ہو جائے، تسکین قلب حاصل ہو، وہی قدر ہے۔ ایک سماج ایسا بھی ہو سکتا ہے، جو تغیر کا قائل تو ہو لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری سمجھتا ہو کہ تغیر کے ذریعے ایسی قدر ہاتھ آنی چاہیئے، جس کی صحت پر بھروسا کیا جا سکے اور جو انسانی زندگی کو سنوارنے اور بھرپور بنانے میں شمع ہدایت کا کام دے سکے۔ اس قسم کے سماج کو صحیح معنوں میں جمہوری سماج کہا جا سکتا ہے۔ یہاں فلسفۂ تعلیم اس بنیادی عقیدے پر مبنی ہوگا کہ "انسان تمام چیزوں کی کسوٹی ہے"۔ انسان کی شخصیت قابل احترام ہے اور انسان میں کمال حاصل کرنے کی بے پایاں صلاحیت موجود ہے، وہ موزوں حالات میں خوب سے خوب تر بننے کی کوشش کر سکتا ہے۔ یہ فلسفۂ تعلیم بچوں اور نوجوانوں کے اس حق کا دعوے دار ہے کہ انھیں وہ تمام وسائل اور سہولتیں میسر ہونی چاہئیں، جن کی بدولت ان کی جسمانی، ذہنی، اخلاقی غرض ہر اعتبار سے مکمل نشوونما ہو سکے اور وہ اپنے سماج کے لئے زیادہ سے زیادہ کارآمد اور موثر رکن بن سکیں۔

فلسفۂ تعلیم کے نظریات ہمیشہ ان مفروضات پر مبنی ہوتے ہیں جو انسانی فطرت سے متعلق صحیح تسلیم کر لئے گئے ہیں۔ تعلیم کا مقصد کیا ہونا چاہیئے، اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ انسان میں فطری طور پر کیا کچھ موجود ہے، وہ کیا بن سکتا ہے اور کیا نہیں بن سکتا۔ یا یوں کہیئے کہ فلسفۂ تعلیم اپنے سامنے انسان کی ترقی کے امکانات اور حدود دونوں چیزوں کو رکھتا ہے۔ اور ان دونوں کا تعین ان خصوصیات کی بنا پر کیا جاتا ہے، جو بنیادی طور پر انسانی فطرت

سے منسوب کی گئی ہیں۔ مثلاً یہ مفروضہ کہ انسانی فطرت زمان و مکان کی قید سے بالاتر ہے اور اس میں کوئی اہم تبدیلی واقع نہیں ہو سکتی۔ ایک ایسے فلسفۂ تعلیم کی بنیاد بنتا ہے، جو تعلیم کے پرانے چلن کو برقرار رکھنے پر اصرار کرتا ہے۔ اس فلسفے کے علم بردار روایت پرست ہیں، ان کا ایمان دائمی اقدار پر قائم ہے اور ان کا عقیدہ ہے کہ اُن قدروں کو ایک باضابطہ نصابِ تعلیم اور پرانے زمانے کے آزمودہ طریقوں کے ذریعے نسلاً بعد نسلاً منتقل کرتے رہنا چاہیئے۔ اس کے برعکس وہ لوگ جو انسانی فطرت کو تغیر پذیر مانتے ہیں، اس بات پر زور دیتے ہیں کہ نصابِ تعلیم اور طریقۂ تعلیم میں فرد اور سماج کی بدلتی ہوئی ضرورتوں کے مطابق تبدیلی ہوتی رہنی چاہیئے اور سیکھنے کے پورے عمل میں سیکھنے والے کی شرکت فعالی طور پر ہونی چاہیئے۔

اسی طرح جب یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ انسانی فطرت میں ایک روح جلوہ گر ہے اور یہ روح مختلف قوتوں کی مالک ہے، جیسے، قوت استدلال، قوت متخیلہ، قوت حافظہ وغیرہ، تو مواد تعلیم الگ الگ خانوں میں اس طرح تقسیم کر دیا جاتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے ذریعے ایک ایک قوت کی جُدا جُدا نشوونما ہو سکے۔ یا اگر انسانی فطرت کو ایک "صاف تختی" گردانا جائے، تو پھر سیکھنے والے پر انواع و اقسام کا تعلیمی مواد نقش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، چاہے وہ اس کی صلاحیت اور استعداد کے مطابق ہو یا نہ ہو۔

انسانی فطرت سے متعلق ایک مفروضہ یہ بھی ہے کہ انسان پیدائشی طور پر خود غرض واقع ہوا ہے اور اس حد تک کہ اس کا یہ مرض لاعلاج ہو گیا ہے۔ اس تصور نے کم و بیش قبول عام کی سند حاصل کر لی ہے۔ یہ بہت شرارت آمیز تصور ہے اور تعلیمی میدان نیز دوسرے سماجی میدانوں میں اس تصور کی بڑی خطرناک شکلیں دکھائی دیتی ہیں۔ یہ اس بات کی تبلیغ کرتا ہے کہ ہر ایک شخص کو اپنی اپنی جنت کی کرنی چاہیئے اور اگر دوسرے جہنم کے حوالے ہو جائیں تو اس سے اسے کوئی سروکار نہ ہونا چاہیئے۔ اس بنا پر نہ صرف افراد کے جارحانہ عمل کی بلکہ بین الاقوامی جنگوں کی بھی تاویل پیش کی جاتی ہے اور بعض اوقات تو اس قسم کے مظاہر کو جائز تک قرار دیا جاتا ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ انسان فطرتاً خود غرض ہے اور یہ کہ فطرت انسانی بدلی نہیں جا سکتی، تو پھر کام کرنے کا اور کوئی

محرک نہیں رہ جاتا بجز اس کے کہ یا تو کام کرنے کی ترغیب کے لئے انعام کا لالچ دیا جائے یا کام نہ کرنے کی صورت میں سزا کے خوف سے متاثر کیا جائے۔ بظاہر ان میں سے کوئی بھی صورت پسندیدہ نہیں ہے۔ مگر مدرسے کے اندر اور باہر ہر جگہ اس کی کارفرمائی نظر آتی ہے نتیجے کے طور پر تعاون کی جگہ مقابلے کی اسپرٹ کو فروغ حاصل ہوتا ہے اس سے بچوں اور نوجوانوں کے درمیان رشک وحسد کا ادنیٰ جذبہ ابھرتا ہے اور یہ جذبہ وہ ہے جو اجتماعی زندگی کے سرچشمے کو زہر آلود کر دیتا ہے۔ پھر کیا تعجب ہے کہ مدرسہ ان خود غرضانہ رجحانات کو تقویت پہنچاتا ہے جو مقابلے پر مبنی سماج میں جاری و ساری ہیں۔

دراصل اس مفروضے کے لئے کوئی قوی جواز نہیں ہے کہ انسان فطرتاً خود غرض واقع ہوا ہے۔ یہ سچ ہے کہ عموماً سبھی انسان اپنی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنا چاہتے ہیں۔ مثلاً سب کو غذا، لباس، مکان، رفاقت، محبت، وغیرہ چاہیئے۔ لیکن اس کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ انسانی فطرت میں خود غرضی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے بے شک۔ یہ خواہشات فطری ہیں۔ مگر اس سے بدی کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔ ان خواہشات کو امداد باہمی کی بنا پر سماجی وسائل کی دانشمندانہ تنظیم اور تقسیم کے ذریعے خود غرضی کو فروغ دیئے بغیر بہ حسن خوبی پورا کیا جا سکتا ہے۔

جس چیز کو فطرت انسانی سے تعبیر کیا جاتا ہے، وہ درحقیقت کوئی جامد اور مستقل شے نہیں ہے۔ وہ اُن حالات کا پھل ہے جن کے تحت انسان رہتا سہتا ہے۔ یہ حالات بہت بڑی حد تک سماجی نظام کے رہینِ منت ہوتے ہیں۔ انسانی فطرت اصل میں سماجی نظام کی عکاسی کرتی ہے۔ وہ لوگ جو اس کلیہ کے حامی ہیں، دو فریقوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں، اس لئے کہ وہ دو مختلف قسم کے فلسفوں کے پیرو ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جن کا عقیدہ ہے کہ سماج میں افراد کے تعلقات اُن کی اپنی مرضی اور ارادہ کے مطابق قائم ہوتے ہیں اور ان تعلقات کی حیثیت خارجی ہوتی ہے یعنی وہ سماج کے داخلی عوامل سے متاثر نہیں ہوتے اور افراد سماج کی تشکیل میں آزادی اور خود مختاری کے ساتھ حصہ لیتے ہیں۔ اس تصوّر کی رو سے افراد گویا خود مختار "ایٹم" ہیں، جو ایک دوسرے پر آزادی کے ساتھ اثر انداز ہوتے ہیں اور نتیجے کے

طور پر ایک مرکب بناتے ہیں، جسے سماج کہا جاتا ہے۔ انسانی فطرت کا یہ سماجی تصور تعلیم میں آزادیٔ عمل کے نظریے کو جنم دیتا ہے۔ اس فلسفۂ تعلیم کے نزدیک یہ قطعاً جائز نہیں کہ تعلیمی عمل پر کسی قسم کا سماجی ضبط عائد کیا جائے کیونکہ وہ فرد کی آزادانہ نشوونما کو بہرکیف عزیز رکھتا ہے۔ تعلیم میں انفرادیت پرستی کی نظریاتی بنیاد یہی ہے اور جب اس نظریے کو عملی جامہ پہنایا جاتا ہے، تو یہ خطرناک حد تک اس نظریے کا مشابہ معلوم ہوتا ہے جس کے مطابق انسان فطری طور پر خودغرض قرار دیا گیا ہے۔

فطرتِ انسانی کی سماجی اساس سے متعلق دوسرا خیال یہ ہے کہ انسان کی فطرت بالآخر سماج کی ساخت سے متعین ہوتی ہے۔ اس نظریے کی رو سے سماج کے اندر افراد کے تعلقات داخلی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ ہر ایک فرد دوسرے کے ساتھ سماج کے اندرونی عوامل کی بدولت وابستہ ہے اور صرف مشترکہ مقاصد کی بنا پر ہی افراد سے سماج بنتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھئے تو افراد صرف اسی حد تک آزاد ہیں جتنا کہ وہ سماجی کنٹرول کی حقیقت کا صحیح شعور رکھتے ہیں اور جہاں تک وہ سماجی ارتقا کے قوانین کے مطابق اس کنٹرول میں اجتماعی طور پر تبدیلی پیدا کر سکتے ہیں۔ جو فلسفۂ تعلیم اس خیال کی ترجمانی کرتا ہے وہ نہ صرف آزادی کے اس تصور کو تسلیم کرتا ہے بلکہ اسے جائز اور پسندیدہ قرار دیتا ہے۔ اس کے مطابق بچوں اور نوجوانوں کی انفرادی نشوونما کے لئے تعلیم کا سماجی مقصد بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور اس لحاظ سے تعلیمی عمل پر سماجی ضبط عائد ہونا چاہیئے۔ اگر ہم اس فلسفہ پر ایمان لائیں، تو پھر ہم اس قنوطیت اور کلبیت کی فضا سے باہر نکل سکیں گے جو یہ تسلیم کر لینے سے پیدا ہوتی ہے کہ انسانی فطرت بدلی نہیں جا سکتی۔

اوپر کی بحث میں اشارہ کیا گیا ہے کہ انسانی فطرت کی تبدیلی ممکن ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان کی فطرت کس حد تک بدلی جا سکتی ہے؟ بعض کا خیال ہے کہ ایک خاص حد سے آگے اس میں تبدیلی کی گنجائش نہیں ہے۔ اگر اس خیال کو صحیح سمجھ لیا جائے تو پھر سماجی نظام کو از سرِ نو تعمیر کرنے کے امکانات خود بخود محدود ہو جائیں گے۔ دوسرے لوگ جو انسانی فطرت کی تبدیلی اور سماجی نظام کی تعمیرِ نو سے متعلق زیادہ پُرامید ہیں، انسان کی لامحدود ترقی میں یقین رکھتے ہیں مگر روزمرہ کے تجربات اور نفسیاتی جانچ کے نتائج شاہد ہیں کہ افراد کے مابین ان کی ذہنی صلاحیتوں کے لحاظ سے نمایاں فرق

یا جاتا ہے۔ اور ذہنی صلاحیت ہی تمام ترقی کی جڑ ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا ذہانت یا سیکھنے کی صلاحیت میں اضافہ کیا جا سکتا ہے؟ جو حضرات ذہانت کو ایک مستقل، مطلق اور ناقابلِ تغیر شے سمجھتے ہیں وہ دانستہ یا نادانستہ طور پر ان طبقات کے سماجی اور اقتصادی سلسلۂ مدارج کے لئے جواز پیش کرتے ہیں جن میں ہمارا موجودہ سماج بٹا ہوا ہے کیونکہ ان کا دعویٰ ہے کہ جو لوگ غیر معمولی طور پر ذہین ہوتے ہیں وہی سماجی زینے کی سب سے اونچی سیڑھی پر پہنچتے ہیں اور کند ذہن لوگ نیچے کی سیڑھیوں پر رہ جاتے ہیں۔ ان حضرات کے طرزِ فکر میں دو بڑی خامیاں ہیں۔ اول یہ کہ ان کے نزدیک ذہانت کی نشوونما میں مواقع کی فراہمی کا کوئی دخل نہیں ہے۔ دوم یہ کہ وہ سماج میں اعلیٰ درجہ حاصل کرنے کے لئے ذہانت کے علاوہ اور تمام چیزوں کو غیر اہم سمجھتے ہیں۔ اس نظریے کی بنا پر ہی "ذہین" طلبہ کے لئے اعلیٰ اور لبرل تعلیم اور کند ذہن طالب علموں کے لئے ابتدائی اور پیشہ ورانہ تعلیم تجویز کی جاتی ہے۔ گویا ذہن اور جسم دونوں میں کوئی باہمی تعلق نہیں ہے، جیسے ان میں سے ہر ایک کو الگ الگ ترقی دی جا سکتی ہے۔ یہ وہی فلسفہ ہے جو خیال کو عمل سے اور دماغ کو جسم سے جدا کرتا ہے اور اس طرح دونوں کو کمزور بناتا ہے، جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ دراصل یہ فلسفہ سماج کو دو حصوں میں بانٹ دیتا ہے۔ ایک تو وہ، جو صرف دماغ سے کام لیتا ہے، جو صرف سوچتا اور غور و فکر کرتا ہے اور خیال کی دنیا میں مگن رہتا ہے۔ اور دوسرا وہ جو اپنے جسم سے کام لیتا ہے، جو محنت مشقت کرتا ہے اور انسانی زندگی کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ اپنے لئے بھی اور دوسروں کے لئے بھی جو فقط "خیال" کے سہارے زندگی گزارتے ہیں۔

عملاً ہوتا یہ ہے کہ جو لوگ مادی وسائل کے لحاظ سے اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ تعلیم کے اچھے سے اچھے مواقع سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور اپنی فطری ذہانت بڑھاتے ہیں۔ اس طرح "ذہانت" اعلیٰ سماجی مرتبہ کے ساتھ وابستہ ہو جاتی ہے۔ اس سے ایک برا چکر قائم ہو جاتا ہے اور سماج اپنی بے ڈھنگی رفتار پر قائم رہتا ہے۔

ذہانت ایک ایسی خوبی ہے جس کا "سیکھنے" سے گہرا تعلق ہے۔ جب کوئی شخص اپنے ماحول کے ساتھ تعلقات قائم کرتا ہے تو ہر ایک تعلق سے اس کی جذباتی اور ذہنی زندگی پر کچھ اثرات

مرتب ہوتے ہیں۔ یہ اثرات ایک مدت تک قائم رہتے ہیں اور اس دوران میں جب وہ شخص اپنے ماحول کے ساتھ کوئی نئے تعلقات قائم کرنا چاہتا ہے، تو ان اثرات کی وجہ سے اس کے ردِ عمل میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے عمل میں ذہانت کو پرکھنے کا یہی طریقہ ہے۔ لہٰذا یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ ذہانت کوئی پیدائشی مستقل شے ہے جو ہمیشہ ایک ہی سطح پر قائم رہتی ہے۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ذہانت ایک سماجی چیز ہے، جو عمل اور ردِ عمل کے ذریعے برابر تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ یہ یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ ذہانت کا کتنا حصہ موروثی ہے اور کتنا اکتسابی۔ کتنا حصہ قدرت کا عطیہ ہے اور کتنا ماحول کی دین ہے۔

ذہانت کے اس تصور کی رو سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ نسلوں اور سماجی طبقوں کی برتری اور کمتری کا انحصار پیدائشی صلاحیتوں کی فراوانی یا کوتاہی پر نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ وہ تاریخی حالات اور تہذیبی مواقع ہیں جو کسی نسل یا طبقے کے حصے میں آتے ہیں۔ لہٰذا یہ مفروضہ کہ فطرتِ انسانی کو ایک خاص حد تک ہی بدلا جا سکتا ہے معلمین کے لئے ایک چیلنج ہے کہ وہ اُن حدود کو عبور کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔ دانشمندی اور دیانت داری کا تقاضا ہے کہ اس وقت تک کسی حد بندی کو تسلیم نہیں کرنا چاہیئے، جب تک کہ اس کو پار کرنے کی تمام کوششیں ناکام ثابت نہ ہو جائیں۔

غزل

حضرت علی جواد زیدی

ہجومِ شوق میں ہم کوئے یار سے گزرے
نسیم جیسے دیارِ بہار سے گزرے

عجیب شرط پہ پایا صبا نے اذنِ خرام
گلوں تک آئے مگر نوکِ خار سے گزرے

رہِ وفا کی فضا میں نہ جانے کیا دیکھا
کہ وہ بھی آئے تو کچھ اشکبار سے گزرے

نہ جانے کانٹوں کے ہونٹوں پہ ہے لہو کس کا
رواں دواں تو ہمیں خارزار سے گزرے

دلوں تک آئے ہیں یادوں کے کارواں لیکن
دلوں کو چھوتے ہوئے نوکِ خار سے گزرے

سکھا گئے مجھے زیدی رموزِ بے باکی
جو حوصلے رہِ زنداں و دار سے گزرے

حالاتِ حاضرہ

شام کی اُلجھنیں

۲۸ مارچ کو شامی فوج نے زمام اختیار ایک بار پھر اپنے ہاتھ میں لے لی اور اخباروں نے سرخیاں لگائیں کہ "ناصر ازم" کی جیت ہوئی، لیکن اس وقت سے لے کر اب تک شام کے سیاسی حالات جس نشیب و فراز سے گزرے ہیں اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صورت حال غیر مستحکم ہے، کوئی بات قطعیت سے نہیں کہی جا سکتی، اور محض امکانات سے متعلق قیاس آرائی کی جا سکتی ہے۔

گذشتہ سال ستمبر کے مہینے میں جو فوجی انقلاب ہوا تھا اُس کے پیچھے دائیں بازو کے رجحانات کام کر رہے تھے، اس لئے شامیوں نے متحدہ عرب جمہوریہ سے اپنا تعلق منقطع کر لیا تھا، سوشلزم کی مذمت کی تھی اور ناصری اصلاحات جن کی ضرب جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام پر پڑتی تھی، معطل کر دی گئی تھیں، دوسرے لفظوں میں یہ کہ یہ انقلاب عرب نیشنلزم اور عرب سوشلزم دونوں رجحانات کے منافی تھا، خیال ہے جو پانچ سرمایہ دار خاندانوں کا جتھا ہے اور جو شام کی قومی دولت کے تقریباً چوتھائی حصے پر قابض ہے، اس انقلاب کا پُرجوش حامی تھا۔ اس انقلاب نے ناصر کی آرزوؤں کا خون کر دیا تھا لیکن انھوں نے اس صدمہ کو صبر و تحمل سے برداشت کیا اور اس کے لئے دنیا سے خراج تحسین وصول کیا، اس کے بعد کئی بار شام نے مصر سے فوجی اور سیاسی معاملات میں تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی لیکن ہر بار ناصر نے یہی جواب دیا کہ تعلقات کی نوعیت خواہ کچھ بھی ہو وہ اگر قائم ہو سکتے ہیں تو نظری اتحاد کی بنیادوں پر، اور ایسے ہی تعلقات پائدار، مفید اور نتیجہ خیز ہو سکتے ہیں، ناصر کا یہ رویہ حقیقت پسندی پر مبنی ہے (عرب سرمایہ داری اور عرب سوشلزم میں کیسے اتحاد ہو سکتا ہے)۔ اس دوران میں عراق نے اس خلا کو پُر کرنا چاہا اور وہ شام سے زیادہ قریب آگیا، لیکن عراق کی دوستی کی بنیاد عرب نیشنلزم، عرب سوشلزم نہیں تھی بلکہ اس کے پیچھے تجارت، فوجی اور معاشی مصلحتیں تھیں، عراق کے نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو شام کی دوستی

سے اسے کچھ سیاسی فائدے حاصل ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شام ایک طرف تو معاشی اور تجارتی مصلحتوں کی بنا پر عراق کی طرف جھکا لیکن عراقی سیاست کے تقاضوں کی طرف سے چوکنا بھی رہا۔ اور جب اسرائیل کے مقابلہ کے لئے عراق نے فوجی امداد کی پیش کش کی تو شام نے اُسے خوش اسلوبی سے ٹال دیا۔

شام اور مصر کا اتحاد اور اس کا اثر شامی تجارت وصنعت پر

میرے نزدیک یہ بات بہت اہم ہے اور ہمیں کسی وقت اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ مجموعی طور پر شام کا معیار زندگی دوسرے عرب ممالک سے بلند رہا ہے۔ شام کی خوشحالی کا راز اس کی تجارت میں ہے جس کا سلسلہ سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں سال پر پھیلا ہوا ہے، صدیوں تک کتنے تجارتی راستے یہاں سے گزرے ہیں اور تجارتی قافلوں نے مشرق ومغرب کا دولت کا ایک حصہ ہمیشہ شامیوں کے لئے شام کی منڈیوں میں چھوڑا ہے، یہی وجہ ہے کہ یہاں ایک ایسا طبقہ رہا ہے جسے شامیوں کی زندگی کے ہر شعبہ پر غلبہ حاصل تھا اور آج بھی ہے۔ محل وقوع کی خصوصیات اور تاریخی عوامل نے اہل شام کو مزاج، ذوق اور افتاد طبع کے اعتبار سے دوسرے عرب ممالک کے باشندوں اور (یہاں خاص طور پر) مصریوں سے بہت مختلف بنا دیا ہے۔ شام کو مصر کی طرف سے ہمیشہ فوجی اور سیاسی غلبہ کا اندیشہ بھی رہا ہے، وہ زراعتی مصر کی سیاسی برتری کو جہاں بڑھتی ہوئی آبادی نے عرصے سے ایک نازک مسئلہ کی صورت اختیار کر رکھی ہے، اپنی سیاسی آزادی اور معاشی خوش حالی کے حق میں مضرت رساں تصور کرتا رہا ہے۔

شام نے اپنے اندرونی سیاسی اضطراب سے بچنے کے لئے جب مصر کی طرف اتحاد و دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور مصر نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا اور متحدہ عرب جمہوریہ قائم ہوئی تو دیکھنے والی نظریں اس اتحاد کا داخلی تضاد دیکھ رہی تھیں، خود بعث پارٹی نے جسے اس اتحاد کا بانی کہہ سکتے ہیں، متوقع اشتراکی انقلاب سے خائف ہو کر یہ قدم اٹھایا تھا، خیال یہ ہے کہ وہ ناصری طرز کی عرب سوشلزم پا اور وہ بھی مصر کی قیادت میں، پورا اعتماد نہیں رکھتی تھی، اس کا اقدام منفی اقدام تھا جس کی پائداری شروع ہی سے مشتبہ تھی۔ بہرحال جب شام اور مصر کا اتحاد عمل میں

آیا تو اس سے شام کی تجارت پر بُرا اثر پڑا، اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ شام کی تجارت کا بہت بڑا حصہ ترکی، عراق اور اردن سے وابستہ تھا، اور ان تینوں ملکوں سے مصر کے تعلقات بہت خراب تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ ان ملکوں سے شام کی تجارت تقریباً بند ہوگئی اور شام کے تاجروں، صنّاعوں اور اُن تمام لوگوں کو جو ان سے وابستہ تھے سخت قسم کی معاشی دشواریوں کا سامنا ہوا، شامی سرمایہ پر کاری ضرب لگی، لیکن فوری طور پر عرب اتحاد کے پُرشور نعروں اور پُرجوش مظاہروں نے اس دشواری کو زیادہ محسوس نہیں ہونے دیا، اس اثنا میں مصریوں کی ایک بڑی جماعت شام میں منتقل ہوگئی اور مختلف پیشوں میں شامیوں کے ساتھ مصری بھی نظر آنے لگے، مزاج کے اعتبار سے مصری سہل پسند، تن آسان اور خوش باش ہوتے ہیں، اہل شام اس کی ضد ہیں چنانچہ پہلے ذوق و افتادِ طبع کی سطح پر اور پھر معاشی سطح پر ٹکراؤ محسوس کیا جانے لگا، لیکن دوسری طرف ناصری اصلاحات سے یہ امیدیں تھیں کہ جلد ہی صورت حال سنبھل جائے گی اور زیادہ سے زیادہ شامیوں کو فائدہ پہنچے گا، ناصر نے ایک سیاسی غلطی یہ کی شامی فوج کو مصر بلایا، نہیں اور دوسری طرف شامی کرنسی کو جوں کا توں رہنے دیا، ناصر نے یہ بھی محسوس کیا کہ شام کے عوام چونکہ اس کے ساتھ ہوں گے اس لئے کسی فوجی انقلاب کا خطرہ نہیں، لیکن خمابیہ، اور دوسرے مفاد پرست عناصر کی قوتوں کا انھوں نے غلط اندازہ کیا اور اس حقیقت کو وہ فراموش کر بیٹھے کہ یہ عناصر باہر کے ناصر دشمن عناصر سے گٹھ جوڑ کر کے کسی وقت بھی صورت حال کو بدل دے سکتے ہیں۔

چنانچہ ستمبر ۶۱ء کا فوجی انقلاب سرمایہ داری نظام کی فتح تھی، اس انقلاب سے ناصر کی آنکھیں کھلیں اور انھوں نے مصری سرمایہ داروں کی طاقت کم کرنے کا پروگرام شروع کیا، ناصری اصلاحات کے نتائج شام میں ابھی بارآور نہیں ہوئے تھے لیکن ایک اندازہ ہوگیا تھا کہ ان اصلاحات سے غریب مزدوروں، کسانوں اور نچلے متوسط طبقہ والوں کو بہت فائدہ ہوگا، ناصر کو یہ امید تھی کہ جب شامی عوام کو اس بات کا احساس ہوگا تو وہ اپنے ملک کی رجعت پرست طاقتوں کے مقابلہ میں منظم ہو جائیں گے، یہ امید آج بھی ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ۲۸ مارچ کے فوجی انقلاب سے اس امید کی نشان دہی ہوتی تھی، لیکن اس امید کی بنیاد ابھی کمزور ہے اور عرب سوشلزم کا تصور

بھی اہل شام کے ذہنوں میں صاف نہیں ہے، ۲۸ مارچ سے لے کر اب تک جو رجحانات سامنے آئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب تک ان رجحانات میں کوئی ہم آہنگی نہیں پیدا ہوتی، یا کوئی ایک رجحان اتنا مقبول نہیں ہو جاتا کہ دوسرے رجحانوں کا زور دب جائے، شام میں سیاسی استحکام ناممکن ہے، واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت شامی فوج میں اور اسی طرح اہل شام میں واضح طور پر تین طرح کے رجحانات کام کر رہے ہیں۔

۱۔ رجعت پرست قوتیں جو تجارت وصنعت میں ریاست کی مداخلت کو ناپسند کرتی ہیں اور مصر سے اتحاد کی، خواہ اس کی نوعیت کچھ بھی ہو، شدید مخالف ہیں۔

۲۔ بائیں بازو کی قوتیں جو مصر سے اتحاد کی خواہاں تو ہیں لیکن کسی متحدہ عرب جمہوریہ میں شام کے 'ادغام' کی مخالف ہیں۔

۳۔ بائیں بازو کی وہ قوتیں جو عرب اتحاد اور عرب سوشلزم کی حامی ہیں اور عرب نیشنلزم کے نام پر مصر سے اس طرح متحد ہونا چاہتی ہیں کہ 'من وتو' کا کوئی امتیاز باقی نہ رہے۔

جن لوگوں نے ۲۸ مارچ سے لے کر ۱۴ اپریل تک کے اخبارات پڑھے ہیں اور جن کی نظر شام کے واقعات پر رہی ہے انھیں معلوم ہوگا کہ ان رجحانات کا تصادم اس منزل پر پہنچ گیا تھا کہ شام میں خانہ جنگی کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا، اس بار پہلی مرتبہ یہ بات صاف ہو کر سامنے آ گئی کہ شامی فوج میں نظریاتی یکجہتی نہیں، حلب، حمص اور انطاکیہ وغیرہ شہروں میں مصر اور شام کے اتحاد کے حق میں جو مظاہرے ہوئے اور جس طرح شہریوں، پولیس اور فوج کے ایک خاص عنصر کا اتحاد فکر ثابت ہوا اس میں ناصر کی معمولی سی ہمت افزائی یا کسی طرح کی فوجی امداد شام کو خانہ جنگی میں مبتلا کر سکتی تھی، لیکن ناصر نے ایک بار پھر تدبر اور سیاسی ہوش مندی کا ثبوت دیا اور شام کے معاملات میں اگرچہ حلب کے "آزاد فوجی افسروں" کی طرف سے امداد طلب کی گئی، کسی قسم کی مداخلت نہیں کی، کہا جاتا ہے کہ ناصر نے حلب کے اس فوجی عنصر کی جلد بازی اور ناتجربہ کاری کو پسند نہیں کیا، ناصر کو اس کا تجربہ ہے کہ اس کے نوجوان، بے صبر اور جوشیلے حامی ان کے اتنے ہی مخالف ہیں جتنے کہ چالاک رجعت پرست دشمن، بیرونی امداد سے مایوس ہو کر اور دمشق کے ہائی کمان کی طاقت کا اندازہ کر کے حلب والوں نے مجبوراً

کرلیا اور حمص میں جاکر اس شرط پر ہتھیار ڈال دئے کہ جلد ہی ملک میں ریفرنڈم کرایا جائے کہ اہلِ شام مصر سے اتحاد چاہتے ہیں یا نہیں، پھر ایک نئے فوجی ہائی کمان کی تشکیل ہوئی، چھ سات فوجی افسر جو ۲۸ مارچ کے انقلاب میں پیش پیش تھے شام چھوڑ کر سوئٹزرلینڈ جانے پر مجبور ہوئے، نئے ہائی کمان کی پالیسی مبہم اور بعض باتوں میں متضاد ہے اور اب ایک ہفتہ سے اُس ریفرنڈم کا ذکر بھی نہیں کیا جاتا جس کا تصفیہ حمص کی فوجی کانفرنس میں ہوا تھا، نیا ہائی کمان دستور سازی کی باتیں کرتا ہے اور جمہوری نظام کی تشکیل کا یقین دلاتا ہے، دوسری طرف مزدوروں اور کسانوں کے مفاد کا نام بھی لیتا ہے اور لوٹ کھسوٹ کرنے والی طاقتوں کو انتباہ دیتا ہے۔ ۱۳ اپریل کی خبر ہے کہ ناظم قدسی جو اس انقلاب سے پہلے صدر تھے، اب پھر صدر بنا دئے گئے ہیں لیکن اب تک یہ بات صاف نہیں ہے کہ کیا حقیقی اقتدار و اختیار انھیں سونپا گیا ہے یا نہیں۔ میرا خیال ہے کہ چونکہ ابھی سیاسی صورت حال میں استحکام کی صورت نہیں پیدا ہوئی ہے، اس لئے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کل کیا ہوگا اور شام اپنی آزمائشوں سے کس طرح عہدہ برا ہوگا۔

شام اور اسرائیل

پچھلے دنوں شام اور اسرائیل میں زبردست فوجی جھڑپ ہوئی، یہاں تک کہ اسرائیل کو ہوائی طاقت کا استعمال کرنا پڑا، اس معرکے کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اسرائیل اس بات پر تُلا ہوا ہے کہ وہ اپنے سائنٹفک وسائل سے فائدہ اٹھا کر دریائے اُردن کے پانی کے ایک معتد بہ حصہ سے اپنے علاقے کے صحرا کو سیراب کرے۔ کیونکہ بغیر اس کے غذائی لحاظ سے وہ خود مکتفی نہیں ہو سکتا، اس کے لئے عرصہ سے وہ ایک اسکیم پر کام کرتا رہا ہے اور لاکھوں روپیہ صرف کر چکا ہے، یہ منصوبہ تقریباً مکمل ہو چکا ہے، اس کی کامیابی و ناکامی اس کے لئے ایک اہم مسئلہ ہے اور دریائے اردن کا پانی اس کے لئے آبِ حیات سے کم نہیں، طبریہ کی جھیل اس دریا کا منبع ہے جو شام کی سرحد سے بھی ملتی ہے اور جہاں پانی کو پمپ آوٹ کرنے کے لئے اس نے مشینیں نصب کی ہیں، اس کے ٹھیک مقابل میں پہاڑیوں پر شام کی توپیں نصب ہیں، یعنی شام کسی وقت بھی اسرائیل کے اس "منبع حیات" کو تباہ و برباد کر سکتا ہے، لیکن دوسری طرف اس کے معنی ایک عمومی جنگ کے ہوں گے اور

اگر شام تنہا میدان میں رہتا ہے تو اسرائیل کی فوجی طاقت اتنی ہو کہ اسرائیلی فوجیں آٹھ گھنٹے میں دمشق پہنچ سکتی ہیں۔ عربوں کے نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو ان کے لئے اسرائیل کا یہ منصوبہ سیاسی اور معاشی دونوں نقطۂ نظر سے مہلک ہے۔ دریائے اردن کا پانی کم کرنے سے یہ ہوگا کہ اردن کا ایک بہت بڑا علاقہ بنجر ہو جائے گا اور لاکھوں فلاح تباہ ہو جائیں گے، عربوں نے اگر اپنی تباہی خاموشی سے برداشت کرلی تو سیاسی اعتبار سے ان کی حکومتوں کی کمزوری ایک بار پھر عیاں ہو جائے گی دوسری طرف اسرائیل کو معاشی استحکام کے ساتھ ساتھ سیاسی فتح بھی حاصل ہوگی، الغرض دریائے اردن کے پانی کا مسئلہ عربوں اور اسرائیلیوں دونوں کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ بن گیا ہے

عرب اتحاد، عرب نیشنلزم، عربوں کے درمیان ایک ریاست کا وجود جو بیرونی مداخلت اور سیاسی و معاشی استعمار کی ایجنٹ ثابت ہو چکی ہے، جس کا قیام بے شمار عربوں کی موت اور تباہی کا رہین منت ہے، اور جو توسیعی منصوبے رکھتی ہے —— ان حقائق کے پیش نظر عرب ریاستیں اپنے باہمی اختلافات کے باوجود اس بات پر آمادہ معلوم ہوتی ہیں کہ اسرائیل کو وہ کسی قیمت پر برداشت نہیں کریں گی، یہی وجہ ہے کہ شام اپنے اردنی بھائیوں کی مدد کے لئے ہر طرح تیار ہے اور شام اور اسرائیل کی جھڑپ کے بعد عراق، مصر، اردن، سعودی عرب — یہاں تک کہ عرب لیگ نے اجتماعی طور پر یہ کہہ دیا کہ شام پر اگر اسرائیل کا حملہ ہوا تو یہ حملہ پوری عرب دنیا پر ہوگا۔ لیکن عرب دنیا کہاں تک اس یکجہتی کا عملی ثبوت دے گی، سخن درین است! یہ بات میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ عرب ملکوں میں، خاص طور سے ان کے حکمراں طبقوں میں باہم دگر جو اختلاف، حسد اور نفرت ہے، وہ عالم آشکارا ہے، دوست اس پر گریہ کناں ہیں اور دشمن خندہ زن، چنانچہ ۲۰ جنوری ۱۹۶۲ء کے "پوسٹ" (امریکہ) میں اس کا خاکہ یوں اڑایا گیا ہے:-

"ایک بچھو دریائے نیل پار کرنا چاہتا تھا، اس نے مینڈک سے کہا کہ اپنی پیٹھ پر سوار کر کے مجھے اس پار پہنچا دو، مینڈک راضی نہ ہوا، اس نے کہا "نہیں بھائی، بیچ دھارے میں پہنچ کر تم ڈنک مار دوگے اور میں ڈوب جاؤں گا" "تم کتنی غیر منطقی بات کہہ رہے ہو" — بچھو بولا — "اگر میں تمہارے ڈنک مار دوں گا تو کیا خود بھی نہ ڈوب جاؤں گا" چنانچہ

مینڈک تیار ہوگیا اور بچھو اس کی پیٹھ پر سوار ہوگیا۔ آدھی دور پہنچ کر بچھو نے ڈنک مار دیا۔ "میں نے پہلے ہی کہا تھا"۔۔۔ مینڈک چیخا۔۔۔ "تم نے ہم دونوں کو مار ڈالا، اس میں بھلا کیا منطق ہو سکتی ہے؟" "یہاں منطق کی کون پروا کرتا ہے؟" ڈوبتے ہوئے بچھو نے جواب دیا۔۔۔ "یہ مشرق وسطیٰ ہے!"

اسرائیل، فرانس ۔۔۔ اور الجزائر

الجزائر اور فرانس میں معاہدہ ہوگیا، اور الجزائر کے مجاہدین سات سال سے آزادی کی جو لڑائی لڑ رہے تھے وہ بند ہوگئی، اس صدی میں کسی محکوم قوم نے اپنے بدیسی دشمن کے خلاف اتنے طویل عرصہ تک ایسی شاندار جنگِ آزادی نہیں لڑی ہے، کیسا عزم اور کتنا یقین رہا ہے الجزائری قوم کو اپنے مقصد کی سچائی پر، اس کی ترجمانی سرفروشانِ الجزائر سے خطاب کرتے ہوئے نازش پرتاپ گڑھی نے یوں کی ہے ؎

تمہارا ذوق نظر کام کر گیا آخر ۔۔۔ لہو کے داغ مہکتے ہوئے گلاب بنے
زمانہ دیکھ رہا ہے کہ الجزائر میں ۔۔۔ زمیں کے ذرّے جو ابھرے تو آفتاب بنے

جب جنگ بندی سے متعلق یہ معاہدہ ہوا تو اگرچہ ہم نے دیگال کو سراہا اور اس کی مصلحت اندیش جرأت کو داد دی، لیکن یہ شبہ بھی تھا کہ نہ معلوم صدر جمہوریہ فرانس نے یہ معاہدہ الجزائری قوم پرستوں سے کیا ہے یا خفیہ فوجی تنظیم (OAS) سے، لیکن بعد کے واقعات سے یہ ثابت ہوگیا ہے کہ دیگال کی نیت صاف ہے اور واقعی اس نے الجزائریوں کے حکومت خود اختیاری کو تسلیم کرکے فرانسیسی قوم کی ترجمانی کی ہے، الجزائر کے بڑے شہروں میں جہاں یورپینوں کی خاصی تعداد ہے. OAS کے ہاتھوں اگرچہ آگ اور خون کا بازار گرم ہے اور ایسی صورت حال پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ الجزائری مسلمان مشتعل ہوں اور انتقام کی مہم شروع کریں، تاکہ فرانسیسی فوج کی ہمدردیاں یوروپینوں کے ساتھ ہو جائیں اور الجزائر میں خانہ جنگی شروع ہو جائے لیکن حیرت ہے قومی تحریک کے اس ہمہ گیر اثر پر جو اسے ایک ایک الجزائری مسلمان پر، خواہ وہ نوجوان ہو یا بوڑھا، حاصل ہے اور لائق صد تحسین ہے وہ ڈسپلن جو الجزائر کی پوری قوم میں پائی جاتی ہے، کہ OAS کو آج تک اپنے اس منصوبہ میں کامیابی نہیں حاصل ہو سکی ہے، الجزائر میں جو عارضی

انتظامیہ قائم ہوئی ہے اس کا چیرمین ایک مسلمان عبدالرحمن فارس ہے، انتظامیہ میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور "مقامی فوج" کا کمانڈر ایک مسلمان ہی ہے جس پر استصواب رائے تک الجزائر میں نظم وضبط قائم رکھنے کی ذمہ داری ہوگی، الجزائر میں صدر دیگال کا نمائندہ موسیو کرسچین فوشے ایک دیانت دار اور جری شخص ہے، چنانچہ باب الوادی اور آوران میں OAS پر جو کچھ گزری ہے اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ دیگال اس خفیہ تنظیم سے نپٹنا چاہتا ہے۔

الجزائر کی آزادی سے یورپ، بحیرۂ روم اور شمالی افریقہ کی سیاست پر جو اثر پڑے گا اس کے آثار ابھی سے ظاہر ہونے لگے ہیں، لیکن عربوں کے نقطۂ نظر سے اس کا جو اثر اسرائیل اور فرانس کی دوستی پر پڑے گا وہ دلچسپ اور لائق توجہ ہے۔ جن لوگوں کی نظر رفتار عالم پر رہتی ہے انہیں یہ معلوم ہوگا کہ ۱۹۵۴ء سے لے کر اب تک فرانس نے اسرائیلوں کے کاز کو اپنا رکھا تھا، اسرائیل کو تقریباً سارے فوجی اسلحے اور ساز وسامان فرانس ہی فراہم کرتا تھا، ۱۹۵۶ء میں جب اسرائیل نے سینائی کے صحرا میں پیش قدمی کی تو یہ فرانسیسی ہوائی جہاز ہی تھے جو نہر سوئز کی طرف بڑھنے والی فوج کی حفاظت فضا میں کر رہے تھے، اور مصر کے متوقع جوابی حملہ کی صورت میں اسرائیل کی سرحدوں، شہروں اور فوجی اڈوں کے دفاع کے لئے تیار تھے، الغرض عرب دشمنی میں فرانس اسرائیل سے کسی طرح کم نہیں تھا، سبب یہ تھا کہ صدر ناصر نے اپنی استطاعت کے مطابق الجزائری جانبازوں کی امداد کے لئے اپنے آپ کو، پوری مصری قوم کو اور عرب قومیت کی پوری تحریک کو وقف کر رکھا تھا، لیکن اب الجزائر میں جنگ بندی معاہدہ کے بعد فرانس اور عرب ریاستوں میں سمجھوتے اور اشتراک کے امکانات پیدا ہو رہے ہیں، اس سلسلہ میں یہ بات اہمیت رکھتی ہے کہ پچھلے دنوں طبریہ کی جھیل کے واقعہ سے متعلق شام کی شکایت پر سیکیورٹی کونسل میں جو مباحثہ ہوا اس میں فرانسیسی نمایندے نے بڑی محتاط اور نپی تلی تقریر کی، اس کے علاوہ عربوں کی طرف سے محتاط خیر سگالی کا یہ مظاہرہ ہوا کہ قاہرہ میں جاسوسی کے الزام میں جن فرانسیسی افسروں پر مقدمہ چل رہا تھا وہ رہا کر دئے گئے، کہا جاتا ہے کہ مصر نے بن بیلا کے کہنے پر یہ اقدام کیا ہے، لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود صدر ناصر نے الجزائر میں فرانس کی نئی پالیسی کا خیر مقدم فرانسیسی قیدیوں

کی رہائی سے کیا ہو، بہرحال فرانس اور عرب ریاستوں کی طرف سے اس قسم کے جذبہ کا اظہار اسرائیل کے لئے پریشانی کا سبب بن گیا ہے، عرب ملکوں میں یہ بات کھلم کھلا اور زور دے کر کہی جا رہی ہے کہ فرانس کو اسرائیل سے دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنا چاہیئے اور لبنان کو چاہیئے کہ وہ عرب لیگ کے ممبر کی حیثیت سے فرانس سے اپنے سیاسی، تہذیبی اور مذہبی تعلقات سے فائدہ اٹھائے، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس وقت لبنان ہی ایسا ملک ہے جو عربوں اور فرانسیسیوں کو ایک دوسرے سے قریب لا سکتا ہے۔

بنگلہ کے لئے نیا رسم الخط

مارچ کے آخری دنوں میں ایک پریس کانفرنس میں ایک اخبار نویس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ کیا اردو اور بنگلہ کے لئے ایک مشترک رسم الخط اختیار کرنے سے پاکستان کے دونوں حصوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے میں مدد ملے گی، صدر ایوب نے کہا کہ "اگر آپ مجھ سے پوچھیں اور اگر میں مشرقی پاکستان کا باشندہ ہوتا تو کلکتہ کی گرفت اور اس کے تمدنی اثر سے رہائی حاصل کرنے کے لئے میں بنگالی رسم الخط بدل ڈالتا، اس سے مشرقی پاکستان کے باشندوں کو ہندو تمدن اور دوسرے طرح کے دباؤ سے زبردست نفسیاتی آزادی حاصل ہو جائے گی" یہ خبر اور صدر ایوب کا یہ خیال اس لحاظ سے اہم اور دلچسپ ہے کہ ہمارے اپنے دیس میں ہم آہنگی INTEGRATION کے سلسلے میں اسی طرح کی باتیں کہی گئیں، اور کہی جا رہی ہیں اور مشترک رسم الخط کی بات تو سرکاری حلقہ کے ذمہ دار حضرات کی طرف سے بھی پرزور لہجہ میں کہی گئی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس خیال میں بڑی جان ہے، اور یہ فکر اپنے اندر وزن رکھتا ہے نیشنلزم کے تصور کو مشترک رسم الخط سے بڑی تقویت ملتی ہے اور جذباتی ہم آہنگی کا امکان بہت قوی ہو جاتا ہے، کوئی قوم یا کسی قوم کا کوئی طبقہ اگر اپنے ماضی سے جسے وہ اپنی تاریخ کا تاریک دور یا ایسا دور جس پر فخر نہیں کیا جا سکتا اپنا رشتہ توڑنا چاہے تو وہ اپنی زبان کا رسم الخط بدل دے، بہت بڑی حد تک اس کا مقصد پورا ہو جائے گا، جدید ترکی کی نظیر ہمارے سامنے ہے، ترکی کی نئی نسل اپنی تاریخ کے اسلامی دور اور اس کے کارناموں سے بے خبر ہے، اسلامی دنیا کے افکار و خیالات سے بھی وہ بے نیاز ہے، ترکی کے

قوم پر لوگوں نے اپنا کام ...

ہیں جہاں ایک ہی مذہب کے لوگ رہتے ہوں اور جہاں صرف ایک زبان ہو یہ کام کسی قدر آسان ہوتا ہے لیکن ہندوستان ایسے عظیم ملک میں جہاں مختلف زبانیں ہیں، مختلف مذاہب ہیں، مختلف تہذیبی و لسانی اقلیتیں ہیں، یا پاکستان ایسے ملک میں جس کے دونوں حصے ایک دوسرے سے نہ صرف یہ کہ جغرافیائی اعتبار سے سینکڑوں میل دور ہیں بلکہ لسانی اور تہذیبی مزاج اور افتادِ طبع اور تاریخی خصوصیات کے اعتبار سے بھی دور اور بہت دور ہیں؛ یہ کام بہت دشوار اور انصاف کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ اندھی قوم پرستی سے مغلوب ہو کر ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ تنوع میں بھی ایک حسن ہے، آخر کیا وجہ ہے کہ اس حسن کی مٹی خراب کی جائے، کیا دنیا میں اس کی مثالیں نہیں ملتیں جہاں تہذیبی اور لسانی اقلیتوں کو برقرار رکھا گیا ہے اور اس کے باوجود سیاسی اتحاد قائم ہے' اردو والوں کا جو جذباتی تعلق عربی رسم الخط سے ہے اس سے کہیں زیادہ بنگال والوں کو بنگلہ رسم الخط سے ہے، بنگلہ میں ایک پرمغز اور جاندار لٹریچر ہے، بنگال والے بنگلہ کو نہیں چھوڑ سکتے، صدر ایوب کو یاد ہوگا کہ جب ایک مرتبہ پاکستان کی زبان اُردو تسلیم کرلی گئی تھی تو ایک لاکھ سے زیادہ آدمی "ناظم الدین حکومت مردہ باد" کے نعرے لگا رہے تھے اور ناظم الدین کو کراچی جاکر یہ حکم منسوخ کرانا پڑا تھا، سید سلیمان ندوی مرحوم کے ساتھ اس سلسلہ میں جو ناروا سلوک ڈھاکہ میں کیا گیا تھا، وہ بھی صدر موصوف کو یاد رکھنا چاہیئے، اور حقیقت تو یہ ہے کہ اس قسم کے واقعات ہر اس جماعت کو یاد رکھنے چاہئیں جو طاقت کے بل بوتے پر کسی زبان یا اس کے رسم الخط کو بدلنے کا خیال کرے۔

ض، ح، ف

۱۴ اپریل ۱۹۶۲ء

توسیعی پروگرام

مارچ کے شمارے میں اساتذہ کی تربیت سے متعلق دولت مشترکہ کی سرگرمیوں کا اجمالی طور پر جائزہ لیتے ہوئے تیسرے قومی منصوبے کے دوران میں مختلف نوعیت کے اساتذہ کی ضرورت اور فراہمی کے امکانات و اقدامات پر کسی قدر روشنی ڈالی گئی تھی۔ لیکن اساتذہ کی تربیت کا مسئلہ محض تعداد کا معاملہ نہیں ہے بلکہ استعداد کا سوال بھی ہے مختلف مدارج پر مخصوص علوم و فنون اور حرفوں کے واسطے نئے اساتذہ تیار کرنے کے ساتھ ساتھ برسرِ کار اساتذہ کی اہلیت اور واقفیت میں اضافہ بھی ضروری ہے۔ علم نہ صرف ایک بحرِ ناپید اکنار ہے بلکہ ہر دم رواں دواں بھی ہے۔ اگر اساتذہ کو ایک مرتبہ تربیت دینے کے بعد یہ باب ہمیشہ کے لئے تمت بالخیر کر دیا جائے تو یہ رویہ نہ صرف کم مائیگی پر دلالت کرے گا بلکہ اساتذہ دقیانوس بھی ہو کر رہ جائیں گے۔ انفرادی طور پر ممکن ہے کہ چند ہوشمند وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے کی سعی کرتے رہیں لیکن جماعتی حیثیت سے پوری برادری یقیناً پچھڑ جائے گی۔ اُن کی محدود واقفیت سے ایک لقمہ تر یہ صبح گاہی' ہونے کے امکانات بھی معدوم ہو جائیں گے اور ممکن ہے کہ اپنی فرسودگی کی بنا پر گمراہ کن ثابت ہو۔ آزادی کے تقاضوں نے ہمیں زندگی کے تمام شعبوں میں عملِ پیہم کی دعوت دی۔ تعلیم کا منصب سب سے مقدم ٹھیرا۔ ابھی تک اساتذہ کے تربیتی اداروں میں بندھے ٹکے نظام کے ماتحت نئے اساتذہ میانہ روی کے ساتھ ڈھل کر نکل رہے تھے۔ ان کی رفتار سست تھی اور معیار پست۔ اس صورت میں کسی قدر خانہ پری تو ضرور ہو رہی تھی لیکن ایک جمہوری مملکت کے لئے شہری تیار کرنے والوں کا یہ سطحی معیار، پرانی معلومات اور ناعاقبت اندیشانہ کردار کسی طور بھی انہیں اپنے فرائض سے عہدہ برآ کرانے کے لائق نہ تھا۔ اس لئے پہلے قومی منصوبے کے اختتام پر ہی اساتذہ کی تربیت کے توسیعی

[illegible]
کے تحت دوران ملازمت میں اساتذہ کی مزید تربیت کا کام آتا ہے تاکہ اساتذہ اپنے آپ کو اپنے منصب کے لائق رکھ سکیں۔ ان کا علم تازہ رہے۔ وہ تعلیمی دنیا کے نئے رجحانات اور میلانات سے آشنا رہیں۔ خود بھی جلا پائیں اور نونہالانِ وطن کو بھی روشنی بخشیں۔ اس کام کی ذمہ داری سپرد کرنے کے لئے اساتذہ کے تربیتی اداروں کے علاوہ اور کون موزوں ہو سکتا تھا کیونکہ یہ ادارے ہی مدارس کے نبض شناس ہوتے ہیں اور انھیں اپنی ذمہ داری نباہنے کے لئے مدرسوں سے لین دین لازمی طور پر رکھنا پڑتا ہے۔ ادھر ایک عرصے سے یہ تربیتی ادارے بہت کچھ الگ تھلگ رہ کر اپنا کام کرنے لگے تھے اور اس بنا پر وہ ایک جسدِ بے روح ہوتے جا رہے تھے۔ ۱۹۵۳ء میں ثانوی تعلیم کے کمیشن نے یہ بات، واضح طور پر کہی تھی کہ اساتذہ کی تربیت کا انتظام خواہ کتنا ہی عمدہ کیوں نہ ہو وہ بجائے خود اعلیٰ معیار کے استاد فراہم نہیں کر سکتا۔ اساتذہ کی اہلیت میں صرف اسی وقت اضافہ ہو سکتا ہے جب کہ وہ اپنے تجربے کا خود بینی و خود آگاہی کے ساتھ برابر تجزیہ کرتے رہیں۔ اس بنا پر ثانوی مدارس کے کمیشن نے اساتذہ کی تمام و کمال تربیت کی ذمہ داری، تربیتی اداروں کے سر ہی رکھی تھی۔

مرکزی حکومت نے ۱۹۵۵ء میں منتخب تربیتی اداروں میں توسیعی پروگرام کے مرکز قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ضروری سامان، مناسب رہنمائی، اور معقول مالی امداد کی فراہمی میں امریکا کے فورڈ فاؤنڈیشن، اور ٹیکنیکل کواپریشن مشن، کی بروقت اعانت سے اس اسکیم کو عملی جامہ پہنایا جا سکا اسی سال توسیعی پروگرام کے تیئیس مرکز قائم کیے گئے۔ ان میں سے ایک جامعہ ملیہ اسلامیہ کا استادوں کا مدرسہ بھی تھا۔ دو سال بعد اکتیس مرکز اور بڑھائے گئے۔ مرکزوں کا انتخاب تربیتی اداروں کی اہمیت اور حلقۂ اثر کے پیش نظر کیا گیا تھا۔ انتظامی سہولتوں کی خاطر تمام مرکز پانچ حلقوں میں تقسیم کیے گئے۔ ہمارے ملک میں تین طرح کے تربیتی ادارے قائم ہیں۔ سرکاری، غیر سرکاری اور یونیورسٹی کے تحت۔ موجودہ چون مرکزوں میں تیس سرکاری اور چودہ غیر سرکاری اداروں سے منسلک ہیں۔ اور دس مختلف یونیورسٹیوں کے شعبہ تعلیم سے وابستہ ہیں، ہر ایک توسیع مرکز کا انتظام

اپنے سرپرست ادارے کے سپرد ہے۔ اس اسکیم کے ابتدائی زمانے میں توسیعی پروگرام کے تمام مرکز ثانوی تعلیم کی کل ہند کونسل کے تحت کام کرتے تھے۔ یہ ادارہ تمام مالی امداد فراہم کرتا، تمام مرکزوں کی سرگرمیوں میں وحدتِ کار کی گنجائشیں نکالتا اور عام رہنمائی کے فرائض پورے کرتا۔ اپریل ۱۹۵۹ء میں اس ادارے کی ازسرِنو تشکیل کردی گئی اور اب یہ تمام امور ثانوی تعلیم کی ڈائریکٹریٹ آف ایکسٹینشن پروگرامس کے تحت آگئے ہیں۔ یہ ادارہ گزشتہ سال تک مرکزی وزارتِ تعلیم کے ماتحت تھا۔ اس نئے نظام میں توسیعی پروگرام کے مرکزوں کی تنظیمی ذمہ داروں کو سنبھالنا دشوار تھا۔ لہٰذا متعلقہ اداروں کو ہی براہِ راست انتظامی ذمہ داری سونپ دی گئی۔ تاہم مالی کفالت اس وقت بھی مرکزی حکومت کے ذمہ رہی۔

امسال یہ ڈائریکٹیٹ پھر ایک آزاد ادارے نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن کا جزو بنا دیا گیا ہے۔ افسرِ اعلیٰ اپنے یہاں کے شعبۂ توسیعی پروگرام کا اعزازی ڈائریکٹر ہوتا ہے۔ وہ تمام کام کی رہنمائی اور نگرانی کا ذمہ دار ہے۔ ہر مرکز میں ایک کوارڈینیٹر ہوتا ہے جو اس پروگرام کے روحِ رواں کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ تمام مشاغل کی تنظیم، ان کی تشکیل اور تعمیل کرتا ہے۔ وہ تربیتی ادارے، مدارس اور محکمۂ تعلیم کے مابین اشتراکِ عمل کی راہیں استوار کرتا ہے۔ کوارڈینیٹر کے علاوہ ہر ایک مرکز کا ایک مختصر دفتری عملہ ہوتا ہے۔ ہر ایک مرکز میں کتابوں، توضیحی سامان، اور جیپ یا اسٹیشن ویگن پر مشتمل تقریباً ایک لاکھ روپے کی مالیت کا سامان امریکا کے ٹیکنیکل کوآپریشن مشن، کی اعانت سے وصول ہوا ہے۔ سرپرست ادارے سے اپنے مرکز کو دفتر فراہم کرنے کی توقع کی جاتی ہے اور ریاستی سرکار سے درخواست کی جاتی ہے کہ پانچ ہزار روپے سالانہ کتابوں کے اضافے کے لئے مہیا کرے۔ اب تک تمام اخراجات مرکزی حکومت نے فورڈ فاؤنڈیشن سے حاصل شدہ امداد کی رقم سے پورے کئے ہیں۔ ہر ایک مرکز کے سالانہ اخراجات کے لئے تقریباً بیس ہزار روپے کی رقم فراہم کی جاتی ہے۔

مزید برآں ہر ایک ریاست سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ چھ ہزار روپے سالانہ، مختلف مشاغل میں شرکت کرنے والے اساتذہ کے خرچ اور اس سلسلے کے دوسرے مصارف کے

لئے عنایت کرے گی۔ ابتدا میں ہر ایک مرکز کا دائرہ عمل پچاس کے قریب ثانوی مدارس تجویز ہوئے تھے لیکن اسکیم کی توسیع کے ساتھ ساتھ مرکزوں کا اپنا دامن بھی وسیع ہوتا گیا ہے اور اب بعض ریاستوں میں سب ہی ثانوی مدارس کسی نہ کسی مرکز سے منسلک کر دئے گئے ہیں۔ یوں تیرہ فیصدی سے لے کر چھیانوے فیصدی مدارس تک مختلف ریاستوں میں ان مرکزوں سے مستفید ہو رہے ہیں۔

توسیعی پروگرام میں متنوع مشاغل شامل ہیں۔ مختصر اور طویل اعادی نصاب کا انتظام کیا جاتا ہے۔ سیمینار ہوتے ہیں۔ کانفرنس بلائی جاتی ہے۔ کیمپ لگائے جاتے ہیں۔ ورکشاپ کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ آپس میں تبادلہ خیال کے مواقع فراہم کئے جاتے ہیں۔ تعلیمی مطالعہ کے لئے حلقے اور کلب قائم کئے جاتے ہیں۔ مشاورتی کمیٹیاں بلائی جاتی ہیں۔ توضیحی سامان کا استعمال سکھایا جاتا ہے اور اس کے ذریعے تدریس کو بہتر اور موثر بنانے کے گُر بتائے جاتے ہیں۔ مختلف موضوعات پر واقفیت میں اضافہ کرنے کی غرض سے اور تعلیم کے نئے طریقوں اور تجربوں سے روشناس کرانے کے لئے کتب فراہم کی جاتی ہیں۔ ماہرین فن سے تقاریر کرائی جاتی ہیں اور نمونے کے سبق پڑھا کر دکھائے جاتے ہیں۔ تعلیمی نمائشیں کی جاتی ہیں اور معلوماتی کتابچے شائع کئے جاتے ہیں۔ توسیعی پروگرام کے مرکز اپنے متعلقہ مدارس کی خواہش اور ضرورت کے مطابق اس نوعیت کے کام کیا کرتے ہیں

ہر ایک مرکز کی ایک مشاورتی کمیٹی بھی ہوتی ہے جو سرپرست ادارے کے افسر اعلیٰ کے علاوہ ریاست کے محکمہ تعلیم، مدارس اور تربیتی اداروں کے اساتذہ اور دیگر تعلیمی حلقوں کے نمائندوں پر مشتمل ہوا کرتی ہے۔ اس کے علاوہ مرکزی ڈائرکٹریٹ میں ماہرین فن کا ایک عملہ بھی موجود ہے جو ضرورت کے مطابق مرکزوں کی رہنمائی کرتا ہے۔ ہر سال ڈائرکٹریٹ کی طرف سے سال بھر کے کام کا جائزہ لینے اور نئے مشاغل پر غور کرنے کی غرض سے تمام مرکزوں کے اعزازی ڈائرکٹر اور کوارڈی نیٹر صاحبان کی ایک کانفرنس منعقد کی جاتی ہے۔ امسال یہ کانفرنس مارچ کے تیسرے ہفتے میں دہلی میں بلائی گئی۔ امید ہے کہ اس کانفرنس سے کچھ مفید نتائج برآمد ہوں گے۔

توسیعی پروگرام کے پھیلنے سے یہ اندازہ تو ضرور ہوتا ہے کہ تعلیمی حلقے اسے مفید سمجھتے ہیں لیکن اس کی افادیت کے بارے میں ابھی شواہد نہیں ملتے۔ یہ پروگرام اس وقت اپنی شیرخوارگی

کا فاصلہ طے کر رہا ہے اور اس عہد کی تمام مشکلات سے دوچار ہونا ایک قدرتی امر ہے۔ ابھی ہمارے اساتذہ یہ نہیں محسوس کرتے کہ یہ ان کا اپنا کام ہے بلکہ اسے توسیعی پروگرام کے مرکزوں کی تقریبات تصور کرتے ہیں۔ ان کی شرکت عموماً بادلِ ناخواستہ اور واجبی ہوا کرتی ہے۔ اس رویہ میں کچھ تو شک و شبہ کو دخل ہے لیکن یہ بھی درست ہے کہ ابھی ہمارے مرکز اپنی افادیت کو پورے طور پر ثابت بھی نہیں کر پائے ہیں۔ ثانوی مدارس کے اساتذہ کی بوجوہ مایوسیاں اور محرومیاں بھی ان کے اندر آمادگی کار پیدا ہونے نہیں دیتیں۔ تاوقتیکہ مدارس کے اساتذہ کو توسیعی پروگرام کے مشاغل کی شرکت بدیہی طور پر منفعت کا باعث نہ ہو، ان میں خلوصِ کار پیدا ہونے کی گنجائش موجودہ صورت حال میں بہت کم نظر آتی ہے۔ آج کا پریشان حال مدرس ہر ایک شے پر بابا ہیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں، کہہ کر ہی نظر ڈالتا ہوا ملتا ہے اور غیر شعوری طور پر ہر چیز کو پرکھنے کا معیار اس کے نزدیک یہی ہوگیا ہے۔ اس بات پر ہمیں استاد سے نہ خفا ہونے کی ضرورت ہے اور نہ مایوس۔ یہ تو حالات کی ستم ظریفی ہے۔ ہمیں مطمئن رہنا چاہیئے کہ ہمارا مستقبل خوش آیند ہے۔ تاہم توسیعی پروگرام کو اگر مقامی ضرورتوں کے پیش نظر پوری تن دہی کے ساتھ چلایا جائے تو کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ہوگا۔ اب تک اس معاملے میں ہم ناتجربہ کار اور نوآموز تھے۔ لہذا ہمارے کام کبھی کبھی محض سطحی بھی رہے۔ نئے کام کے جوش نے کبھی محض نمود و نمائش کی طرف بھی لگا دیا۔ ہم اپنی کارگزاریوں کو چھاپ کر مطمئن ہوگئے اور اپنے کام کی چھاپ ثانوی مدارس کے کاموں پر دیکھنے کی فکر نہ رہی۔ یہ کام وقتی نہیں ہے بلکہ مستقل جد و جہد چاہتا ہے۔ اس میں نہ نمود کی گنجائش ہے اور نہ جمود کی۔ ثانوی مدارس کے مدرسین کے علاوہ اس پروگرام میں جان ڈالنے والے تربیتی اداروں کے اساتذہ ہیں۔ دراصل اس کا دل و دماغ یہی لوگ ہیں۔ اپنی بصیرت سے مدرسین کے ذہن کے چراغ یہی حضرات روشن کر سکتے ہیں۔ ابھی تک کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ خدمت ان کے لئے اضافی اور ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ توسیعی پروگرام کے مشاغل بھی تربیتی اداروں کے اساتذہ کے فرائض منصبی میں باضابطہ اور

مستقل طور پر شامل کر دیئے جائیں اور یہ سب کارگذاری ان کے نظام الاوقات کا جزو ہو۔
اس طرح ان مشاغل پر خارجی ہونے کا گمان نہ رہے گا اور اساتذہ گراں بار بھی نہ ہونے
پائیں گے۔ ساتھ ہی ساتھ توسیعی پروگرام کے مرکز کو اپنے سرپرست ادارے کے ایک متعلقہ
شعبے کی حیثیت سے کام کرنے کے بجائے تربیتی ادارے کا ایک جزو لاینفک کی حیثیت
اختیار کر لینی چاہیئے۔ یہ دانہ اپنی ہستی کو مٹا کر ہی گل و گلزار بن سکے گا! پھر کوارڈینیٹر محض
روابط قائم کرنے والا ایک افسر نہ ہوگا بلکہ تربیتی ادارے میں رفیقوں کا رفیق بن کر رہ سکے گا
اس کی حیثیت میں کوئی امتیازی شان نہ رہے گی بلکہ صرف تقسیم کار کا معاملہ رہ جائے گا۔ اس
نظریاتی اور تنظیمی تبدیلی کے علاوہ توسیعی پروگرام کا فیض ابتدائی مدارس تک پہنچانے کی بھی شدید
ضرورت ہے۔ ابتدائی مدارس کے استاد ہمارے بنیادی معمار ہیں ان کی رہنمائی اور بھی ضروری
ہے خوشی کی یہ بات ہے کہ تیسرے پنج سالہ منصوبے میں ابتدائی مدارس کے اساتذہ کے لئے بھی
توسیعی پروگرام کی گنجائش ایک دوسرے نہج پر نکالی گئی ہے۔ بہرحال توسیعی پروگرام کا کام
اساتذہ کی تربیت کا ایک اہم جزو ہے۔ اور اس کی توسیع و ترقی سے ہمارے مدارس میں حیات نو
کے آغاز کی امید کی جا سکتی ہے۔

"معلّم"

تبصرہ و تعارف

آندھی میں چراغ

تبصرہ نگار: جناب ضیاء الحسن فاروقی

مصنف : خواجہ غلام السیدین

ناشر: انڈین اکیڈمی، ۲۹ نریندر اپلیس، نئی دہلی

سن طباعت: ۱۹۶۲ء - قیمت : سات روپے پچاس نئے پیسے

اقبال کا ایک شعر ہے ؎

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش جس کو حق نے دیئے ہیں انداز خسروانہ

ایسے مردان حق آگاہ انسانی تاریخ کے ہر اُس موڑ پر انسانیت کی خدمت کرنے کے لئے نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں، جہاں تہذیبیں غروب ہونے لگتی ہیں اور اُن انسانی قدروں کے جو تہذیبوں کی روح ہوتی ہیں، مٹ جانے کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں، زندگی، حقیقت یہ ہے کہ دیوانے کا ایک خواب ہے جس کی صحیح تعبیر کے خدوخال رفتہ رفتہ زمانے کے خم و پیچ سے ابھر کر سامنے آتے ہیں، انھیں دیوانوں کا عالم جذب ان خوابوں کا حامل ہوتا ہے جن سے انسانیت اور زندگی کی آبرو قائم رہتی ہے، یہ دیوانے دراصل فرزانے ہوتے ہیں، لیکن دنیا انھیں دیوانہ سمجھتی ہے، ان کی عارفانہ باتوں کو مجذوب کی بڑ تصور کرتی ہے، ان کے اعمال صالحہ کو سود و زیاں کے پیمانے سے ناپتی ہے، یہ قدروں کی باتیں کرتے ہیں تو وہ تمسخر کرتے ہیں، الغرض باطل پرستی کی اندھیری رات ہوتی ہے جس میں غیر انسانی قدروں کا طوفان اپنے شباب پر ہوتا ہے، لیکن یہ دیوانے آندھی اور طوفانی رات کی پروا کئے بغیر اپنا چراغ جلاتے رہتے ہیں، ہوا کے رستے میں شمع روشن کرنے کی اس جرأت کو بھٹکی ہوئی دنیا فعل عبث سے تعبیر کرتی ہے، لیکن تاریخ شاہد ہے کہ اگر یہ جرأت رندانہ' زمانے سے مفقود ہوتی تو مٹی کو لہو دے کر حنا بنانے

بنانے کی روایت اور نوکِ خار سے گل و لالہ کی رنگینی اُبلنے کے واقعات سے ہماری تاریخ محروم رہتی۔

سیدین صاحب نے اسی حقیقت کو اپنی کتاب کا موضوع بنایا ہے۔ یہ کتاب ایسے مضامین کا مجموعہ ہے جو مختلف وقتوں میں مختلف موقعوں کے لئے لکھے گئے تھے، یہ مضامین تین حصوں میں 'ابدی قدریں'، 'صحبت اہلِ صفا'، اور 'مستقبل کی پرچھائیاں' کے عنوانات کے تحت تقسیم کر دئے گئے ہیں، پہلے حصہ میں مہاتما بدھ، پیغمبر اسلامؐ، حضرت امام حسینؓ اور گرو نانک کے عارفانہ خیالات اور مذہبی تعلیمات کو اس انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ ان کی بنیادی قدریں ابھر کر سامنے آگئی ہیں، دوسرے حصہ میں اُن افراد کی سیرت کے ممتاز پہلو پیش کئے گئے ہیں جن سے مصنف متاثر ہوا ہے اور جن میں ہندوستان کی بعض نامور ہستیاں، مثلاً مہاتما گاندھی، مولانا آزاد، ڈاکٹر اقبال، جواہر لال نہرو اور ڈاکٹر ذاکر حسین، شامل ہیں اور بعض افراد ایسے ہیں جو مصنف کے عزیز اور بزرگ ہیں، تیسرا حصہ ان مضامین پر مشتمل ہے جن میں "ملک کے عام تعلیمی، سیاسی اور تہذیبی مسائل" سے بحث کی گئی ہے — مسائل جن کی جڑیں ماضی میں پیوست ہیں، لیکن جن کا سایہ مستقبل پر پڑ رہا ہے' ان مضامین میں بھی موضوعِ سخن' وہی اقدار ہیں جو حال' کی طوفان خیزیوں میں ہچکولے کھا رہی ہیں۔ ان اقدار کی حفاظت کا ساز و سامان نہ کیا گیا اور ہم وقت کے بہاؤ کے ساتھ بہتے چلے گئے تو اس ملک میں تہذیب و شرافت کا ماتم کرنے والے تو شاید کچھ لوگ مل جائیں لیکن ان کا چراغ جلانے والا شاید ہی کوئی ملے۔

کتاب کی تمہید کا عنوان "آندھی میں چراغ" ہے اور یہی کتاب کا عنوان بھی ہے۔ تمہید سے لے کر آخری مضمون "تہذیب کی حفاظت" تک چند بنیادی باتیں ہیں جنھیں مصنف نے کبھی تخیل کے سہارے، کبھی تاریخی حقائق کی تائید کے ساتھ، کبھی علمی و تہذیبی مسائل کے ضمن میں اور کبھی افراد کی معنوی شخصیت کے پردہ میں، بار بار بیان کی ہیں اور ہو سکتا ہے کہ بعض پڑھنے والوں پر یہ تکرار گراں گزرے، خود مصنف کو اس کا احساس ہے، چنانچہ کہتے ہیں:

"...... لیکن اس تکرار کی معذرت کیوں کروں؟ یہ میرے بنیادی عقائد ہیں جن پر زور دینا میرا فرض ہے۔ اگر یہ غلط ہیں تو ان کو ایک دفعہ بیان کرنا بھی نقصان دہ ہے۔ اگر صحیح ہیں

تو ان کو مختلف طریقوں سے دل میں بٹھانے کی کوشش قابلِ معافی ہے!"
دوسرے لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ بعض سچی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو بار بار کہنے کی ہوتی ہیں، اور کہنے والے کو اگر کہنے کا سلیقہ ہو تو مختلف انداز میں ایک ہی بات اس طرح کہی جا سکتی ہے کہ سننے والوں کو وہ ہر بار نئی معلوم ہو، پھر اگر تکرار سچائیوں اور اخلاقی قدروں کے بارے میں ہو تو شرمانے کی بھی ضرورت نہیں، اس لئے کہ ان کا ذکر اس غرض سے نہیں کیا جا رہا ہے کہ کسی سے کچھ مانگنا ہے، بلکہ مقصد کچھ دینا ہے، اسی لئے سخاوت اور فیاضی کی تکرار، کا شمار "اعمال صالحہ" میں ہوتا ہے اور سنہ ہی لوگوں کی اصطلاح میں "یہ تکرار" پیدا کرنے والے کی ایک صفت ہے، اس لئے اسے مرغوب ہے۔

سوال یہ ہے کہ وہ قدریں کیا ہیں جنھیں بار بار دہراتے اور زور دے کر کہتے رہنے کی ضرورت ہے، اور اس وقت دنیا میں اور ہمارے اپنے دیس میں وہ کون سے رجحانات ہیں، یا ایسا کون سا طوفان برپا ہے کہ راستہ نہیں دکھائی دیتا اور ان قدروں کا چراغ جلانا وقت کا ایک اہم تقاضا ہے، یہ دونوں سوال اہم ہیں، دنیا میں مختلف افکار و خیالات کے لوگ ہیں، مختلف فلسفے ہیں جو انسانی زندگی کی تشکیل پر اثر انداز ہو رہے ہیں، خالص مادی طرز فکر بھی ہے جو علم اور سائنس کی بے پناہ طاقتوں کے ساتھ پھیل رہا ہے، اس فکر کے مبلغین کے نزدیک ان سوالوں کا جواب کچھ اور ہوگا، "روحانیت محض" کے پرچارک بھی مل جائیں گے جو ان سوالوں کا جواب اپنے نقطۂ نظر سے دیں گے، اور ایسے لوگ بھی ہیں اور بڑی تعداد میں ہیں جو "مادہ" اور "روح" دونوں کے قائل ہیں اور ان کے متوازن اور خوشگوار امتزاج میں دنیا اور انسان کی فلاح اور نجات دیکھتے ہیں، ان کا جواب دوسروں سے مختلف ہوگا، مثلاً حسن، خیر اور انصاف چند قدریں ہیں، بعض انھیں "اضافی" کہتے ہیں، بعض ہیں جو "مطلق" گردانتے ہیں، اور اس کا فیصلہ یقیناً دشوار ہے کہ کس کا نقطۂ نظر صحیح ہے، لیکن قدروں کی علمی بحث سے قطع نظر، یہ ایک حقیقت ہے کہ کبھی مبہم اور کبھی واضح طور پر، انسان کو "خوب" سے "خوب تر" کی تلاش کی آرزو رہی ہے، یہ آرزو پوری نہیں ہو سکتی اگر کوئی فرد یا جماعت یہ طے کرلے کہ وہ محنت، ایمان داری، کفایت، انصاف، معاملات میں سچائی، حق پرستی، انسان دوستی اور اس طرح کی دوسری چیزوں سے دستبردار ہو کر یہ تلاش جاری رکھے گی۔ خالص مادی زندگی کو سنوارنے میں بھی ان باتوں کو برتنے کی ضرورت ہوتی ہے، مذہبی لوگ

اس کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ یہ چیزیں ایسی ہیں کہ دنیا اور عاقبت دونوں کو سنوار سکتی ہیں بشرطیکہ دنیاوی کامیابی کا تصور اس قدر تنگ اور کمینہ نہ ہو کہ اس کے لئے انسان کو ہر اچھی چیز، شرافت کا ہر اصول قربان کرنا پڑے "

سیدین صاحب مذہبی انسان ہیں، اس لئے وہ روحانی قدروں کی اصطلاح میں باتیں کہتے ہیں، وہ اپنے خیالات کی تائید میں مذہبی مصلحتوں اور عارفوں کے اقوال کا حوالہ دیتے ہیں، مثلاً انجیل مقدس کی اس آیت پر اُن کا ایمان ہے کہ "کیا فائدہ ہوگا انسان کو اگر وہ ساری دنیا کو حاصل کرے لیکن اپنی روح کی دولت کو کھو بیٹھے"۔ آج یہ سوال دنیا کے ہر اس شخص کو جو سوچتا ہے، پریشان کئے ہوئے ہے، یہاں تک کہ یوروپ اور امریکہ میں بھی جہاں مادی ترقی اپنے کمال کو پہنچتی نظر آرہی ہے، لوگوں نے اپنے آپ سے پوچھنا شروع کر دیا ہے کہ اس زمانے میں ہماری تہذیب کیسے محفوظ رہے گی؟ کیا ہماری نئی نسل جس کی پرورش خالص سائنسی ترقی اور مادی خوش حالی کے دامن میں ہو رہی ہے، اس قابل ہوگی کہ ہماری تہذیبی قدروں کی حفاظت کر سکے؟ کیا ہماری آزادیاں اور ترقیاں بجائے خود مقصد حیات ہیں؟ اور حساس دلوں کی یہ بے چینی کچھ آج ہی پر موقوف نہیں، پچھلے سوسال سے صنعتی تہذیب نے انسانی زندگی کو ایک سوالیہ نشان بنا رکھا ہے، سیدین صاحب اطالوی مدبر فرانسسکو نٹی کی اُس ذہنی کیفیت کا ذکر کیا ہے جو ۱۹۱۴ء کی جنگ کی وجہ سے اس پر طاری ہو گئی تھی اور اُس کی بے چین روح اپنی گہرائیوں سے پکار اٹھی تھی "یوروپ کے چراغ ایک ایک کرکے بجھتے جاتے ہیں۔ خدا جانے یہ لمپ دوبارہ ہماری زندگی میں روشن ہوں گے یا نہیں"۔ اقبال کی شاعرانہ بصیرت نے 'دیار مغرب کے رہنے والوں' کو ۱۹۰۷ء میں اُن کی تہذیب کی کمزوریوں کی طرف متوجہ کیا تھا اور کہا تھا ؎

تمھاری تہذیب اپنے ہاتھوں سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

یہاں مقصود مغربی تہذیب کی تنقید نہیں ہے، بلکہ کہنا یہ ہے کہ دنیا کی قدیم تہذیبوں کے سامنے بھی یہی مسائل ابھرے تھے، عہد وسطیٰ کی غالب تہذیب یعنی اسلامی تہذیب کی راہ میں بھی یہ کٹھن منزل آئی تھی، اور آج بھی دنیا کی غالب تہذیب کے سامنے یہی چیلنج ہے تاریخ عالم کی یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ تہذیبیں غروب ہو جاتی ہیں، سوال یہ ہے کہ کیوں ایسا ہوتا ہے؟

لائق مصنف نے اس سوال کا جواب تو نہیں دیا ہے لیکن پوری کتاب کو پڑھنے سے اس کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ روح کی دولت جو روحانی قدروں کی شکل میں انفرادی اور جماعتی زندگی کے لئے شہ رگ کا حکم رکھتی ہے، ایک تہذیبی دولت ہے، اس دولت سے محرومی میں جسم وجان دونوں کا زیان ہے۔ اس عقیدہ کی وضاحت مصنف کے ان مضامین سے خوب ہوگئی ہے جن میں انھوں نے ہمارے اپنے ملکی مسائل، رجحانات اور تحریکات سے بحث کی ہے، اختلاف، تعصب، تنگ نظری اور دوسرے تخریبی عوامل کا ذکر کرنے کے بعد کتاب کی تمہید میں انھوں نے بڑی دردمندی کے ساتھ کہا ہے:

"مجھے اس بات کا پورا احساس ہے کہ بعض اعتبار سے ملک نے گذشتہ پندرہ سال میں کافی ترقی کی ہے زراعت میں، صنعت وحرفت میں، آب پاشی میں، تعلیم اور صحت میں لیکن اس کا کیا علاج کہ یہ تمام ترقی مجھے سطحی اور کم عیار معلوم ہوتی ہے جب تک اس کی بنیاد سچی اور اخلاقی قدروں پر نہ رکھی جائے؟ ہماری تہذیب اور مذہب نے، ہمارے ادب اور فلسفے نے، ہمارے شاعروں اور مفکروں نے، ہمارے فقیروں اور صوفیوں نے، ہمارے عوام کی شرافت اور امن پسندی نے صدیوں کی کوشش سے جو چراغ جلائے تھے اور صدیوں تک روشن رکھے تھے، مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ایک خوفناک آندھی کی جھپٹ میں آگئے ہوں، جیسے وہ نہ لوگوں کے گھروں میں روشن ہوں نہ ان کے دلوں میں، مجھے ایک معلم کی حیثیت سے قدروں کا یہ گہن تمام دوسری کمزوریوں اور خرابیوں سے زیادہ کھٹکتا ہے اور زیادہ خطرناک معلوم ہوتا ہے۔"

ہماری اپنی اخلاقی خرابیوں کے علاوہ صنعتی تہذیب کا سیلاب بھی ہے جو امنڈ کر آرہا ہے، یہ سیلاب ٹیگور کے الفاظ میں اس قدر تیز رفتار اور پرجوش ہے کہ ہماری اپنی ندی کے دوسرے دھارے، کنارے اور بند باندھ اس کی زد میں آتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، اگر ہم اس کے بہاؤ کے لئے کوئی راستہ بنا سکے تو طوفان سے محفوظ رہیں گے، ورنہ تباہ ہو جائیں گے۔" ٹیگور نے یہ انتباہ بہت پہلے دیا تھا، حقیقت یہ ہے کہ ہم اس کی زد میں ہیں، طوفان ہمارے سروں پر منڈلا رہا ہے اور ہم بے بس نظر آتے ہیں، صنعتی تہذیب ہمارے سماج میں، ہمارے ذہنوں میں، ہمارے سوچنے کے طریقوں میں جو تبدیلیاں لا رہی ہے، ان کے نتائج کا ہمیں احساس نہیں ہم یہ نہیں دیکھ پاتے کہ وہ اخلاقی اصول اور شرافت کی وہ قدریں جو تہذیبوں کی جان ہوتی ہیں، کس طرح

ایک سخت آزمائش سے گذری ہیں، یہ اصول اور قدریں تیم ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں ان کے نام لیوا تو ابھی اکثر نظر آجاتے ہیں لیکن ان کی حفاظت کا حوصلہ رکھنے والے خال خال دکھائی دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم میں ایک طبقہ وہ ہے جو اندھی ماضی پرستی کا اس درجہ شکار ہو چکا ہے کہ اُسے ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کا، اُن قدروں کا کوئی احترام نہیں، جو مختلف مذاہب اور تہذیبوں کے ایک حسین امتزاج سے ظہور پذیر ہوئی ہیں اور یہ امتزاج صدیوں پر پھیلا ہوا ہے۔ ٹیگور نے اپنے خاص انداز میں ایسی ہی مریضانہ ذہنیت کی احیا پرستی کے خلاف آواز بلند کی تھی اور کہا تھا:

"... کسی ملک کے دریاؤں میں صرف اسی ملک کا پانی نہیں بہتا۔ برہمپترو جو تبت سے نکلتا ہے گنگا سے جو ہندوستانی دریا ہے مل جاتا ہے اسی طرح ہندوستان کی اپنی تہذیب میں کئی دوسرے عناصر بھی شامل ہوتے رہے ہیں، مثلاً مسلمانوں کا ایک سلسلہ ہے جو اپنے علوم کا خزانہ اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہوئے اپنے احساسات وجذبات اور لائق تحسین مذہبی جمہوریت کو ساتھ لے کر باہر سے آئے اور ہندوستانی تہذیب کے دھارے میں جوش وخروش پیدا کرتے رہے ہے .... جن لوگوں نے عہد وسطیٰ کے صوفیوں کی زندگیوں، اُن کی تحریروں اور اُن مذہبی تحریکوں کا مطالعہ کیا ہے، جو مسلم عہد حکومت میں ابھریں اور پھولی پھلیں، وہ جانتے ہیں کہ ہم پر اس بدیسی د... ے کا کتنا بڑا احسان ہے جو ہماری زندگی میں رچ بس گیا ہے۔"

اسی طرح ہم میں کچھ لوگ ہیں جو تنگ نظری کی حد تک مادی تہذیب اور نئی روشنی کے شیدائی ہیں، اور انھیں اپنا ماضی ویران اور سنسان دکھائی دیتا ہے۔ ٹیگور نے ان الفاظ میں ان کی کج بینی کا ذکر کیا ہے:

"... ان کا عقیدہ ہے کہ ماضی دیوالیہ ہے اور اس نے ہمارے لئے کوئی سرمایہ نہیں چھوڑا ہے، اس سے ہمیں صرف زیرباری ملی ہے، یہ لوگ یہ ماننے سے انکار کرتے ہیں کہ وہ فوج جو آگے بڑھ رہی ہے پیچھے سے سامانِ جنگ حاصل کر سکتی ہے، اچھا ہوگا اگر انھیں یاد دلایا جائے کہ تاریخ میں نشاۃ ثانیہ کے روشن عہد وہی تھے جب قوموں کو اچانک پتہ چلا کہ ماضی کے خزانے میں گراں قدر افکار و خیالات کا وافر سرمایہ موجود ہے۔"

میں نے ان دو رجحانات کو محض مثال کے طور پر پیش کیا ہے، ورنہ ان کے علاوہ اور رجحانات اور

تحریکات بھی ہیں جن کی نشاندہی مصنف نے بڑی خوش اسلوبی اور فصاحت سے کی ہے، مصنف کو زبان و بیان پر جو قدرت حاصل ہے اُس نے اُن کے درد و داغ اور سوز و آرزومندی کے نقوش اور ابھائے ہیں، اور دونوں نے مل کر خیالات اور اسلوب بیان میں وہ گرمی پیدا کر دی ہے جس کی آنچ ہر اُس پڑھنے والے کو یقیناً محسوس ہوگی جو سنجیدگی اور درد مندی سے مبنیہ مسائل پر غور کرتا ہے اور ان چیلنجوں کو شدت سے محسوس کرتا ہے جو آج کی بدلی ہوئی فضا میں ہماری اعلیٰ قدروں کو درپیش ہیں۔

ہماری خوش نصیبی ہے کہ حالات کی اندھیاریوں میں امید کی کرن ابھی موجود ہے اور ہمارے ملک میں ابھی کچھ 'درد آشنا' ہیں جو انتشار اور تخریب کی قوتوں کے مقابلے میں تعمیر، اتحاد اور سچائی کی قوتوں کی نمائندگی کرتے ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں جو ہمت کے ساتھ اپنی بات کہتے ہیں، بہرحال ابھی ہم اس منزل میں نہیں ہیں جہاں مایوسی اور محرومی کے سوا کچھ نہیں ہوتا ہے، لیکن متخالف قوتوں میں تصادم ہے اور سخت ہے، مصنف نے ساری بحث کا نچوڑ کتاب کے آخری صفحہ میں ایک سوال کی شکل میں پیش کیا ہے اور یہی مختلف مضامین کو جن میں تسلسل کے ساتھ چند بنیادی قدروں پر زور دیا گیا ہے، کتاب کی شکل میں شائع کرنے کا مقصد بھی ہے، سوال یہ ہے:

دو قوتیں ہیں، ایک عقل، رواداری، انسانیت اور سچی تہذیبی قدروں کی نمائندگی کرتی ہے اور دوسری..... تعصب، تنگ نظری، تاریک خیالی اور اندھی ماضی پرستی کی تائید کرتی ہے۔" ان دونوں قوتوں کی کشاکش واضح ہے، اب ہمارا فیصلہ کیا ہے؟ کیا ہم حیات افروز قوتوں کا ساتھ دیں گے؟ کیا ہم اُن رجحانات کی حمایت کریں گے جو قوموں اور تہذیبوں کو فنا کر دیتے ہیں؟ ہمارا فیصلہ ہماری نئی نسل، ہمارے ملک اور ہماری اس حسین دنیا کی قسمت کا فیصلہ ہوگا۔

آخر میں یہ لکھنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کے ناشر نے غالباً مضمون کے معنوی حسن کا احساس کر لیا تھا، اسی لئے اس نے کتاب کے ظاہری حسن کا ہر طرح خیال رکھا، کتابت اور طباعت دونوں بہت اچھی ہے، لیکن شاید مصنف کو پروف پڑھنے کا موقع نہیں ملا، ورنہ اتنی زیادہ غلطیاں نہ ہوتیں۔ مصنف نے مضامین کی نظر ثانی پر غالباً زیادہ وقت نہیں صرف کیا، ورنہ کہیں کہیں بعض فقروں، جملوں اور تراکیب پر ترجمے کا جو گمان ہوتا ہے وہ نہ ہوتا۔

جامعہ میں ہند و پاکستان مشاعرہ

دلی میں ہر سال بہت بڑے پیمانے پر ہند و پاکستان مشاعرہ ہوا کرتا ہے، اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس مشاعرہ میں شریک ہونے والے شعراء کو جامعہ میں بھی مدعو کیا جاتا ہے۔ حسب معمول امسال بھی جامعہ میں مشاعرہ منعقد ہوا اور ہند و پاکستان کے مشہور شعراء نے شرکت کی۔

مشاعرہ کی صدارت ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے فرمائی اور اسٹیج سکریٹری کے فرائض جناب غلام ربانی تاباںؔ صاحب نے انجام دیئے۔ صدر جلسہ نے مشاعرہ کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ معمول ہو گیا ہے — اور یہ معمول بہت مبارک ہے۔ کہ جو شعراء دلی کے عظیم مشاعرہ میں شرکت کے لئے آتے ہیں، وہ جامعہ بھی تشریف لا کر ہم خاک نشینوں کی دعوت کو ازراہ محبت قبول کرتے ہیں۔ اگرچہ دلی کا مشاعرہ بہت بڑے پیمانے پر ہوتا ہے اور یہاں سننے والے بہت تھوڑے ہوتے ہیں اگر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے مہمان اتنی ہی خوشی سے یا شاید اس سے زیادہ خوشی سے یہاں اپنا کلام سناتے ہیں، دیوان عام کی شان کچھ اور ہوتی ہے اور دیوانِ خاص کی کچھ اور۔ ہمارے لئے یہ انتہائی خوشی کا مقام ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے شعراء جو بہت کم اکٹھا ہوتے ہیں، آج یہاں جمع ہیں۔ ابھی کچھ دن ہوئے آٹھ تارے جمع ہو گئے تھے تو دنیا میں قیامت آ گئی تھی۔ آج یہاں تیس تارے اکٹھا ہیں، اگر قیامت برپا ہو جائے تو تعجب نہیں۔ آپ سب کی طرف سے اور اپنی طرف سے ان مہمانوں کا خیر مقدم کرتا ہوں اور اس زحمت کے لئے جو یہاں آ کر انھوں نے اٹھائی ہے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

اس مختصر تقریر کے بعد جناب تاباںؔ صاحب نے میزبانی کے فرائض ادا کرتے ہوئے اپنی ذیل کی غزل سے مشاعرہ کا آغاز کیا۔

یوں ترے دورِ تغافل میں وفا رہتی ہے — شمع جیسے تہہ داماں میں صبا رہتی ہے
نیند آنکھوں سے منتی لب سے خفا رہتی ہے — زندگی عشق میں پابند دفا رہتی ہے

دل اگر دل ہے تو وابستۂ غم بھی ہوگا — نکہت گل بھی کہیں گل سے جدا رہتی ہے
نطق نامحرم اسرار جنوں ہے اے دوست — درد بن کر دل شاعر میں نوا رہتی ہے
حسن کی سعی کرم وجہ تسلی نہ ہوئی — ایک بے نام خلش دل میں سدا رہتی ہے
یوں چلو جیسے بیاباں میں ہوا چلتی ہے — یوں رہو جیسے گلستاں میں صبا رہتی ہے

ہائے معصومیت شوق کا عالم تاباںؔ
ہر نفس کشمکش جرم و سزا رہتی ہے

تاباںؔ صاحب کی افتتاحی غزل کے بعد مشاعرہ شروع ہوا، جس کی ایک جھلک ذیل میں پیش کی جاتی ہے

جناب بیکل اتساہی

جھلک نظاروں کی چلمن میں چھوڑ آئے ہیں — نگاہ شوق کو الجھن میں چھوڑ آئے ہیں
اودھ کی شام بنارس کی صبح کا عالم — کسی حسین کے آنگن میں چھوڑ آئے ہیں
وہ چند اشک جو تھے راز دان غم دل کے — انھیں تمہارے ہی دامن میں چھوڑ آئے ہیں
تمہاری بزم سے اٹھ کر تمہارے دیوانے — کبھی کبھی تمہیں الجھن میں چھوڑ آئے ہیں

جناب شارب ردولوی

خوشی کے ساتھ اٹھے یا کہ سوگوار چلے — تمہاری بزم کو اشکوں سے ہم سنوار چلے
بہت طویل تھی یہ قید عمر لیکن ہم — تری امید کرم پر اسے گزار چلے
تری خوشی کے لئے کل جو مسکرائے تھے — وہ آج تیری ہی محفل سے اشکبار چلے

جناب دلاور فگار

موصوف نے ڈاکٹر اقبال کے شکوہ کی پیروڈی "ٹیچرس کی طرف سے شکوہ" کے عنوان سے پیش کی۔ اس طویل مزاحیہ اور طنزیہ نظم کا ایک بند یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

ہے بجا جذبۂ ایثار میں مشہور ہیں ہم — حق محنت نہ ملے جس کو، وہ مزدور ہیں ہم
فقر و فاقہ کی قسم سرمد و منصور ہیں ہم — ہو گئے پانچ مہینے کہ بدستور ہیں، ہم

حاکما! شکوۂ ارباب وفا بھی سن لے
خوگر مدح سے تھوڑا سا گلا بھی سن لے

جناب نظر جعفری (پاکستان)

تنکے لالا کر کسی گوشے میں ہم رکھتے گئے — اس طرح بھی ایک شکل آشیاں بنتی گئی
ہے ہر اک تخریب میں تعمیر کا پہلو نظر — میرا دل مٹتا گیا اور داستاں بنتی گئی

محترمہ ممتاز مرزا

کوئی کلی تو کھل کے ہنسے صحن باغ میں — اے دل! حریفِ گردشِ دوراں کوئی تو ہو
رسوائیاں کہ دار و رسن یا درِ حبیب — ممتاز اپنی زیست کا عنوان کوئی تو ہو

جناب انور صابری

بساطِ کائنات پر قیامتیں ابھر گئیں — جو تیری زلف ناز سے الجھ گئی کوئی شکن
تبسم حسیں ترا کلی کلی کی زندگی — ترا جمال گل بہ گل قدم قدم چمن چمن
تری جبینِ زر فشاں حریفِ بزمِ کہکشاں — ترے لبِ لطیف میں سرورِ بادۂ کہن

جناب حبیب جالب (پاکستان)

بگولوں کی صورت یہاں پھر رہے ہیں — نشیمن سرِ گلستاں چھوڑ آئے
یہ اعجاز ہے حسنِ آوارگی کا — جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے
چلے آئے ان رہ گزاروں سے جالب — مگر ہم وہاں قلب و جاں چھوڑ آئے

جناب اقبال صفی پوری (پاکستان)

کہیں گل کہیں یہ شبنم ہے عجیب وہ نظر بھی — یہی دل کا زخم بھی ہے یہی دل کی چارہ گر بھی
جو ہوئے بھی مجھ سے رخصت تو نہ جا سکے وہ تنہا — گئی ساتھ ساتھ ان کے بڑی دور تک نظر بھی
ٹھہرے مذاقِ وحشت کہ ابھی ہے دل سلامت — ہے اگر خیال صحرا تو برا نہیں ہے گھر بھی

جناب نشور واحدی

میرا دل نہ تھا الم آشنا کہ تری ادا پہ نظر پڑی — وہ نہ جانے کون سا وقت تھا کہ بنائے خونِ جگر پڑی
ترا کام سیر مدام ہے نہ کہ گلستانوں میں ٹھہرنا — یہ کلی کلی کے فریب میں تو کہاں سے بادِ سحر پڑی
کوئی موجِ بحر سے دور ہے تو جبینِ بحر پہ کیا شکن — تری رحمتوں کو ہوا یہ کیا مری لغزشوں پہ نظر پڑی

جو حدودِ صبح میں رک گیا اسے اتفاقِ سفر کہو
میں وہی مسافرِ شام ہوں مرے راستہ میں سحر پڑی

سرِ راہ ان کو بہ یک نظر کبھی دیکھیئے تو وہی ادا
وہی بے نیازیِ مہ وشاں وہی زلف تا بہ کمر پڑی

حضرت حفیظ جالندھری (پاکستان)

کبھی زمیں پہ کبھی آسماں پہ چھائے جا
اجاڑنے کے لئے بستیاں بسائے جا

خضر کا ساتھ دئے جا قدم بڑھائے جا
فریب کھائے ہوئے کا فریب کھائے جا

تری نظر میں ستارے ہیں اے مرے پیارے
اٹھائے جا نہ افلاک خاک اڑائے جا

اناڑیوں سے تجھے کھیلنا پڑا اے دوست!
سمجھا سمجھا کے نئی چال مات کھائے جا

ہر ملاقات میں اک بات نظر آتی ہے
صورتِ ترکِ ملاقات نظر آتی ہے

یہ عجب مرحلۂ عمر ہے، یارب! کہ مجھے
ہر بری بات، بری بات نظر آتی ہے

چلتے پھرتے ہوئے مُردوں سے ملاقاتیں ہیں
زندگی کشف و کرامات نظر آتی ہے

نظر آتی ہے کسی دوست کی صورت جو کہیں
ایک فہرستِ عنایات نظر آتی ہے

ترے اترے ہوئے چہرے پہ یاروں کو حفیظ
سُرخیِ حرف و حکایات نظر آتی ہے

اس مشاعرہ میں محترمہ شاہ بانو یاد، جناب فرقت کاکوروی، جناب آفتاب امروہوی، جناب ملک زادہ منظور احمد، جناب مخدوم محی الدین، جناب جگن ناتھ آزاد، جناب شوکت تھانوی، اور حضرت فراق گورکھپوری نے بھی شرکت کی تھی۔ افسوس کہ ان شعراء کرام کا کلام نوٹ نہیں کیا جا سکا، اس لئے ہم قارئین جامعہ کی خدمت میں پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ ان شعراء سے بھی معذرت خواہ ہیں۔

(ع ل ا)

کوائف جامعہ

جامعہ کے مہمان

جامعہ کے کام کی شہرت نہ صرف ملک کے دور دراز گوشوں سے لوگوں کو کھینچ لاتی ہے، بلکہ اکثر و بیشتر بیرونی ممالک کے ممتاز اور اہم اشخاص کو بھی اس ویرانے میں آنے پر مجبور کرتی ہے پچھلے ماہ کے مہمانوں میں ڈاکٹر ڈبلیو، سی اسمتھ، پروفیسر رچرڈ ایچ رابنسن اور ایران کے وزیر تعلیم اور دو ماہرین تعلیم قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر اسمتھ ادارۂ علوم اسلامی (میکگل یونیورسٹی مانیٹرل کینیڈا) کے ڈائرکٹر اور "موڈرن اسلام ان انڈیا" اور "اسلام اِن موڈرن ہسٹری" کے مصنف کی حیثیت سے کافی معروف و مشہور ہیں۔ وہ جب کبھی ہندوستان آتے ہیں، تو اپنی انتہائی مصروفیتوں کے باوجود اساتذہ جامعہ سے ملنے کے لئے ضرور وقت نکالتے ہیں۔ چنانچہ اس مرتبہ مارچ میں تشریف لائے، تو جامعہ میں کافی وقت صرف کیا۔

پروفیسر رابنسن امریکی یونیورسٹی وِسکانسن میں ڈیپارٹمنٹ آف انڈین اسٹڈیز کے صدر ہیں اور ہندوستانی فلسفہ ان کا مخصوص مضمون ہے، انھوں نے سنسکرت زبان و ادب کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ موصوف دہلی تشریف لائے تو دو تین گھنٹے جامعہ میں بھی صرف کئے۔ شیخ الجامعہ صاحب کی عدم موجودگی میں ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے ان کا خیر مقدم کیا۔ سب سے پہلے موصوف نے مکتبہ جامعہ اور اس کی مطبوعات دیکھیں، اس کے بعد کالج میں اساتذۂ جامعہ کے ساتھ چائے میں شرکت کی اور مختلف علمی مسائل پر گفتگو کی۔

ایران کے وزیر تعلیم اور دوسرے ماہرین تعلیم، وقت کی کمی کی وجہ سے، صرف مدرسہ ابتدائی دیکھ سکے۔ شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب، پرنسپل کالج جناب ضیاء الحسن فاروقی اور بچوں کی حکومت (مدرسہ ابتدائی) کے عہدہ داروں نے ان کا خیر مقدم کیا اور جامعہ کی تاریخ اور اس کی تعلیمی خدمات سے روشناس کیا۔

ان بیرونی ممالک کے مہمانوں کے علاوہ بہت سے ملکی مہمان بھی تشریف لائے ۔ ان میں مختلف ریاستوں کے سوشل ایجوکیشن کے افسران قابلِ ذکر ہیں۔ آج کل دہلی میں نیشنل فنڈامنٹل ایجوکیشن سنٹر کے زیرِ اہتمام "بالغوں کی خواندگی" پر ایک سیمینار ہو رہا ہے جس میں شرکت کے لئے تقریباً تمام ریاستوں کے افسرانِ تعلیم تشریف لائے ہیں۔ شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب کی دعوت پر یہ حضرات جامعہ تشریف لائے۔ شیخ الجامعہ صاحب نے ان لوگوں کو مختصراً جامعہ کے حالات بتلائے اور جامعہ نے تعلیم بالغان کے سلسلے میں جو خدمات انجام دی ہیں خاص طور پر ان کی تفصیلات بتلائیں ۔ ان مہمانوں کے اعزاز میں عصرانہ کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔ جس میں ادارۂ تعلیم و ترقی اور تعلیمی اداروں کے سربراہوں نے بھی شرکت کی۔ عصرانے کے بعد ان مہمانوں نے ادارۂ تعلیم و ترقی کے کاموں کی نمائش دیکھی۔ (۲۲ اپریل)

الوداعی جلسے میں شیخ الجامعہ کی تقریر

پچھلے ماہ حسبِ معمول انجمن طلبائے جامعہ کا الوداعی جلسہ منعقد ہوا، جس میں اعلیٰ تعلیم کے اداروں کے تمام طلباء اور اساتذہ نے شرکت کی۔ شیخ الجامعہ صاحب نے طالب علموں کو خطاب کرتے ہوئے، ان کی ذمہ داریاں یاد دلائیں، انجمن طلباء کے اغراض و مقاصد کی وضاحت کی اور جامعہ کی امتیازی خصوصیات بیان کیں۔ موصوف نے فرمایا کہ "کسی تعلیمی ادارہ کا اندازہ اس کے بجٹ، شاندار عمارتوں یا طلباء کی تعداد سے نہیں کیا جاتا۔ جو چیز دیکھی جاتی ہے، وہ طالب علم ہیں، اگر طالب علم اثر نہ ڈال سکیں اور لوگ ان کو پسند نہ کریں، تو پھر تعلیم کا مقصد پورا نہیں ہوا"۔ شیخ الجامعہ صاحب ابھی حال میں یورپ و امریکہ میں چار پانچ ماہ قیام کرکے واپس آئے ہیں۔ موصوف نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ "آج کل دنیا میں جہاں کہیں بھی میں گیا، ہر جگہ لوگ یہ پوچھتے ہیں کہ آج کل نوجوانوں کو دیکھ کر، جو کچھ دنوں میں تہذیب کا کام سنبھالیں گے، کیا اندازہ کیا جا سکتا ہے، کیا تہذیب قائم رہے گی یا مٹ جائے گی؟ اگر رنگ یہی رہا تو مشکل ہے۔ ہندوستان کی حالت اس سے کچھ بہتر نہیں ہے۔ تعلیمی ادارے ہوں یا ملک کی عام فضا، ہم ایک ایسی جگہ پہنچ گئے ہیں، جہاں تہذیب کا باقی رہنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ میں جامعہ کے نوجوانوں کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ اگر یہ دولت ہمارے ہاتھ سے نکل گئی، تو ہم کہیں کے نہ رہیں گے"۔

تقریر کو ختم کرتے ہوئے شیخ الجامعہ صاحب نے فرمایا کہ "چند دنوں میں آپ کے امتحانات شروع ہونے والے ہیں۔ امید ہے کہ آپ اس امتحان سے بہ حسن وخوبی گذر جائیں گے، مگر یہ امتحان معمولی ہے، اصل امتحان وہ ہے جو زندگی میں داخل ہونے کے بعد پیش آئے گا، جس میں آپ اپنے اخلاق، اپنے برتاؤ اور اپنے طور طریقے سے پہچانے جائیں گے۔ اگر آپ اس امتحان میں پورے اترے تو یہی اصل کامیابی ہے۔"

ایک دن کا مدرسہ

جامعہ کی تعلیمی خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ سال میں ایک مرتبہ ابتدائی اور ثانوی کے اسکولوں میں پورے دن کے لئے اسکول کی ذمہ داری طالب علموں کے سپرد کر دی جاتی ہے اور وہ چھوٹی بڑی تمام ذمہ داریاں خود ہی انجام دیتے ہیں۔ اس خاص موقع پر طالب علموں کے ذوق وشوق، جوش وخروش اور ان کے حوصلے دیکھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ امسال پچھلے مہینے میں مدارس ابتدائی اور ثانوی میں الگ الگ تاریخوں میں یہ دن منایا گیا۔ مدرسہ ثانوی نے اس موقع پر دہلی کے بہت سے اسکولوں اور سفارتخانوں کو بھی مدعو کیا تھا۔ چنانچہ اس کو دیکھنے کے لئے بہت سے مہمان تشریف لائے تھے جن میں اچھی خاصی تعداد بیرونی ممالک کے مہمانوں کی تھی۔ ان میں ایران کے کلچرل اٹیچی ڈاکٹر تفضلی نے بڑی دلچسپی لی۔ انھیں جامعہ کا یہ طریق کار اس قدر پسند آیا اور بچوں کے انتظام اور احساس ذمہ داری سے اتنے متاثر ہوئے کہ اس دن کی مفصل رپورٹ ایران کے اخبارات کو بھیجی۔

ع ل ا (۲۷ اپریل)



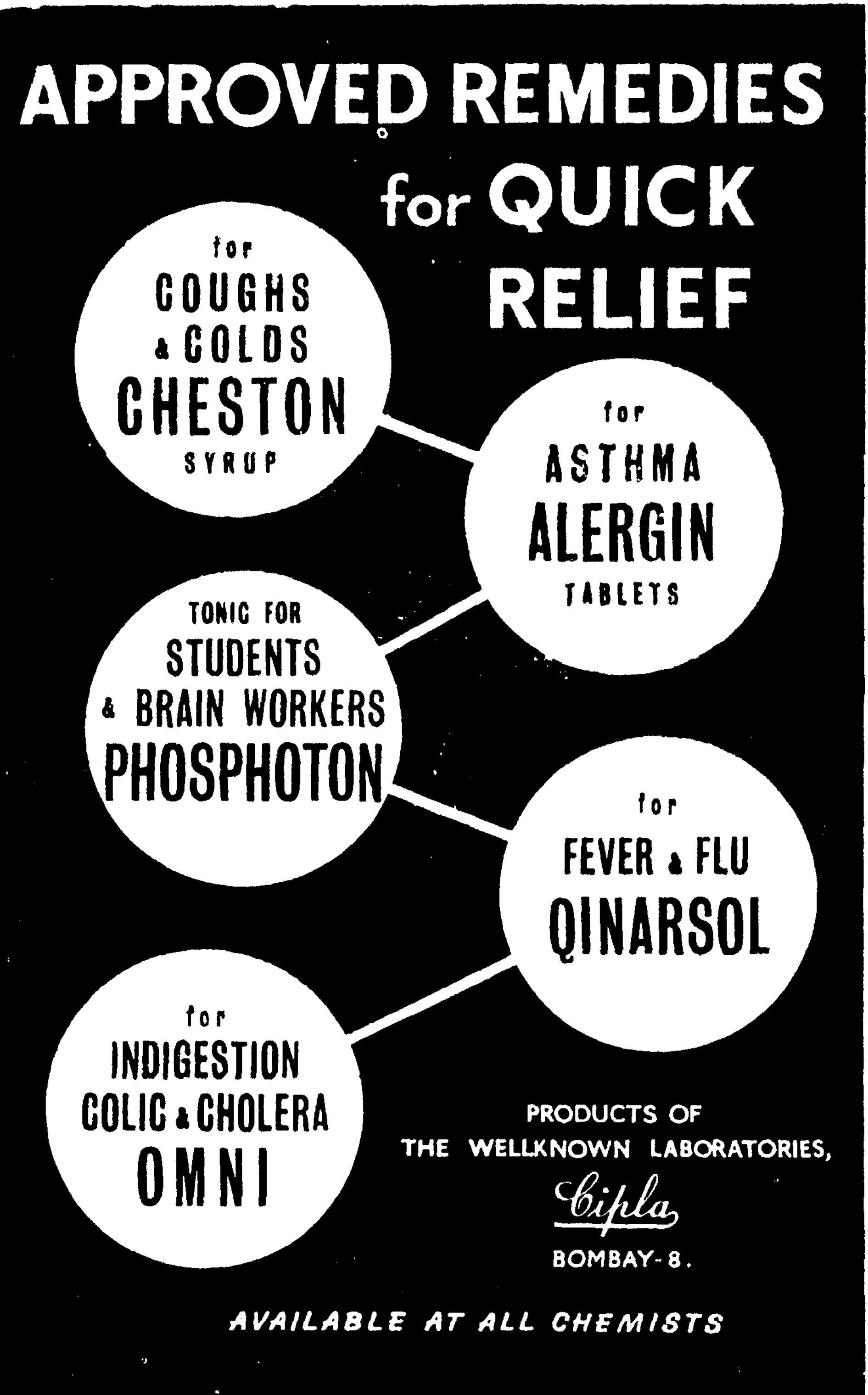
دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

ایجنسیاں:-

(۱) کانپور، ظہیر اینڈ سنس (۲) مرادآباد، یونانی میڈیکل اسٹور چوکھا پل (۳) مبارک پور، اعظم گڑھ محمود الرحمن عبدالوحید (۴) مئوناتھ بھنجن، صدر بازار (۵) بمبئی، دریابادی دواخانہ۔ ۳۹۳ پائیدھونی (۶) لکھنؤ امین آباد۔ اودھ جنرل اسٹور (۷) بستی (یوپی) سید جمیل احمد۔ گاندھی نگر۔

Regd. No. D -

The Monthly JAMIA
P. O. Jamia Nagar, New Delhi-25



جامعہ

جامعہ ملّیہ اسلامیہ، دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ
چھ روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس نئے پیسے

جلد ۴۶	بابت ماہ جون ۱۹۶۲ء	شمارہ ۸

فہرست مضامین

خط و کتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی

ہندوستان کے سلاطین علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر

(۲)

جناب سید صباح الدین عبد الرحمن

علماء اور صوفیہ کا اختلاف

یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہاں کے باشندے صوفیہ کرام کے اخلاق اور کردار سے متاثر ہو کر اسلام کے حلقہ میں جوق جوق داخل ہو رہے تھے۔ تو علماء اور صوفیہ کی کش مکش سے خود مسلمانوں کو نقصان پہنچا، اور یہ پڑھ کر دکھ ہوتا ہے، کہ جب چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں خصوصاً حضرت نظام الدین اولیاء کے فیوض سے دہلی کے بدکار اپنی بدکاری سے باز آ رہے تھے بے نمازی، نماز کے پابند ہو گئے تھے، بددیانتی اور بدمعاملگی کو چھوڑ رہے تھے، سود خواری، ذخیرہ اندوزی بند ہو گئی تھی، خواص اور عوام کے دلوں میں گناہ کا خوف غالب ہو گیا تھا، حتیٰ کہ شاہی خاندان کے افراد فسق و فجور سے پرہیز کرنے لگے، اس وقت بھی علماء کا ایک گروہ حضرت شیخ نظام الدین اولیاء کا مخالف تھا، اور ان کی سماع کی حلت و حرمت پر اتنا الجھا کہ ان کو ایک محضر میں حاضر ہو کر اپنے مذہبی عقائد واضح کرنا پڑا، اور اس محضر میں دہلی کے فقہاء نے عداوت اور حسد کا ایسا مظاہرہ کیا، کہ حضرت خواجہ کو کہنا پڑا کہ

"یہ شہر جس کے اندر ایسی مغرورانہ بحث ہو کیسے آباد ہو سکتا ہے، عجب نہیں کہ اس کی اینٹ سے اینٹ بج جائے،"

اور یہ واقعہ ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاء کے بعد خدا جانے کتنی بار دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجتی رہی، ایک مورخ تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ دہلی کی یہ تباہی و بربادی اسی بددعا کا نتیجہ تھی، لیکن یہ ضرور ہے کہ اگر علماء اور صوفیہ دونوں مل کر مسلمانوں کے مذہبی اور روحانی جذبات کا صحیح مصرف لیتے رہتے

تو آج نہ صرف دہلی بلکہ ہندوستان کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔

وجہ اختلاف

علماء کو صوفیہ کرام سے اختلاف کا بڑا سبب یہ تھا، کہ وہ برابر ڈرتے رہے کہ کہیں طریقت اور حقیقت کے افکار و مسائل میں شریعت گم ہو کر نہ رہ جائے، حالانکہ جتنے اکابر صوفیہ گذرے ہیں، وہ برابر کہتے رہے کہ جس طرح آفتاب سے نور، جوہر سے عرض، اور موصوف سے صفت جدا نہیں ہوسکتی ہے، اسی طرح شریعت حقیقت سے علیحدہ نہیں ہو سکتی، خود حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی تعلیم یہ رہی، کہ صوری حیثیت سے اخلاق کی تکمیل یہ ہے کہ سالک اپنے ہر کردار میں شریعت کا پابند ہو، جب اس سے کوئی بات خلاف شریعت سرزد نہ ہوگی، تو وہ دوسرے مقام پر پہنچے گا جس کا نام طریقت ہے اور جب اس میں ثابت قدم رہے گا تو معرفت کا درجہ حاصل کرے گا، اور جب اس میں پورا اترے گا تو حقیقت کا مرتبہ پائے گا اس کے بعد وہ جو کچھ مانگے گا اس کو ملے گا، اسی لئے خواجہ صاحب نے شریعت کے تمام ارکان اور جزئیات کی پابندی پر بڑا زور دیا ہے، اور یہی مسلک چشتیہ سلسلہ کے تمام بزرگوں کا رہا۔

سہروردیہ سلسلہ میں حضرت صدر الدین عارف فرمایا کرتے، کہ ایمان کی استقامت کی علامت یہ ہے کہ بندہ اللہ اور رسول کو محبوب رکھے، اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام پیغمبروں میں افضل سمجھے اور جو کچھ آپ نے فرمایا اس کو صحیح اور درست سمجھے، خواہ یہ باتیں عقل میں آئیں یا نہ آئیں اگر نہ آئیں تو بھی ان کو تسلیم کرلیں تاکہ اعتقاد درست رہے، کیونکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے حکم کو جانا اور اس کی کیفیت معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی، فردوسیہ سلسلہ کے بزرگوں میں حضرت شرف الدین یحییٰ منیری فرمایا کرتے تھے کہ

"باخدا دیوانہ باش و با شریعت ہوشیار"

اور اسی پر دوسرے خانوادوں کے بزرگوں کا بھی عمل رہا، لیکن رفتہ رفتہ صوفیہ میں کچھ گروہ ایسا بھی پیدا ہوگیا، جو کہتا کہ ایمان کی علت معرفت ہے، اگر معرفت ہو اور طاعت نہ ہو تو اللہ تعالیٰ بندہ سے مواخذہ کرے گا، لیکن اطاعت ہو اور معرفت نہ ہو تو بندہ نجات نہیں پائے گا۔ علماء کی نظروں میں یہ باتیں کھٹکتیں اور گو اکابر صوفیہ خود اس کی تردید کرتے رہتے کہ وہ معرفت پسندیدہ نہیں، جس میں

طاعت نہ ہو ان کے نزدیک معرفت شوق کا نام ہے۔ اور شوق اور محبت کی علامت طاعت ہے، شوق اور محبت جس قدر زیادہ ہوتی جائے گی اسی قدر فرمان الٰہی کی تعظیم بڑھتی جائے گی۔

علماء کا بعض ایسے صوفیوں کا مخالف ہونا بھی صحیح تھا، جو اسلامی تصوف کی پیروی کسی حال میں نہیں کرتے تھے، مثلاً فیروز شاہ تغلق کے عہد میں ایک صوفی احمد بہاری نامی اپنے مریدوں کو ترک و تجرید کی تعلیم دیتے اور (نعوذباللہ) رسول اللہ صلی اللہ کی شان میں گستاخانہ باتیں کیا کرتے تھے، اور پھر اپنے کو خدا سمجھتے۔ فیروز شاہ تغلق نے ان کے پاؤں میں زنجیر ڈلوا کر اپنے سامنے بلوایا اور ان کو قتل کرا دیا۔

حضرت شرف الدین یحییٰ منیری کو ان کے قتل پر دکھ ہوا۔ گو وہ خود شریعت کے بہت پابند رہے، لیکن احمد بہاری کی باتوں کو عالم دیوانگی پر محمول کیا۔ اور وہ درحقیقت ان کو بزرگ سمجھتے تھے، چنانچہ اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ "جس شہر میں ایسے بزرگوں کا خون بہایا جائے، تعجب ہے اگر وہ آباد رہے" اور صوفیوں کا خیال ہے کہ تیمور کے ہاتھوں جو دہلی برباد ہوئی تو انہی کا خون رنگ لایا۔

اسی طرح عین الملک ماہرو کے ایک غلام نے صوفی بن کر مریدوں کو تاکید کی، کہ میں انا الحق کہوں تو تم سب بلند آواز سے "توئی توئی" کہو، فیروز شاہ نے علماء کے فتوے پر اس کو قتل کرا دیا۔

علماء ایسے صوفیہ کی بھی برابر گرفت کرتے رہتے جو محض دنیاوی مال و منال اور جاہ و حشمت کی خاطر اپنے کو صوفی ظاہر کرتے اور اکابر صوفیہ کے جانشین بن کر اپنے مورث اعلیٰ بلکہ خود تصوف کو بدنام کرتے اور یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ اکابر صوفیہ کے جانشینوں یا ان کے مقبروں کے مجاوروں نے ان کے ملفوظات کے مجموعوں میں ایسی ایسی باتوں کا اضافہ کر دیا ہے، جو وہ اپنی زندگی میں کسی طرح برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے تھے،

حضرت خواجہ بختیار کاکی کے مجموعۂ ملفوظات فوائد السالکین میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی قدس سرہٗ کی خدمت میں ایک شخص بیعت ہونے کے لئے حاضر ہوا، اور ان کے قدموں پر سر رکھ کر عرض کیا، میں مرید ہونے کے لئے حاضر ہوا ہوں حضرت خواجہ اس وقت اپنے حال میں تھے۔ فرمایا اس شرط پر مرید ہو سکتے ہو، کہ ایک مرتبہ کہو "لا الٰہ الا اللہ چشتی رسول اللہ" چونکہ وہ راسخ العقیدہ تھا، اس لیے اس نے آپ کے ارشاد کی تعمیل کی، اور غریب نواز نے اس کو مرید کر لیا، اور

خلعت خاص سے سرفراز فرمایا اگر ہم اس روایت کو الحاقی سمجھ کر رد کر دیں تو پھر کسی بحث کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔

مریدوں اور معتقدوں کا ایک ایسا گروہ بھی پیدا ہو گیا تھا، جو اس قسم کے ملفوظات کی تاویلیں کرنے میں اپنی ساری لیاقت خرچ کرتا رہا، اور رفتہ رفتہ تصوف ایک ایسا فلسفہ بن گیا، کہ توحید، ایمان، نفس کشی، ولایت و کرامت، فنا و بقا، غیبت و حضور، جمع و تفرقہ، حلول روح، معرفت، عشق الہٰی، وصال الہٰی، مشاہدۂ حق وغیرہ جیسے مسائل پر علماء اور صوفیہ کے درمیان مستقل اختلاف پیدا ہو گیا، وحدت الوجود کا مسئلہ تو خاص طور پر ان دونوں میں اختلاف کی خلیج کے وسیع ہونے کا سبب بن گیا، اور اس سلسلہ میں جو مباحث ہوتے علماء ان کو بدعت اور گمراہی قرار دیتے تھے، اور ان پر عقیدہ رکھنے والے کو عالم یا بزرگ سمجھنے کے لئے تیار نہ ہوتے تھے۔

عوام کو ان علمی مباحث سے کوئی دلچسپی نہ تھی، لیکن وہ صوفیہ کرام کی کرامتوں اور روحانی طاقتوں کو دیکھ کر، ان کے گرد پروانہ وار جمع رہتے، اور ان کی وفات کے بعد بھی ان کو زندہ سمجھتے، اس طرح ان متقی بزرگوں کی حکومت برابر جاری رہتی، علماء کا ایک گروہ اس قبر پرستی کے ہمیشہ خلاف رہا، لیکن عوام اس مخالفت سے کبھی بھی متاثر نہیں ہوئے، اور صوفیہ کی قبریں ابھی تک نہ صرف مسلمانوں بلکہ ہندوؤں کی زیارت گاہیں بنی ہوئی ہیں، اور ہندو بھی مسلمانوں ہی کی طرح ان سے منتیں اور مرادیں مانگتے ہیں، اور نذریں چڑھاتے ہیں۔

یہ قبر پرستی مذہبی لحاظ سے تو کسی طرح جائز نہیں قرار دی جا سکتی، لیکن ہندوستان کا جو مذہبی ماحول تھا، اس میں اس بدعت کا ایک روشن پہلو حسب ذیل لطیفہ سے ظاہر ہوتا ہے، اکبری عہد میں راجہ مان سنگھ کے دربار میں ایک سید اور ایک برہمن میں مذہبی بحث چھڑ گئی، دونوں اپنے اپنے مذہب کی فضیلت بیان کرتے رہے، لیکن کوئی دوسرے کو قائل نہ کر سکا، آخر میں مان سنگھ پر فیصلہ چھوڑ دیا گیا اس نے کوئی فیصلہ دینے سے یہ کہہ کر گریز کیا، کہ اگر میں مذہب اسلام کو ترجیح دوں تو لوگ بادشاہ وقت کی خوشامد پر محمول کریں گے، اور اگر اس کے برعکس رائے دوں تو تعصب سمجھا جائے گا۔ لیکن جب ان سے اصرار کیا گیا، تو کہا مذہبی حقایق کی بنا پر تو فیصلہ دینا مشکل ہے، لیکن دیکھتا ہوں کہ ہندوؤں

یہ خواہ کیسے گنواں پنڈت یا دھیانی فقیر ہو مرنے پر جلا دیا گیا، اس کی خاک اڑ گئی، رات کو وہاں کوئی جاتا ہے، تو آسیب کا خطرہ محسوس کرتا ہے، لیکن مسلمانوں کے جس شہر یا قصبہ یا گاؤں میں گندہ بزرگ پڑے سوتے ہیں ان کے مزار پر چراغ جلتے ہیں پھول مہکتے ہیں، چڑھاوے چڑھتے ہیں اور لوگ ان کی ذات سے فیض پاتے ہیں۔

اور جب ہندوستان کے مسلمان حکمراں اپنے تخت و تاج کے لئے ایک جگہ سے دوسری جگہ فوج کشی میں مشغول تھے، تو خانقاہوں کے یہ بوریا نشیں انسانوں کے قلوب کی تسخیر کر رہے تھے، رفتہ رفتہ دو متوازی حکومتیں قائم ہو گئیں، ایک تو ان کی تھی، جن کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں، اور ایک ان کی جن کے گھروں میں فقر و فاقہ تھا، اور جب یہاں کے باشندے مسلمان حکمرانوں کی تلوار کو اسلام کی تلوار سمجھ کر اس سے آزردہ اور خوف زدہ ہو رہے تھے، تو ان فقر و فاقہ والوں کے ذریعہ ہندوستان میں اسلام کے باطنی مزاج کو دیکھ کر، ان کے دلوں میں اسلام کی سچی عظمت اور شوکت قائم ہو رہی تھی، اور خود مسلمان عوام ان ہی کے نمونے دیکھ کر اپنے اخلاق و کردار سنوار رہے تھے۔ کیونکہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا، کہ مسلمانوں کے اعلیٰ اخلاق کی تعلیم کا مرکز علماء کا طبقہ، درس و تدریس یا ان کا مسکن نہیں رہا، اور نہ سلاطین کے درباروں میں اس کے جلوے دکھائی دیئے، بلکہ مسلمانوں نے ایثار، محبت، خودداری، رواداری، انسان دوستی، توکل اور تحمل جیسے اخلاق حمیدہ کی تعلیم ان صوفیہ کرام کی خانقاہوں میں ہوئی۔

علماء صوفیہ کے آستانے پر

جن علماء نے ان بزرگوں کی مخالفت کی، اس سے ان بزرگوں کی ذات کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچا، اور نہ عوام اس سے متاثر ہوئے، البتہ ان کے ذہن میں یہ انتشار ضرور پیدا ہو گیا، کہ علماء اور صوفیہ دو علیحدہ چیزیں ہیں، یہ انتشار اس وقت دور ہو جاتا جب علماء خود صوفیہ کے آستانے پر آکر جھک جاتے۔ اور اس کی مثالیں بکثرت ہیں، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے خلیفہ حضرت برہان الدین غریب دولت آباد پہنچے، تو وہاں کے ایک عالم مولانا سید زین الدین کو اپنے علم کا بڑا غرور تھا، وہ صوفیہ اور مشائخ سے دور بھاگتے، اور ان کے متعلق اچھے الفاظ استعمال نہ کرتے، لیکن رفتہ رفتہ وہ حضرت برہان الدین غریب کے قائل ہوتے گئے، اور ایک روز ان کی قیام گاہ

پہنچے تو جب سامنا ہوا تو دوڑ کر اپنی پیشانی ان کے قدموں پر جھکا دی، حضرت برہان الدین نے فرمایا ہاں مولانا! یہ رسم شریعت میں جائز نہیں۔ مولانا نے کہا جب تک میں اس رسم کو شریعت کے خلاف جانتا تھا، نعمت باطنی سے محروم تھا۔

دہلی کے مولانا نصیر الدین قاسم اپنے علم اور تقویٰ میں بہت مشہور تھے، ان کے استاد مولانا معین الدین عمرانی کو ان پر فخر تھا، لیکن وہ حضرت سید گیسو دراز کے قائل نہ تھے۔ لیکن آخر میں ان سے بیعت ہو گئے مولانا معین الدین عمرانی کو اس کی خبر ہوئی۔ تو مولانا نصیر الدین قاسم کو بلا کر کہا تم تو خود عالم تھے پھر سید محمد کے مرید کیوں ہو گئے، مولانا نصیر الدین نے عرض کیا پہلے عالم تھا، اب حضرت مخدوم کے سامنے مسلمان ہوا ہوں۔

وحدت الوجود کا تنازعہ

حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت شاہ ولی اللہ بڑے پایہ کے عالم تھے، اور کہا جاتا ہے کہ ان کے نور باطن میں شرارۂ علم زر خالص کی طرح اس لئے چمکا، کہ دونوں سلوک کی آتشیں راہیں طے کرکے اپنی منزل مقصود کو پہنچے، اور دونوں کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ علماء اور صوفیہ کے اختلافات کو کم کرکے ایک دوسرے سے قریب تر کیا، اور پھر دونوں نے خود تصوف کو آب زلال سے دھونے کی کوشش کی اس سلسلہ میں انھوں نے وحدت الوجود کے متنازعہ فیہ مسئلہ میں بڑی وضاحت پیدا کی، اس مسئلہ سے علماء اور صوفیہ میں بڑی تلخیاں پیدا ہوتی رہی ہیں۔

میرا خیال ہے کہ ہندوستان میں وحدت الوجود کی علمی بحث سب سے پہلے حضرت شرف الدین یحییٰ کے مکتوبات سے شروع ہوتی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ مجاہدہ اور ریاضت کی کثرت سے سالک السا مستغرق ہو جاتا ہے، کہ عالم جو آئینہ حیرت ہے، اس کو نظر نہیں آتا، ساری ہستیاں اس کی نظر میں گم ہو جاتی ہیں، اور وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کچھ اور نہیں دیکھتا، اس پر فنائیت طاری ہوتی ہے اس کو فنا فی التوحید یعنی ہمہ اوست کہتے ہیں، فنا فی التوحید کے بعد بھی ایک مرتبہ ہے جس کا نام الفنا عن الفنا ہے، اس مرتبہ میں سالک کو کمال استغراق میں اپنی فنائیت کی بھی خبر نہیں ہوتی اور وہ خدا کے جلال اور جمال میں کوئی فرق اور تمیز نہیں کر سکتا، کیونکہ یہ تمیز باقی رہ جاتی ہے تو یہ تفرقہ کی دلیل ہے، عین الجمع اور جمع الجمع کا مقام اسی وقت حاصل ہوتا ہے، جب سالک اپنے کو اور

کل کائنات کو خدا کے دریائے نور میں غرق کر دیتا ہے، اور اس کو خبر نہیں ہوتی ہے، کہ کون اور کیا غرق ہوا اس مقام تقرب میں پہنچ کر سالک کو وحدت الوجود کی حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے اور وہ ایسا محو ہو جاتا ہے کہ اس کو اسم و رسم وجود و عدم عبارت و اشارت، عرش و فرش اور اثر و خبر سے کوئی واقفیت نہیں ہوتی، اور اس مقام کے سوا کہیں اور جلوہ گر نہیں ہوتا، یہاں کے سوا اس کا نشان کہیں اور ظاہر نہیں ہوتا، اس جگہ حضرت شرف الدین یحییٰ منیری نے بطور انتباہ لکھا ہے، کہ توحید وجودی علم کے درجہ میں ہو یا شہود کے ابتدائی درجہ سے انتہائی درجہ میں ہو، ہر درجہ میں بندہ بندہ ہے، خدا خدا ہے، اس لئے انا الحق سبحانی ما اعظم شانی (میں خدا ہوں، میں پاک ہوں اور میری شان کس قدر بڑی ہے)
وغیرہ کہنا کلمات کفر ہیں۔

وحدت الوجود کی زیادہ تفصیلی بحث حضرت اشرف جہانگیر سمنانی کے یہاں ملتی ہے، ان کے نزدیک ہمہ اوست ہی حقیقت توحید ہے، اور اس کو انھوں نے آیات قرآنی، احادیث نبوی اور دوسرے دلائل سے صحیح ثابت کیا ہے، اس دور میں جتنی بحثیں ہوتی رہیں ان میں شریعت کا دامن کسی حال میں نہیں چھوڑا گیا، مگر آگے چل کر یہ ایک مستقل فتنہ بن گیا، اور کچھ ایسے صوفیہ پیدا ہو گئے، جو توحید وجودی کے آڑ میں شرعی احکام سے مداہنت اور اغماض کرنے لگے۔ اور ان کے دلائل یہ تھے۔ کہ شریعت حقیقت کا چھلکا ہے، اور حقیقت شریعت کا گودا ہے، اور جب حقیقت حاصل ہو جائے تو شریعت کی ضرورت باقی نہیں شریعت کے آنے کا مطلب یہ تھا کہ معرفت حاصل ہو اور جب معرفت حاصل ہو جائے تو شریعت کی پابندی سے آزادی ہو جاتی ہے، شرعی احکام کی پابندیاں صرف عوام کے لئے ہیں، خواص امت کو معرفت حاصل ہو جاتی ہے تو پھر ان کو نماز و روزے کی ضرورت باقی نہیں رہتی، کیونکہ نماز کی بنیاد تو اس پر ہے کہ آدمی اور خدا دو جداگانہ چیزیں یعنی غیر و غیریت پر مبنی ہے، اور جب یہ غیریت دور ہو جائے تو پھر نماز کی پابندی بیکار چیز ہے، وہ عذاب ثواب کے بھی منکر ہو گئے، کیونکہ وہ کہتے کہ وہ وحدت سے نکل کر کثرت میں آئے اور کثرت سے وحدت میں گم ہو جائیں گے اور پھر ایسے صوفیہ طرح طرح کی بدعتوں میں مبتلا ہونے لگے، مثلاً وہ اپنے مریدوں کو حکم دیتے کہ وہ ان کو سجدہ کریں، وہ حسین و جمیل صورتوں کی صحبتوں کو زیادہ پسند کرنے لگے۔

اور کہتے کہ حسن و جمال واجب الوجود سے مستعار ہے، اسی لئے حسینوں کی صحبت رسائی حق کی راہ ہے، وہ سادہ رخوں کے رنگ میں اللہ ہی کے ایسا رنگ دیکھتے اور حسینوں کے غمزوں اور عشووں کے ذریعہ مجازی عشق سے حقیقی عشق تک پہنچنے کا ذریعہ سمجھتے۔

ان خام صوفیوں کی کوتاہ بینی سے نہ صرف تصوف بدنام ہوا بلکہ اسلامی شریعت میں بھی گمراہی اور ضلالت پیدا ہونے لگی۔

حضرت مجدد صاحب کے تجدیدی اور اصلاحی کارناموں کی وجہ سے اس گمراہی میں بڑی رکاوٹ پیدا ہوگئی۔ انھوں نے وحدت الوجود کا ازالہ وحدت شہود کی بحث سے کر دیا، وہ بہت بڑے عالم بھی تھے اور انھوں نے راہ سلوک میں ان تمام منزلوں کو بھی طے کیا تھا، جہاں عام صوفیوں کا طائر خیال بھی نہیں پہنچ سکا تھا، انھوں نے واضح کیا کہ جس مقام پر جا کر صوفیوں کو وحدت الوجود محسوس ہوتا ہے۔ وہ سلوک کی آخری منزل نہیں، بلکہ درمیانی منزلوں کی واردات ہیں جہاں سالک کو محسوس ہوتا ہے کہ وجود ایک ہی ہے، اور اس ایک ذات کے سوا کچھ موجود نہیں، لیکن آگے بڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض وحدت شہود ہے، یعنی صرف ایسا نظر آتا ہے وحدت وجود نہیں یعنی واقع میں ایسا نہیں ہے، اس وحدت شہود کے بعد عبدیت کا مقام آتا ہے، جہاں پہنچ کر خالق کائنات کی جداگانہ حقیقتیں روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہیں، اسی لئے مقام عبدیت اور ایمان بالغیب حضرت مجدد الف ثانی کے یہاں دونوں ایک ہی ہیں۔ حضرت مجدد نے ان علمی مباحث کو کچھ ایسے موثر انداز میں پیش کیا کہ وحدت الوجود کی فتنہ انگیزیاں دب کر رہ گئیں، آگے چل کر حضرت شاہ ولی اللہ نے ان جھگڑوں کو مٹانے کی خاطر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی، کہ اہل وجود اور اہل شہود کے درمیان فقط نزاع لفظی ہے، اور فرق تعبیری ہے، حقیقی اور واقعی نہیں، ان مباحث سے یہ فائدہ ضرور پہنچا کہ وحدت الوجود کا مسئلہ عملی زندگی میں غیر موثر ہو گیا۔ اور یہ شاعروں یا بعض صوفیوں کے یہاں ایک رومانی عقیدہ بن کر رہ گیا۔

اورنگ زیب کے زمانے میں حضرت سرمد شہید کے شطحیات پر بھی علماء نے دار و گیر کی، لیکن ان کی شہادت کے سلسلہ میں بعض ایسے اسباب بھی تھے۔ جن کو بحث میں لانا میرے موضوع سے باہر ہے، البتہ عالمگیری دور میں دارا نے توحید وجودی کو ایک دوسرے رنگ میں پیش کرنا شروع کیا، اس نے

لیف رسالہ حسنات العارفین میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ توحید و معرفت کے منازل و مدارج میں ایک ایسا مقام بھی آتا ہے، جب ایک سالک شریعت، کفر، ایمان، خیر، شر، عبد اور معبود سے بالکل بے نیاز ہو جاتا ہے اور بیخودی میں اس کی زبان سے ایسے کلمات نکلتے ہیں، جو بظاہر مذہب و ایمان کے منافی ہوتے ہیں لیکن وہ قابل مواخذہ نہیں، اور وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ اس کی زبان سے شطحیات صادر ہوئیں اور اسی مقام کے وجد و ذوق میں وہ صوم و صلوٰۃ سے مستغنی ہو گیا، لیکن راسخ العقیدہ علماء نے یہ کہہ کر اس کی مخالفت کی کہ بعض شطحیات ایسی ضرور ہیں جو بعض صوفیائے کرام کی زبانوں سے غیر اختیاری طور پر نکلیں لیکن وہ خود دارا کی طرح ان کے جواز کے قائل نہ تھے، کیونکہ اسلامی تصوف کسی حال میں شریعت کے دائرہ سے الگ نہیں کیا جا سکتا ہے، اور جب دارا نے مجمع البحرین لکھی تو علماء کے حلقہ میں ایک ہلچل پیدا ہو گئی، اس کتاب میں دارا نے اسلام اور ہندو مذہب کو ایک ہی سمندر کے دو دھارے بتلائے ہیں، اور ان دونوں کو ملانے کی کوشش کی ہے، اور یہ بھی بتایا ہے کہ اسلامی تصوف کسی حال میں شریعت کے باہر نہیں اور اس میں اور فلسفۂ ویدانت میں لفظی اختلاف کے سوا کوئی اور فرق نہیں، توحید کے شیدائی ان دونوں میں سے جس کی بھی تقلید کریں حقانیت کی منزل تک پہنچ سکتے ہیں، اس کتاب پر علماء نے دارا کو مرتد قرار دیا اور آگے چل کر اس کے یہی عقائد اس کے زوال اور موت کا سبب بنے، دارا کی اس رواداری اور وسیع المشربی کی وجہ سے ایک گروہ کی رائے ہے، کہ اگر دارا تخت پر بیٹھتا تو ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنت باقی رہتی۔ ایک دوسرا گروہ یہ بھی کہتا ہے کہ دارا کی تخت نشینی سے مسلمانوں کی سلطنت تو باقی رہتی لیکن اسلام ختم ہو گیا ہوتا۔ اورنگ زیب کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنت تو ختم ہو گئی لیکن اسلام باقی رہ گیا۔

اورنگ زیب حضرت مجدد الف ثانی کی تعلیمات سے متاثر رہا، اسی لئے ان کے فرزند ارجمند حضرت محمد معصوم قدس سرہٗ سے برابر رشد و ہدایت پاتا رہا، پہلے ذکر آچکا ہے، کہ حضرت مجدد کے زمانے میں اسلامی معاشرت میں بھی گمراہی پیدا ہو گئی تھی، جس کو حضرت زندیقیت سے تعبیر کرتے تھے، انھوں نے اپنے تجدیدی اور اصلاحی تحریکوں میں سارا زور اس پر دیا کہ ہر مسلمان خواہ بادشاہ ہو

یا ادنیٰ رعایا، عالم ہو یا جاہل، امیر ہو یا غریب، عارف ہو یا سالک اپنے عقائد اور اعمال کو کتاب و سنت کے مطابق صحیح کرے، اور ان ہی علماء اور صوفیہ کا تتبع کیا جائے، جنھوں نے صحابہ کرام اور اسلاف صالحین کے سرچشمے سے فیض اٹھایا ہے، اور شریعت کی پابندی ہر حال میں ضروری ہے۔ اور جو شخص باطن کو درست کرتا ہے، اور ظاہر کو یونہی چھوڑ دیتا ہے، وہ بھی قابل تقلید نہیں، اور جو عارف شرعی احکام کی پابندی کو ضروری نہیں سمجھتے، وہ جاہل ہیں، احوال باطنی کا احکام شرعیہ سے آراستہ ہونا ضروری ہے، اگر علوم لدنیہ کی مطابقت صریح علوم شرعیہ سے نہیں، تو ایسے تمام علوم کو حاصل کرنا الحاد اور بے دینی ہے، اورنگ زیب نے اپنے عہد میں ان تعلیمات کو عمل میں لانے کی کوشش کی۔ گو ایک گروہ یہ بھی کہتا ہے کہ اورنگ زیب کی یہ کوشش بہت زیادہ بارآور نہیں ہوئی۔

صوفیہ کرام اور درباری تعلقات

صوفیہ کا ایک گروہ ایسا بھی تھا، جو حکمراں طبقہ سے میل جول بڑھا کر مخلوق خدا کو فائدہ پہنچانے میں لگا رہا، سہروردیہ سلسلہ کے بزرگوں نے سلاطین کے درباروں تک پہنچنے میں احتراز نہیں کیا، حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانی نے تو شیخ الاسلام کا عہدہ بھی قبول کیا، اور ان کے پوتے حضرت رکن الدین نے تو قطب الدین مبارک خلجی جیسے حکمرانوں کے یہاں بھی جانے میں تامل نہیں کیا اور جب وہ دربار تشریف لے جاتے، تو راستہ میں اپنی سواری تخت رواں کو ٹھہراتے چلتے، تاکہ اہل ضرورت اپنی درخواستیں سلطان کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے ان کی سواری پر ڈال دیں، بعض ضرورت مندوں کی معروضات زبانی بھی سنتے تھے، اور جب دربار پہنچتے تو ان درخواستوں کو سلطان کی خدمت میں پیش کرتے، اور ان پر احکام صادر کراتے اس طرح شاہی قربت سے خلق اللہ کو بڑا فائدہ پہنچتا رہتا۔

صوفیہ کا ایک گروہ ایسا بھی ضرور تھا، جو بادشاہت اور امارت سے بہت دور رہتا تھا کیونکہ وہ فقیری کی شان اپنی گمنامی اور بے نشانی میں سمجھتے تھے، سلاطین اور امراء کے تعلقات سے ذات [illegible] کا قول تھا کہ اغنیا کی صحبت فقراء

کے لئے سم قاتل ہے، وہ سلاطین اور امراء کے نذرانے بھی قبول نہیں کرتے، بلکہ بادشاہوں کی ملاقات کو بھی دنیاوی نجاست تصور کرتے رہے، ایک بار حضرت رکن الدین دہلی سے واپسی میں پاک پٹن میں ٹھہرے اور حضرت بابا گنج شکر کے پوتے اور اس خانقاہ کے سجادہ نشین سے ملاقات کے وقت معانقہ کیا، تو آخر الذکر نے غسل فرمایا کہ ان میں بھی نجاست لگ گئی ہے، حضرت رکن الدین نے ان کے غسل فرمانے پر ان کی احتیاط کو سراہا، اور اپنی ذات سے ندامت کا اظہار کیا۔

صوفیہ کرام کی شان استغنا

لیکن کچھ صوفیہ ایسے بھی گزرے ہیں جن کا تعلق اگر شاہی دربار سے ہو جاتا، تو اس سے کوئی مالی فائدہ اٹھانے سے پرہیز کرتے، اور سلطان التمش حضرت بختیار کاکی کا مرید تھا، اس نے اپنے وزیر کے معرفت کچھ گاؤں کا فرمان لے کر ان کی خدمت میں بھیجا، خواجہ صاحب نے لینے سے انکار کیا اور فرمایا کہ ہمارے خواجگان نے کسی سے گاؤں قبول کیا ہوتا تو ہم بھی قبول کر لیتے، اگر ہم گاؤں لے لیں تو قیامت کے روز اپنے خواجگان کو کیا منہ دکھائیں گے۔

سلطان ناصر الدین محمود نے حضرت فرید الدین گنج شکر کی خدمت میں اپنے وزیر الغ خاں کو چار گاؤں کا فرمان اور ایک کثیر رقم بطور ہدیہ دے کر بھیجا، مگر انھوں نے یہ کہہ کر واپس کر دیا، کہ ان کو دو، جن کو ضرورت ہو، اسی طرح ایک بار ان کی خدمت میں والی اجودھن نے کچھ گاؤں اور نقد رقم پیش کرنے کی کوشش کی، تو فرمایا کہ اگر میں یہ گاؤں اور رقم لے لوں تو مجھے لوگ درویش نہ کہیں گے مال دار کہیں گے، اور درویش دلیہ دار میرا لقب ہو جائے گا، اور اگر امراء کرکے سلاطین اور امراء کچھ نذرانے اکابر صوفیہ کو پیش کرتے، تو وہ ایک ہاتھ سے لے کر دوسرے ہاتھ سے مساکین اور محتاجوں میں تقسیم کر دیتے۔"

سلطان محمد تغلق نے حضرت شیخ قطب الدین منور کے پاس شہزادہ فیروز اور ضیاء الدین برنی کو ایک لاکھ تنکہ دے کر ان کے پاس بھیجا، شیخ نے اتنی بڑی رقم دیکھ کر فرمایا: یہ درویش ایک لاکھ تنکے سے کر کیا کرے گا، شہزادہ فیروز اور مولانا ضیاء الدین سلطان کے پاس واپس گئے،

وہ ان دونوں کو اپنے سے بالکل علیحدہ پاتا۔ اس سے مسلمان ایک ذہنی کش مکش میں مبتلا ہو گئے، وہ کبھی اپنے جان و مال کے نگہبان، کبھی اپنے ایمان کے پاسبان اور کبھی اپنی روح کے محافظ کو تاکتے، اور زبان حال سے ان تینوں میں ہم آہنگی اور باہمی ربط کے خواہاں ہوتے، لیکن کوئی تحریک اور قوت ایسی پیدا نہیں ہوئی، جو ان میں یگانگت پیدا کر دیتی۔ اسی لئے مسلمان کبھی بادشاہ کے ساتھ ہو جاتے۔ کبھی علماء کے سایۂ عاطفت میں پناہ لیتے اور کبھی صوفیہ کرام کا دامن تھامتے، اور اس ذہنی بحران کی وجہ سے قوم میں اجتماعی اتحاد اور ملی یکانگت پیدا نہ ہو سکی، اور وہ نہ صرف درباروں بلکہ علماء کے حلقوں اور خانقاہوں کے اندر بھی علیحدہ علیحدہ گروہوں میں تقسیم ہو کر اپنی جماعتی، اور قومی زندگی کو کھوکھلی بناتے رہے، وہ برسر اقتدار اس وقت تک رہے، جب تک ان کے حکمرانوں کی قوت برقرار رہی، اور جب یہ قوت کمزور ہو گئی تو انھوں نے خود محسوس کیا، کہ ان کے قوائے عمل شل ہو کر رہ گئے ہیں اور ان میں وہ کردار اور بلند اخلاق، عادات اور وہ فکر و عمل باقی نہیں، جس سے وہ اپنی حکومت کو برقرار رکھ سکیں۔

شیخ محمّد عبدہ

(جناب ضیاء الحسن فاروقی)

تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ زندگی کے آخری لمحات میں شیخ محمد عبدہ کی زبان پر یہ اشعار تھے:

ولست اُبالی ان یقال محمدٌ — اُبَلَّ أواکتظت علیہ المآتم

ولکن دیناً قداُردت صلاحہٗ — أحاذر ان تقضی علیہ العمائم

یعنی شیخ مرحوم کو نہ تو اپنی صحت یابی کی فکر تھی اور نہ اس کی کہ مرنے کے بعد لوگ اُن کے ماتم کرتے ہیں یا نہیں، فکر تھی تو صرف یہ کہ دین کی اصلاح اور ترقی کے لئے انھوں نے جو جدوجہد کی تھی، اس کا انجام کیا ہوگا اور دستار اور عمامے والی قوم اس کے بارے میں کیا فتویٰ دے گی، دوسرے لفظوں میں یہ کہ انھیں نئی روشنی والوں کی طرف سے کوئی اندیشہ نہیں تھا، اندیشہ تھا تو جبّہ و دستار کی طرف سے جس نے ہمیشہ اپنے ہی مُصلحوں کی کاوشوں کو اپنی تنگ نظری کا ہدف بنایا ہے۔

شیخ محمد عبدہ (۱۸۴۹ء — ۱۹۰۵ء) کا جب انتقال ہوا تو ساری اسلامی دنیا نے اُن کا سوگ منایا، کیسا سوگ اور کس پیمانہ کا ماتم — اس کا اندازہ آج بھی ہم رشید رضا کی کتاب تاریخ الاستاذ الامام (الجزء الثالث) سے کرسکتے ہیں۔ جو مختلف ملکوں کے جرائد و رسائل کے مقالات اور علماء و فضلاء کے بیانات پر مشتمل ہے،

سوال یہ ہے کہ دیارِ مصر کے اس مفتی کی شخصیت اور کارناموں میں کون سی ایسی بات تھی جس کی وجہ سے اس کی موت کو عالَم کی موت تصور کیا گیا اور اس کی وفات کو مسلمانوں ہی کا نہیں بلکہ اسلام کا ایک حادثہ قرار دیا گیا۔

مشہور مسیحی صحافی اور مصنف جرجی زیدان نے مشاہیر الشرق (الجزء الاول) میں لکھا ہے کہ شیخ مرحوم کے والد کاشتکار تھے اور ان کے دوسرے بیٹے کاشتکاری کے پیشے میں لگے ہوئے تھے، لیکن انھوں نے محمد میں ذہانت اور ذکاوت کے آثار دیکھے اس لئے انھیں گاؤں کے مکتب میں بھیجدیا جہاں انھوں نے کلام مجید

حفظ کیا، اس کے بعد وہ ۱۸۶۲ء میں طنطا آئے اور الجامع الاحمدی میں داخل ہو گئے، یہاں ان کا قیام تین سال رہا، طنطا میں انھیں ذہنی آسودگی نہیں میسر آئی اور انھوں نے تعلیم ہی کو خیرباد کہنے کا ارادہ کر لیا، لیکن اس روحانی اور ذہنی اضطراب کی منزل میں ان کے چچا نے ان کا ہاتھ پکڑا، انھیں حصولِ تعلیم پر مائل کیا اور تصوف کی راہ دکھائی۔ اسی سال وہ آزہر آئے، قیام ازہر کے زمانے میں تصوف سے ان کا شغف بہت بڑھ گیا، ان کا زیادہ وقت ریاضت اور مراقبہ میں گزرتا یہاں تک کہ ترکِ دنیا کی منزل سے آگے، اس موقع پر ایک بار پھر ان کے چچا نے ان کو سنبھالا دیا اور ترک علائق سے انھیں باز رکھا۔ بہر حال آزہر کو جب انھوں نے چھوڑا تو بے اطمینانی کی حالت میں، غالباً وہ آزہر کے شیوخ سے بہت کم استفادہ کر سکے، اس کی وجہ یہ تھی کہ شیخ جامعہ ازہر کے طریقہ تعلیم کی خرابیوں سے نالاں تھے، انھوں نے ازہر سے اپنے تہی داماں اٹھنے کا بڑا سبب "فساد طریقۃ التعلیم" ہی کو بتایا ہے۔

اس کے بعد وہ خود اپنے طریقہ سے مطالعہ کرتے رہے، اس سے انھیں لذت علم کی دولت میسر آئی، ان کے علم کو گہرائی اور اُن کے فکر کو گیرائی نصیب ہوئی، حسن اتفاق سے ۱۸۷۱ء میں مصر کی سرزمین پر جمال الدین افغانی نے قدم رکھا، یہ ایک بڑا واقعہ تھا، افغانی کی شخصیت میں وہ جاذبیت تھی جو بے چین روحوں کو پروانہ وار اپنی طرف کھینچ لیتی تھی، چنانچہ محمد عبدہ بھی مصری نوجوانوں کی ایک جماعت کے ساتھ ان کے حلقہ میں بیٹھنے لگے، محمد عبدہ نے اپنی جودتِ طبع کی بدولت افغانی کے درس میں ایک نئی بات محسوس کی کہ یہ عجمی "فیلسوف" روایتی علم کو ایک نئے انداز سے پیش کرتا ہے، یورپ کے اُن علمی کارناموں کی قدر کرتا ہے جو ترجموں کے ذریعہ ان تک پہنچے ہیں، نوجوانوں کو اُن کے مطالعہ کا شوق دلاتا ہے وہ عہدِ جدید میں مسلمانوں کے مسائل کی نوعیت کو سمجھتا ہے اور مسلمانوں کو ان کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ الغرض افغانی کے حلقہ میں انھیں امید کی کرن نظر آئی اور انھوں نے ادب، حکمت اور مذہب کو نئی روشنی میں دیکھنا شروع کیا۔ افغانی نے بھی ان کی صلاحیتوں کو پرکھ لیا اور دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے، افغانی نے جب مصر چھوڑا تو اپنے حلقہ والوں سے کہا: "میں جا رہا ہوں لیکن اپنے پیچھے شیخ محمد عبدہ کو چھوڑے جا رہا ہوں، وہ تنہا مصر کے لئے کافی ہیں۔"

کہا جاتا ہے کہ افغانی اس عہد جدید میں عربی صحافت کے بانی ہیں اپنے شاگردوں کو تصنیف و تالیف

اور صحافت کی طرف متوجہ کیا اور خاص طور سے مقصدی صحافت کے اسرار و رموز ان پر واضح کئے۔ اسی کا اثر تھا کہ افغانی کے رخصت ہونے کے بعد محمد عبدہ نے بھی صحافت کی دنیا میں قدم رکھا۔ ۱۸۷۹ء میں وہ دار العلوم میں استاد کی حیثیت سے مقرر کئے گئے، لیکن جلد ہی وہ وہاں سے الگ ہو گئے، اور اپنے وطن واپس چلے گئے، ۱۸۸۰ء میں جب مصر میں لبرل وزارت کی تشکیل ہوئی تو وہ قاہرہ بلائے گئے اور سرکاری گزٹ وقائع مصریہ کے مدیر اعلیٰ مقرر ہوئے۔ محمد عبدہ نے اس کے ذریعہ لبرل خیالات کی اشاعت کی۔

۱۸۸۱ء میں اعرابی پاشا کی مشہور بغاوت ہوئی، محمد عبدہ اس کے حق میں نہیں تھے، لیکن انقلاب کی ناکامی کے نتیجہ میں انھیں بھی ماخوذ ہونا پڑا، اس کی وجہ غالباً ان کے لبرل خیالات اور افغانی سے ان کے تعلقات تھے، بہرحال ۱۸۸۲ء میں وہ جلا وطن کر دیے گئے۔ وطن سے نکل کر وہ پہلے بیروت اور وہاں سے سید جمال الدین کی طلبی پر پیرس چلے گئے۔" پیرس پہنچکر انھوں نے بمعیت سید جمال الدین مشہور عربی اخبار العروۃ الوثقیٰ نکالا جس کے ابھی صرف چودہ ہی پرچے نکلے تھے کہ تمام یورپ کے سیاسی حلقوں میں کھلبلی مچ گئی، انگلستان نے ہندوستان اور مصر میں اس کی اشاعت روک دی، فرانس نے الجزائر اور تیونس میں قدغن کی، اور قیصر یلدز (ترکی) گو ابتدا میں خوش ہوا لیکن پھر اس کی صدائے اصلاح و حریت سے ڈر کر ممنوع الاشاعت قرار دیا۔ پانچ سال کے بعد محمد عبدہ مصر واپس آئے اور اپنی مذہبی اور تعلیمی اصلاح کا سلسلہ شروع کر دیا۔"

مفتی مرحوم کی اس بہت ہی مختصر سوانح میں کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جس میں انقلاب کی گھن گرج سنائی دے، یا افغانی جیسی "آتش زن" شخصیت کی چنگاریاں نظر آئیں، حقیقت یہ ہے کہ استاد اور شاگرد کی شخصیتوں کا یہی فرق تھا، افغانی انقلابی تھے، محمد عبدہ مصلح تھے، افغانی اپنی جد و جہد کا ثمرہ بہت جلد چاہتے تھے، محمد عبدہ تعمیر و اصلاح کی تخم ریزی کر کے نتائج کا انتظار کر سکتے تھے، افغانی میدانِ سیاست کے مرد تھے، محمد عبدہ کا خیال تھا کہ پہلے ذہنوں میں انقلاب پیدا کرنا چاہیے، ذہنی بیداری ہی پائدار سیاسی انقلاب کا ہراول بن سکتی ہے۔

انیسویں صدی میں مغربی استعمار کے دباؤ کے تحت اسلامی دنیا میں اصلاح و تغیر کی جو تحریکیں

پیدا ہوئیں سب کی بنیاد ایک اور سب کا مقصد ایک تھا" یعنی مسلمانوں کے اندر اُن تمام وسائل ارتقار ذہنی و مادی کو پیدا کرنا جن کی وجہ سے وہ دوبارہ اپنی کھوئی ہوئی عزت حاصل کریں"۔[۵۱]

مولانا آزاد نے ان تحریکوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے[۵۲]:

(۱) سیاسی تحریکیں ــــ یعنی سیاسی تبدیلی کی صورتیں پیدا کی جائیں، مسلم حکومتوں کے باہمی نزاعات دور کئے جائیں اور اسلام کے سیاسی اقتدار کا کوئی مضبوط مرکز قائم ہو۔ ان تحریکوں کے سلسلہ میں امیر نظام (ایران)، مدحت پاشا اور اُس کے ہم مسلک رفقار کا نام آتا ہے" ان سب کے بعد سید جمال الدین اسد آبادی کا ظہور ہوا جس نے اس طریق اصلاح کو اپنے پیشروؤں سے بھی زیادہ قوی اور سریع العمل بنا دینا چاہا"۔

(۲) "الاصلاح الافرنجی" کی تحریکیں ــــ اصلاح افرنجی کی اصطلاح محمد عبدہ کی وضع کی ہوئی ہے، ان تحریکوں کی بنیاد مغربی تمدن کی تحسین واتباع پر رہی ہے۔ غالب تہذیب کی تقلید کی راہ بڑی آسان ہے، اس میں کسی کاوش فکر واجتہاد کا بارگراں نہیں اٹھانا پڑتا، "تہذیب حاضر کو اخذ وحصول کا سرچشمہ بنایا جائے اور باقی دوسری چیزیں جو تقلید کی اس راہ میں حائل ہوں متروک و مردود قرار دی جائیں"۔ شیخ بیرم التونسی صاحب الافادۃ والاعتبار اسی اصول کا داعی تھا۔ ابراہیم پاشا، سید ضمیر الدین پاشا اور علی پاشا مبارک وغیرہ اسی طرز کے لوگ تھے، اور ہندوستان میں سرسید احمد خاں کی تحریک کا مزاج بھی یہی تھا۔

(۳) دینی اصلاح کی تحریکیں ــــ مجموعی طور پر ان تحریکوں کی اساس ان امور پر تھی کہ مسلمانوں کو اسلام کی صحیح تعلیم دی جائے اور "تمام طبقات امت کا جہل دینی دور ہو، اور یہ کام انجام نہیں پا سکتا جب تک علمار کی اصلاح نہ ہو اور ان کا ذہنی جمود و تعطل نہ ٹوٹے۔ علما نئے علوم اور نئی زبانوں کو سیکھیں اور علوم دینیہ وعربیہ کی تعلیم وطرز تعلیم کی اصلاح وتہذیب وتسہیل کی جائے"۔[۵۳]

---

۵۱ مولانا ابوالکلام آزاد، "الہلال"، جلد ۴، نمبر ۴، ۲۸ جنوری ۱۹۱۴ء۔ ۵۲ ایضاً۔ ۵۳ ایضاً۔

مرحوم شیخ محمد عبدہ اس تحریک اصلاح کے ایک بہت بڑے داعی تھے۔ لیکن اس موقع پر یہ کہنا بجا ہوگا کہ مولانا آزاد جیسا نکتہ رس اور باریک بیں عالم بھی مفتی محمد عبدہ کی تحریروں سے یہ نتیجہ نہیں نکال سکا کہ مفتی مرحوم کی دینی اصلاح کا جذبہ صرف اس لئے نہیں تھا کہ نئے زمانے کے تقاضوں کے مطابق کوئی نیا اسلامی علم الکلام پیش کیا جائے، بلکہ دینی اصلاح ایک ذریعہ تھا جس کے سہارے انیسویں صدی کا مسلم ریفارمر مسلمانوں کی اخلاقی اصلاح کرنا چاہتا تھا، مولانا کی تحریروں سے محمد عبدہ کے اصلاحی رجحان کے اس پہلو پر روشنی نہیں پڑتی۔ ہو سکتا ہے کہ مولانا کے نزدیک دینی اصلاح کا مفہوم یہی رہا ہو کہ مذہبی اصلاح کا کام بھی ہو جائے گا۔ لیکن خالص علمی سطح پر دونوں اصطلاحوں کا مفہوم مختلف ہے، پھر ذریعہ کے مقابلہ میں مقصد، کم اہم نہیں ہوتا اس لئے مقصد کو بھی زیادہ واضح کر کے اور زیادہ زور دے کر پیش کرنا چاہیئے۔ افسوس ہے کہ عبدہ کے کم و بیش سارے عرب سوانح نگاروں نے بھی یہی بتلانے کی کوشش کی ہے کہ ان کی زندگی کا خاص مقصد مذہبی اصلاح تھا، غالباً عثمان امین پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس غلطی کی گرفت کی ہے اور کہا ہے کہ مفتی مرحوم کی اصلاحی تحریک کا یہ ایک پہلو تھا اور اہم پہلو تھا لیکن یہی ساری تحریک نہیں تھی،

شروع ہی سے محمد عبدہ کے سامنے مسلم سوسائٹی کا اخلاقی مسئلہ اپنی پوری اہمیت کے ساتھ تھا، اُن کی تحریروں میں، خاص طور سے العروۃ الوثقیٰ کے مقالوں میں حب الوطنی، آزادی اور قربانی و جانفشانی کی قدروں کی اہمیت اور افادیت تکرار کے ساتھ سامنے آتی ہے، وہ اپنے سماج کے افراد میں ان قدروں کو جلوہ گر دیکھنا چاہتے ہیں، مفتی اعظم کی حیثیت سے انھوں نے اجتہاد کی اہمیت اور اجتہاد کی ضرورت کو بہت زور دے کر بیان کیا، اور اس بات کو واضح طور پر پیش کیا کہ آزادی کے ساتھ تفکر و تدبر کا حق مہذب انسان کا بنیادی حق ہے، انھوں نے جرأت کے ساتھ اس کا بھی اعلان کیا اور بار بار کیا کہ علماء کی علمی کاوشیں بے سود ہیں اگر اُن سے عمل کی تحریک نہیں ہوتی اور وہ اعمال و اخلاق سے بے تعلق رہتی ہیں۔[۵]

---

[۵] THE MUSLIM WORLD اپریل ۱۹۴٦ء، صفحہ ۱۵۳،

بہر حال، اگر ہم مفتی مرحوم کی اصلاحی تحریک کا مجموعی طور سے جائزہ لیں اور اس کا خلاصہ بیان کریں تو اس سے بہتر نہیں بیان کر سکتے جو انھوں نے خود العروۃ الوثقیٰ کے پانچویں نمبر کے مقالہ افتتاحیہ کے آخر میں کہا ہے اور جسے مولانا آزاد نے اپنی زبان میں یوں لکھا ہے:

"یعنی اگر ہم قرآن کریم کا تدبر و تفکر کے ساتھ مطالعہ کریں اور پھر اُن تمام حوادث و انقلاب پر نظر ڈالیں جن کی وجہ سے آج تمام عالم اسلامی مبتلائے مصائب و آلام ہے۔ تو ہم پر واضح ہو جائے گا کہ یہ سب کچھ نتیجہ صرف اس امر کا ہے کہ خدا کے حکموں سے ہم نے روگردانی کی، ہدایت قرآنی کی راہ سے ہٹ گئے، اور صراط مستقیم کو چھوڑ کر تابع ہوائے نفس و خطوات الشیطان ہو گئے، اور قرآن کہتا ہے کہ خدا کسی قوم کو کوئی نعمت دے کر پھر واپس نہیں لیتا جب تک کہ وہ خود اپنی صلاحیت کو ضائع نہ کر دے۔

پس علماء راسخین پر کہ فی الحقیقت جسم ملت کے لئے روح اور امت مرحومہ کے قدرتی پیشوا ہیں، فرض ہے کہ سب سے پہلے بیدار ہوں اور غافلوں کو بیدار کریں ..... اگر انھوں نے قوم کو بیدار نہ کیا اور اس کی گذری ہوئی حالت تک نہ لوٹایا جو عصر نبوت اور صحابہ کرام کے وقت تھی، اور نیز تمام بدعات و زوائد اور اعمال سیئہ خلاف قرآن و سنت کی ظلمت سے مسلمانوں کو باہر نہ نکالا، تو یہ یقینی ہے کہ وہ وقت آخر اس قوم کے لئے بھی آنے والا ہے جو امم ماضیہ پر آچکا ہے[1]"

دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مفتی مرحوم کے اصلاحی پروگرام کے دو بنیادی اصول تھے (۱) کتاب و سنت کی پابندی اور (۲) علما کی بیداری اور شریعت کی اصلی و حقیقی تعلیم کی دعوت اور اشاعت، اُن کی تحریروں اور ان کی تمام سرگرمیوں میں اساسی طور پر یہی اصول کارفرما ہے۔ ازہر سے وہ مایوس تھے، سیکولر تعلیم سے بھی وہ کوئی امید نہیں رکھتے، ان کا یقین یہ تھا کہ اگر علماء کی اصلاح ہو جائے اور اُن کی ایک فعّال اور با اثر جماعت بن جائے تو مسلمانوں کی اصلاح

---

[1] مولانا آزاد، الہلال، جلد ۴، نمبر ۴، ۱۱ر فروری ۱۹۱۴ء

ہو سکتی ہے اور وہ اس عہد جدید میں ایک باوقار ملت کی حیثیت سے زندہ رہ سکتے ہیں۔

اعرابی کی بغاوت کے بعد جب وہ بیروت میں جلا وطنی کی زندگی گذار رہے تھے تو انھوں نے احیاء تعلیم علوم دینیہ اسلامیہ کی ایک مبسوط اور مفصل اسکیم لکھی اور لائحۃ الاصلاح والتعلیم الدینی" کے نام سے بذریعہ شیخ الاسلام سلطان عبدالحمید کے حضور میں پیش کی[1]۔ مقصود یہ تھا کہ قسطنطنیہ میں سلطان کی سرپرستی میں ایک جامعۂ اسلامیہ قائم ہو جس میں نئے طرز کا نصاب پڑھایا جائے، اور اس طرح رفتہ رفتہ بالغ النظر علماء کی ایک جماعت تیار ہو جائے، لیکن عبدالحمید کا عقیدہ یہ تھا کہ اصلاح و تجدید کی کوئی اسکیم خواہ وہ کسی نوعیت کی ہو اس کے استبداد کے لیے مہلک ہوگی، اس لئے اس نے اس طرف کوئی توجہ نہیں دی، اس کے بعد ازہر کی اصلاح کرنا چاہی مگر وہاں سے بھی انھیں استعفا دینا پڑا، پھر مدرسۂ دارالعلوم کا کام شروع کیا مگر اس سے بھی جو مقصود تھا وہ حاصل نہ ہوا بہرحال وہ تمام عمر اس کوشش میں سرگرداں رہے کہ مذہبی تعلیم کی اصلاح و تجدید ہو اور ایسے صالح علماء اور راسخین تیار کئے جائیں جو دین کی اساس پر نئے عہد کے تقاضوں کے مطابق مسلمانوں کی اصلاح کا کام کرتے رہیں۔

اعلیٰ مذہبی تعلیم کی اصلاح کے علاوہ مفتی محمد عبدہ نے مذہبی اصلاح و تجدید کی بھی کوشش کی اور بڑی حد تک اس مقصد سے کی کہ اس میں اور صرف اسی میں مسلمانوں کی اخلاقی اصلاح کے امکانات انھیں نظر آتے تھے، کتاب و سنت کی حقیقی تعلیم پر غیر صوفیانہ تصورات اور صدیوں کے تباہ کن اثرات کے جو پردے پڑے ہوئے تھے، مفتی مرحوم اُن کو ہٹا کر اسلامی تعلیمات کے صحیح خدوخال نمایاں کرنا چاہتے تھے، رسالۃ التوحید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ 'عقل' کے دشمن نہیں تھے، توحید اور نبوت کے مباحث کو وہ 'عقلیت' سے ماوراء نہیں تصور کرتے تھے، ان کا عقیدہ تھا کہ ان کو خالص عقل کے سہارے ثابت کیا جا سکتا ہے، ان کی نظر میں اسلام کی یہی وہ خصوصیت ہے جو دوسرے مذاہب میں نہیں ملتی، اُن کا خیال تھا کہ عہد وسطیٰ میں اسلامی تھیالوجی کا جو ڈھانچہ کھڑا کیا گیا تھا وہ پورے طور پر

---

[1] مولانا آزاد، الہلال، جلد ۴، نمبر ۳، ۱۱ فروری ۱۹۱۴ء

قرآنی نہیں تھا، مسلم فلسفیوں پر جو ہیلینی اثرات تھے، ان کی تہذیب وہ توازن اور ہم آہنگی کے ساتھ نہیں کر سکے، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ان کے قابو میں نہیں رہے۔ امام غزالی نے ان کی گرفت کی لیکن وہ بھی توازن کھو بیٹھے اور امام مرحوم کے پیروؤں نے تو اور بھی غیر متوازن ہونے کا ثبوت دیا، اسلامی تھیالوجی کو اس بات سے بھی نقصان پہنچا کہ اسلام کی سیاسی توسیع اور نئی عجمی قوموں میں اسلام کی اشاعت بڑی تیزی کے ساتھ ہوئی، اور اس سرعت کا مقابلہ تھیالوجی کی ترتیب و تدوین کی تدریج ترقی نہیں کر سکی نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیئے تھا، یعنی مختلف النوع افکار و خیالات عقائد و اعمال، رسم و رواج اور عرف و عادات کا کوئی ایسا متوازن سسٹم نہیں بن سکا، جس کی اساس مطلق قرآنی ہوتی، اور یہی وجہ ہے کہ عہد جدید میں عہد وسطیٰ کے پورے کلامی نظام پر نظر ثانی اور جدید تصورات کی روشنی میں اسلامی عقائد کی تشریح کی ضرورت ہے، یہ کام اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک آرتھوڈوکس تھیالوجی پر عمل جراحی نہ کیا جائے اور اس سے گذر کر قرآن و سنت کی اصل تعلیم کو نہ سمجھا جائے۔ اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ مفتی محمد عبدہ عہد وسطیٰ کی تاریخ اور اس کے کارناموں سے منکر تھے، وہ انہیں تسلیم کرتے تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ تنقیدی نقطۂ نظر کی تبلیغ کرتے تھے، ان کا عقیدہ تھا کہ تاریخی نقد و نظر سے کام لے کر اور آرتھوڈوکس تھیالوجی کی تنگنائیوں سے نکل کر علماء کو "موڈرن ازم" کی کھلی فضا میں آنا چاہیئے، ہندوستان میں شبلی نے سرسید مکتب خیال کے رد عمل کے طور پر، اس میدان میں ٹھوکر کھائی اور تجدید و اصلاح کے بجائے یہ کوشش کی کہ آرتھوڈوکسی کو کسی قدر وسیع الخیال بنایا جائے، انجام یہ ہوا کہ وہ تمام عمر روایات کے چکر سے نہیں نکل سکے اور "جدیدیت" سے بیزار رہے، برخلاف اس کے مفتی محمد عبدہ نے روایتی تھیالوجی کی اصطلاحوں سے کام تو لیا لیکن اس لئے کہ "جدیدیت" کے لئے فضا ہموار کریں اور یہی اُن کا نمایاں کام ہے۔ یہ بات وہ جرأت کے ساتھ اس لئے کہہ سکے کہ وہ "تقدیم العقل علی الظاہر الشرع" کے اصول پر ایمان رکھتے تھے، اُن کا عقیدہ تھا کہ دین کی اساس تفکر و تدبر ہے اور تفکر و تدبر بغیر عقل کے ممکن نہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ اندھی تقلید کے سخت مخالف، پیر پرستی کے سخت دشمن اور اوہام و مُضر روایات کے باغی تھے، اور یہی سبب ہے کہ وہ "مغربی تہذیب" کی اچھی قدروں کو اپنانے کے لئے آمادہ رہتے تھے۔

دیا جب رنج بتوں نے......

جناب عبداللہ ولی بخش قادری

بُت تراشی اور بُت پرستی انسانی فطرت میں داخل ہے۔ شعور کی بیداری کے ساتھ یہ کاروبار شروع ہوتا ہے اور حالات کے مطابق اس میں گرمیٔ بازار آتی ہے۔ ہر کس وناکس بقدرِ ظرف اپنے اصنام کی تخلیق کرتا ہے اور خود ہی اپنی مخلوق کا پجاری بن بیٹھتا ہے۔ بس یہی متاعِ سوز وسازِ زندگی ہے اور یہی وہ دوسرے ہیں جن کے درمیان ساری داستانِ حیات بنتی اور بگڑتی ہے۔ انسان اپنے حقیقی بُت، مٹی یا پتھر سے نہیں بناتا۔ وہ کسی دھات کے بھی نہیں ہوتے۔ دراصل وہ کسی مادّی پیکر کے رہینِ منت ہوتے ہی نہیں۔ انہیں واقعات وحادثات کے چاک پر رکھ کر کردار کے ردِ عمل سے بنایا جاتا ہے۔ ان کا خمیر فکر ونظر ہے۔ انہیں آپ آرزو کہیے یا خواہش، حسرت بتلائیے یا تمنّا امید سمجھیے یا ارمان۔ یہ سب وہی خودساختہ بُت ہیں جن کی پرستش میں عمرِ عزیز بیتا کرتی ہے۔ ان سب کا مسکن خلوت کدۂ دل ہے جہاں ان سب کو سجایا جاتا ہے۔ ان میں بھی حفظِ مراتب ہوتا ہے۔ اور یہ بھی وقتی یا مستقل، معیّن اور غیر معیّن ہوا کرتے ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک شخص اپنے اپنے بُت سینے سے لگائے بیٹھا رہتا ہے۔ اُن سے مطلب براری بھی نہیں ہوتی تاہم لوحِ دل سے اپنے بنائے ہوئے نقوش مٹانے کا یارا نہیں ہوتا۔ جب کبھی حقائق کی چٹان پر گر کر کوئی بُت پاش پاش ہو جاتا ہے تب بھی اس کو بالکل جُدا کرنے میں وقار مانع آتا ہے۔ کبھی کسی خذف ریزے کو دل میں رکھ لیا جاتا ہے، کبھی ضد کر کے ازسرِ نو اس جیسے کئی اور صنم تیار کر لئے جاتے ہیں۔ اور کبھی کسی دوسرے قبیلے کے بُت کو مسند نشین بنا لیا جاتا ہے۔

دراصل یہ ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کا معاملہ ہے۔ اس طرح جب کبھی آرزوؤں کی بساط قطعی طور پر درہم برہم ہو جاتی ہے اور حقائق سے آنکھ ملانے کی جرأت باقی نہیں رہتی تو

احساسِ محرومی و ناکامی کو قابلِ قبول بنانے کے لیے ہمارا ذہنِ رسا بہت سی دھوکے کی ٹٹیاں اپنے آگے کھڑی کر لیا کرتا ہے تاکہ شکستِ فاش کا گمان دل سے محو ہو جائے۔ اس ملمع سازی کے عمل سے خامیوں کے چہرے پر وقتی طور پر نقاب پڑ جاتی ہے اور اعتراف کی آزمائش سے بچ نکلنے کا موقع ہاتھ آجاتا ہے۔ ان خود فریبیوں کی ایک شکل تلافی کی کوشش میں بھی نکل آتی ہے۔ اس صورت میں کسی خصوصیت پر بے جا زور دے کر اُسے طرۂ امتیاز بنا لیا جاتا ہے تاکہ دوسرے کمزور پہلوؤں پر نظر نہ پڑے اور ایک کمی کا دوسری زیادتی سے تدارک ہو سکے۔ آپ نے لکیر کے فقیر دیکھے ہوں گے جو بس ایک ہی ڈگر پر چلتے ہیں ان کا بھی یک طرفہ جھکاؤ اور طبیعت کی یک رنگی شدت اختیار کر جائے تو انھیں خبطی بنا دیتی ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ دیوانہ لاکھ بکارِ خویش ہوشیار ہو، وہ بہرحال دیوانہ ہے۔ تلافی کی ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ اسی ایک کمی کو پورا کرنے کے لئے اپنے آپ کو تج دیا جائے اور وہ ایک نقطہ ہی مرکزِ حیات بن کر رہ جائے۔ جان جائے، آن نہ جائے والا معاملہ ہو، اس غیر معمولی جوش میں کبھی نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ تلافی کے بجائے اضافہ ہو جاتا ہے لیکن اس تگ و دو سے اصل مقصد پھر بھی حاصل نہیں ہوتا۔ ذہنی توازن قائم نہیں ہو پاتا اور شخصیت کی ترازو کا پلہ کسی نہ کسی طرف جھکا ہی رہتا ہے۔ تلافی کے ان دو نمایاں طریقوں کی مختلف اور متعدد صورتیں ہوا کرتی ہیں۔ بچپن میں اس کیفیت کے مظاہرے بڑے کھلے دل سے کیے جاتے ہیں۔ بچوں کا دنگا پکار، مار پیٹ، چھیڑ چھاڑ سب اپنے وجود کو تسلیم کرنے کے مختلف ڈھنگ ہوا کرتے ہیں۔ جب ان پر بھی بڑوں کی گرفت ہونے لگتی ہے تو شرارت پر کمر باندھ لی جاتی ہے۔ ذرا سمجھ آئی تو باقاعدہ جھوٹ بولنے لگے، اُٹھائی گیرا پن پیدا ہو گیا۔ بدتمیزی کرنے لگے۔ گستاخ ہو گئے۔ نوجوانی کی امنگ آتے آتے اظہارِ جنسی پر اُتر آئے۔ طبیعت میں شہدہ پن داخل ہو گیا۔ اور ایسے ہی دوسرے کرتوت جنھیں طفلانہ حرکتوں سے تعبیر کیا جاتا ہے، اختیار کر لیے جاتے ہیں۔ ایک نحیف الجثہ لڑکا، فٹ بال کھیلنے کی ضد کرتا ہے دوسرا کھلاڑی لڑکا، کتابوں کی تحقیر کیا کرتا ہے۔ ایک محنتی اور ذہین طالب علم، میدانی کھیلوں میں اپنی عدمِ شرکت کو فخریہ بیان کرتا ہے۔ یہ سب کس لئے؟ دراصل یہ وہی ہیں جنھیں اپنی کسی کوتاہی کا بڑا قلق ہے اور صورتِ حال کی طرف ایک صحتمندانہ نظریہ رکھنے کے بجائے کچھ اس طرح تاؤ کھا گئے

ہیں کہ کسی اور طرف نظر اٹھا کر دیکھتے ہی نہیں۔ وہ ایک ہی میدان میں اپنی کارگزاری کا ایسا سکّہ جمانا چاہتے ہیں کہ دوسری تمام کمزوریوں کا تدارک ہو جائے۔ بڑوں کے مسائل بھی بڑے ہوتے ہیں تحصیل علم، فکر معیشت، غمِ روزگار، اس چند روزہ زلیست میں سب ہی تقاضے سہنے پڑتے ہیں۔ مزید برآں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ روز بروز زمین سخت اور آسمان دور ہوتا جاتا ہے، اور نوبت یہ آجاتی ہے کہ شوق کا سارا کاروبار لٹ کر رہ جاتا ہے اور امید کا سب کھیل بگڑ جاتا ہے ایسی صورت میں حقیقت سے آنکھیں چار کرنے کی جرأت باقی نہیں رہتی اور بہت سے مردان کار بھی خود کو کھلونوں سے بہلانے لگتے ہیں بے کیف زندگی میں کچھ حرارت پیدا کرنے کے لئے بے سود مشاغل کا سہارا ڈھونڈ لیا جاتا ہے۔ یہ مشغلے ہی زندگی کے اصل کام کا جواز بن جاتے ہیں۔ نئی نئی دلچسپیاں پیدا کر لی جاتی ہیں، گپ شپ، تاش، شطرنج اور ایسی ہی دوسری تضیع اوقات کی ترکیبیں نکال لی جاتی ہیں۔ یہ سب گھڑی دو گھڑی کی ہلکی پھلکی تفریحیں چوبیس گھنٹے کا کام بن کر رہ جاتی ہیں۔ ایں دفترِ بے معنی غرقِ مئے ناب اولیٰ' کا نعرہ لگا کر زندگی کے جھیڑوں سے کترا کر نکل جانے کی یہی صورت، سکون کا باعث بنتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ یوں تو تاریخ عالم میں ایسی بھی داستانیں نکل آئیں گی جو تلافی کی وہ خوشگوار مثالیں ہیں جن سے گلزارِ ہستی میں نکھار آیا۔ لیکن اسی احساس کی بدولت لباسِ انسانیت کے پُرزے اڑانے والے بھی پیدا ہوئے۔ لیکن یہ تو وہ لوگ ہیں جو ایک دھن میں لگ کر رہ گئے۔ اگر راہ نیک تھی تو سماج کو فائدہ بھی پہنچا، اگر بے راہ روی تھی تو نقصان ہوا۔ لیکن وہ راہ، صرف ایک ہی رہی۔ ان کی اپنی شخصیت ہر ایک شئے میں کسی شے کی کمی باقی رہی اور بالآخر کسی حصار میں اپنے آپ کو ایسا مقید کر ڈالا کہ دنیا و مافیہا کی کوئی خبر ہی نہ رہی۔

یہ سب اپنے خبط میں مبتلا تھے۔ ترقی کی تو مجنوں اور دیوانہ ہو گئے۔ لیکن ایسے لوگ بکثرت ہیں جو محض فروعات میں اپنے آپ کو الجھا کر اپنی بے عملی کا تدارک کیا کرتے ہیں۔ یہ محض کاغذی پھولوں سے اپنے آپ کو تسلی دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ان کی زندگی کا کھوکھلا پن تیزی سے بڑھتا رہتا ہے اور یہ فریب کھاتے چلے جاتے ہیں۔ یہ محض ظاہری لیپ پوت پر زندگی کی عمارت کھڑی رکھتے ہیں۔ عجیب عجیب مضحک اور مضحکہ خیز طور طریقوں سے اپنے آپ کو توجہ کا مستحق بناتے ہیں

اپنی ظاہری شکل و صورت میں کچھ ایسے سرخاب کے پَر لگاکر نمودار ہوتے ہیں کہ خواہ مخواہ ان پر نظر پڑے۔ اس طرح روپ سے نہ سہی بہروپ سے ہی تھوڑی سی شانِ امتیاز کا خود کو حقدار بنا لیا جاتا ہے۔ اور دلِ ناصبور کو تھپ تھپانے کا موقع مل جاتا ہے۔ لباس کی انوکھی وضع قطع، مانگ پٹی کا بے جا اہتمام، ناز نخرے کا التزام جیسے تمام ہتھکنڈے عموماً احساسِ کمتری کے غماز ہوتے ہیں۔ معمولی معمولی چیزوں کا غیر معمولی انتظام، ذرا ذرا سی بات پر حد درجہ توجہ، بس ایسے ہی ڈھکوسلے ہیں جن کی اوٹ میں حقائق کی جیک دمک سے اپنی آنکھوں کو خیرہ ہونے سے بچایا جاتا ہے۔ کوئی اپنی نااہلی کی خفّت کو چھپانے کی غرض سے اپنے ماتحتوں پر حفظ ما تقدم کے تحت ہر وقت گرم رہتا ہے، کوئی اپنا سارا رعب داب اپنے متعلقین پر ہی دکھا کر ماحول میں اپنی بے اثری کی کمی پوری کر ڈالتا ہے۔ کوئی نک چڑھا، تنک مزاج یا مرزا پھویا ہو کر رہ جاتا ہے۔ کسی کے ظرف کی تنگی اسے اترانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ذرا سی خوبی بھی انوکھی کا پَرا ہو کر رہ جاتی ہے۔ طبیعت کا چھچھورا پن معمولی معمولی حرکات سے ٹپکنے لگتا ہے۔ کسی کے پاس لے دے کر بس گز بھر کی ایک زبان رہ جاتی ہے۔ ہر ایک پر اسی کی مار لگاتا ہے۔ کسی کے چوٹ لگے یا نہ لگے انھیں محض چونکا دینے سے مزا آجاتا ہے۔ یہ محض طنز کر کے خوش ہو جاتے ہیں۔ انھیں کچھ حاصل نہیں ہوتا لیکن سمجھتے ہیں کہ بڑا تیر مارا۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کارواں گزرتا چلا جاتا ہے اور یہ ضلع جگت، پھبتی، طعن و تشنیع، اعتراض و تنقیص کے آلات سے مسلح اپنے ہوائی فیر کرتے رہتے ہیں۔ اصل نقصان صرف ان کا ہوتا ہے، کسی دوسرے پر کوئی آنچ نہیں آتی۔ لہٰذا بجائے کھسیانی بلّی کی طرح ہر وقت کھمبا نوچتے ہی دکھائی دیتے ہیں۔ ذرا نظر دوڑائیے تو آپ کے آس پاس ہی کوئی نہ کوئی ایسی مریضانہ شخصیت دکھائی دے جائے گی۔ ہمارے ایک شناسا ہیں جن کا سارا زورِ طبیعت محض زبان کی غلطیاں پکڑنے اور تلفظ کی اصلاح کرنے کے کارِ خیر میں صرف ہوا کرتا ہے، ذرا کسی نے زبان کھولی، اور انھوں نے زبان پکڑ لی۔ بولنے والے کو اپنی زبان بگڑنے کا احساس نہیں ہوتا لیکن ان حضرت کا چہرہ ضرور بگڑ جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اب انھوں نے اس کا ٹینٹوا دبایا۔ مختلف طریقے سے پیچ و تاب کھایا کرتے ہیں اور جب تک اپنا

فرض انجام دے نہیں لیتے انھیں چین نصیب نہیں ہوتا۔ یہ سلوک تو محض آدابِ محفل کے خیال سے روا رکھتے ہیں ورنہ براہِ راست ایک ہی حملے میں سیدھے گردن پر سوار نظر آتے ہیں۔ اب عالم یہ ہے کہ اگر کوئی بچہ بھی شامتِ اعمال سے داد فریاد دے کر حاضر ہو گیا ہے تو آپ کی توجہ اولاً اس کی ناہموار گفتگو کی طرف مرکوز ہوتی ہے اور اس کے بعد نفسِ مضمون پر توجہ فرماتے ہیں لیکن ان کی اس نکتہ چینی کا انجام یہ ہے کہ موصوف نے ورثے میں جو زبان پائی تھی، اسی پر آج تک تکیہ ہے مگر جن کی حرف گیری فرماتے رہے ہیں ان میں سے اکثر بحرِ معنی کے جوہر شناس بن چکے ہیں۔ اپنی پستی اور دوسرے کی بلندی دیکھ کر طبیعت اور کڑھتی ہے اور وہ پھر اپنا عمل مزید تشدد سے شروع کر دیتے ہیں۔ اب جس قدر بگڑ کر وہ اصلاح فرماتے ہیں، ستم ظریف احباب اتنی ہی کشادہ دلی سے قہقہہ لگاتے ہیں۔ ان کی جان جلتی ہے، لوگوں کو مزہ آتا ہے۔ کل تک جو عمل طرۂ امتیاز بن کر قدرے سکون پہنچایا کرتا تھا، اب 'چڑ' کے حدود میں داخل ہوتا جا رہا ہے۔ جس پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے!

اس طرح اصل ٹانگوں کے بجائے بیساکھیوں پر چلنے والا اپنے متاع کا عشرِ عشیر بھی بمشکل حاصل کر پاتا ہے۔ اس کی خلش خود فریبیوں کے طفیل کم نہیں ہوا کرتی بلکہ جس بنیادی جذبے کی آسودگی کے لیے یہ جتن کیے جاتے ہیں، اسی بنیادی جذبے کو اس کے طرزِ عمل سے ٹھیس پہنچتی ہے۔ وہ احساسِ کمتری سے بچنا چاہتا ہے لیکن اس کے اوچھے وار اسے اور زیادہ ذلیل و خوار کرتے ہیں اگر آلامِ روزگار کو آسان بنانے کے لیے 'ہر غم، غمِ جاناں' بنایا جاتا ہے تو زندگی کا توازن بگڑتا ہے۔ اگر محض ایک ہنگامے پر گھر کی رونق کو موقوف سمجھ کر 'نغمۂ شادی' کی تلافی 'نوحۂ غم' سے کرنے کی فکر کی جاتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ یہ بات تو بس شاعری ہے۔ جس طرح ٹوپی کی کمی، جوتوں میں اضافہ کر کے پوری نہیں کی جا سکتی، اسی طرح ایک بنیادی ضرورت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں، یہ مناسب ہے کہ سر کو ایک قسم کی ٹوپی نہ ملے تو دوسری قسم کی ٹوپی سے ڈھک لیا جائے، یعنی نعم البدل تلاش کر لیا جائے۔ ایسی صورت میں کوئی نقصان نہیں ہوتا اور شخصیت کا توازن قائم رہتا ہے۔

پہلے تلافی کے عمل کی واحد وجہ احساسِ کمتری کو سمجھا جاتا تھا۔ لیکن نئی تحقیقات نے واضح

کر دیا ہے کہ صرف احساس کمتری اس قسم کی حفاظتی تدابیر کی طرف رجوع نہیں کیا کرتا کیونکہ بہت سے احساس کمتری کے شکار ایسی کسی کوشش میں مشغول نظر نہیں آتے۔ اس کے برخلاف بہت اچھے خاصے بھلے مانس اس طرف جھک پڑتے ہیں۔ اس بنا پر یہ کہنا درست ہے کہ عزت بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے'۔ ہم اپنے آپ کو اپنے ماحول کے طرزِ عمل سے بہت کچھ جانتے اور پہچانتے ہیں۔ اپنے بازار میں جو کچھ ہماری قیمت لگتی ہے، اس سے ہم متاثر ہوتے ہیں۔ کبھی لوگ ہمیں مغالطے میں ڈال دیتے ہیں اور کبھی ہم خود ہنس کی چال دیکھ کر اپنی چال بھول جاتے ہیں۔ ہمیں اپنا ٹھیک طور پر اندازہ نہیں ہو پاتا۔ اور یہی زندگی کا المیہ ہے۔ ہماری توقعات اگر ہمارے حالات سے میل نہیں کھاتیں تو ہم عبرت سرائے دل میں آوازِ دور باش' ہو کر ہی رہنا پڑتا ہے۔ حسرت نے کیا خوب کہا ہے:

غمِ آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں　　مری ہمتوں کی پستی، مرے شوق کی بلندی

لہذا ضرورت یہ ہے کہ حالات کا جائزہ لیا جائے اور اپنی صلاحیتوں کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگا کر اپنی زندگی کا لائحہ عمل تیار کیا جائے اور 'موجِ حوادث سے' ہنستے کھیلتے گذر جانے کی عادت ڈالی جائے۔ یاد رکھئے کہ شہ سوار ہی میدانِ جنگ میں گرتے ہیں۔ اس لئے نہ شکست میں ذلت ہے اور نہ کسی ایک ناکامی میں زندگی کی محرومی۔ کارزارِ حیات میں بہت سے مورچے لگتے ہیں جب فتح نصیب ہوتی ہے تو ان میں ناکام اور کامیاب سب ہی معرکے شامل ہوتے ہیں۔ ہمارے نظریے کی استواری ہماری حقیقت پسندی میں مضمر ہے۔ اگر دل کے صنم کدے میں خیالی پرستان بس گیا تو ان بتوں کا ہٹانا دشوار ہے اور وصال کا سوال نہیں اٹھتا۔ اب اگر ان بتوں سے آخر وقت میں منہ موڑ کر تلافی کی بھی کوئی صورت نکال بھی لی تاہم آسودگی محال ہے۔ اس وقت اس حقیقت کا انکشاف اور سوہان روح بن جائے گا:

خدا کی بے نیازی ہائے مومن　　ہم ایمان لائے تھے نازِ بتاں پر

کامن ویلتھ اور ہندوستان

جناب شاہ عبدالقیوم

سیاست کے میدان میں انگریز قوم کی فراست ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ کامن ویلتھ کی تشکیل دراصل اس قوم کی سیاسی سوجھ بوجھ، مصلحت آمیزی، دور اندیشی اور حکمت عملی کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ وہ تمام قومیں جو آزاد ہونے سے پہلے کسی نہ کسی صورت میں حکومت برطانیہ کے زیر اقتدار تھیں اور جن سے انگریزوں کے سیاسی، تجارتی اور ثقافتی تعلقات تھے اور جہاں یورپ کے کارخانوں کے لئے خام اشیاء کے خزانے اور تیار شدہ مال کی منڈیاں تھیں، انگریزوں نے سوچا کہ وہ آزادی پانے کے بعد برطانیہ سے اس طرح قطع تعلق نہ کرلیں کہ ساری تجارتی سہولتیں ختم ہو جائیں، تمام سیاسی رشتے ٹوٹ جائیں اور قوم جو کل تک حکمران تھیں آج بالکل بے دست و پا ہو کر رہ جائے۔ اسی مقصد کو سامنے رکھ کر کامن ویلتھ کی بنا رکھی گئی۔

ہندوستان کی آزادی سے پہلے یورپ افریقہ اور ایشیا کی جو بھی قومیں اس ادارے کی ممبر تھیں وہ اگرچہ اپنے داخلی معاملات اور خارجہ پالیسی کی تشکیل و تعمیل میں مکمل آزاد تھیں اور کوئی ممبر کسی کے ماتحت نہیں تھا، لیکن پھر بھی انفرادی حیثیت سے ہر ممبر تاج شاہی کا فرمانبردار تھا۔ اس انجمن کے ہر ممبر کے لئے برطانوی انداز کی پارلیمانی جمہوریت کا قیام لازمی تھا۔ جس میں گورنر جنرل کا تقرر تاج برطانیہ کی منظوری سے ہوتا تھا، اور ہر ممبر ملک میں ایک دوسرے کے سفیر ہائی کمشنر کہلاتے تھے، لیکن ہندوستان کی آزادی کے بعد اس انجمن کے ڈھانچے، دستور اور روایات میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ آزاد ہندوستان اس انجمن کا رکن تو بننا چاہتا تھا لیکن تاج برطانیہ کی رسمی پابندی کے لئے آمادہ نہیں تھا۔ بلکہ ایک مکمل آزاد اور خود مختار جمہوریت قائم کرنا چاہتا تھا جس میں حکومت کا سربراہ گورنر جنرل کی بجائے عوام کا منتخب صدر ہو، جس میں

حکومت اپنے دستور اور روایات کی روشنی و ہدایت میں اپنے فرائض انجام دے نہ کہ برطانوی دستور کا پابند ہو۔

ان اہم تبدیلیوں کے بغیر ہندوستان اس انجمن کی ممبری کو کبھی گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ ہندوستان اور انگریز قوم کا ایک عرصۂ دراز تک حاکم و محکوم کا تعلق رہا ہے، اور سیاسی لحاظ سے یہ تعلق کبھی خوشگوار نہیں رہا۔ دور غلامی کی کشمکش کی وجہ سے برطانیہ سے کوئی ایسا رشتہ قائم کرنا ممکن نہیں تھا۔ جس میں مساوی حیثیت نہ ہو۔ اس کے علاوہ دیگر ممبرانِ دولتِ مشترکہ مثلاً نیوزی لینڈ، کینیڈا اور آسٹریلیا وغیرہ کی طرح ہندوستان اور انگلستان میں کوئی تہذیبی، نسلی سماجی یا نظریاتی ہم آہنگی اور یکسانیت بھی نہیں تھی کہ جس کی بنا پر حکومتِ انگلستان سے وابستگی کسی اعزاز یا خوشی کا باعث ہوتی۔ اس کے برخلاف ۴۸-۱۹۴۷ء تک اس میں بھی شبہ تھا کہ ہندوستان کامن ویلتھ میں کسی قسم کی دلچسپی لے گا۔ ملک کی تمام سیاسی پارٹیاں جن کے دل سے برطانوی حکومت کے مظالم کی یاد محو نہیں ہوئی تھی۔ دولتِ مشترکہ سے الحاق کی سخت مخالف تھیں۔ خود کانگریس کے اہم رہنما مخالف تھے، دستور ساز اسمبلی کے ممبران نے بھی اس رشتہ کو مناسب نہیں سمجھا۔ لیکن آزادی ملنے کے کچھ ہی عرصے کے بعد کانگریس کے صفِ اول کے رہنما اور قوم کے دیگر بہی خواہوں نے ان فوائد پر غور کیا کہ جو اس نو آزاد و تقسیم شدہ قوم کو برطانیہ اور دوسرے ترقی یافتہ یورپی ممالک سے اس انجمن کے ذریعہ تعلق قائم رکھنے میں ہو سکتے تھے۔ چنانچہ جے پور کے اجلاس میں کانگریس نے کامن ویلتھ کا ممبر بننے کی قرارداد منظور کی۔ اس موقعے پر اور اس کے بعد کتنی ہی بار مختلف موقعوں پر پنڈت جی نے قوم کے سامنے ان فوائد اور تجارتی و سیاسی سہولتوں کا تذکرہ کیا ہے جو اس ملک کو کامن ویلتھ میں شریک رہنے سے حاصل ہو سکتے ہیں اور ہوئے ہیں۔ ان فوائد کا ایک سرسری جائزہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:-

(۱) ہندوستان ایک آزاد اور خود مختار ملک کی حیثیت سے اس انجمن میں خود اپنی مرضی سے شامل ہوا ہے، کسی کے دباؤ یا اثر سے مجبور ہو کر نہیں، اور آزاد ہے کہ

جب چاہے اپنی مرضی اور مصلحت کے پیش نظر اس سے ناطہ توڑے، کوئی مجبور نہیں کر سکتا کہ ہندوستان اپنے منشار کے خلاف اس ادارے کا ممبر رہے۔

(۲) اس انجمن کے سب ممبر مساوی حیثیت رکھتے ہیں، کسی ملک کی مادی ترقی معاشی خوشحالی اور تہذیبی و معاشرتی آسودگی کسی دوسرے پر فوقیت یا فضیلت نہیں رکھتی۔ سیاسی اعتبار سے اس انجمن کے سب ممبر ایک حیثیت رکھتے ہیں اور ایک حسن سلوک و رواداری کے مستحق ہیں۔

(۳) ممبر ملکوں نے آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرنے اور ترقی کے منصوبوں میں تعاون کرنے کا "دامے، درمے، سخنے" وعدہ کیا ہے۔ لیکن ایفار کا دار ومدار ہر ملک کی اپنی خواہش اور استطاعت پر منحصر ہے۔

(۴) اس قسم کے تعاون سے ہماری اندرونی اور بیرونی پالیسی کی آزادی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کتنے ملک ہیں جو اس انجمن کے ممبر ہونے کے ناطے ہماری بہتری، ترقی اور خوشحالی کے خواہاں ہیں، اور ہمارے پنج سالہ منصوبوں کی تکمیل میں ہماری مدد کر رہے ہیں، اور اس طرح وہ کام جو برسوں میں پورا ہوتا اب مہینوں اور دنوں میں پورا ہو رہا ہے۔ ترقی اور خوشحالی کے کتنے خواب خود ہماری زندگی میں شرمندۂ تعبیر ہو رہے ہیں۔

(۵) شاہ (ملکہ) انگلستان اس انجمن کے ممبر ممالک کے درمیان دوستی اور یگانگت کی محض علامت ہیں۔ ہماری آزادی پر ان کی شخصیت یا رسمی سرداری کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ہماری سیاسی پالیسی، زندگی کے طور طریقے اور دوسرے نظریات پر اس رشتہ سے کوئی پابندی عائد نہیں ہوتی۔

(۶) ہمارا اپنا دستور ہے، اپنے قانون ہیں۔ ہم آزاد ہیں کہ ان قوانین کو جب چاہیں ختم کر دیں یا بدل کر نئے وضع کر لیں، کامن ویلتھ کی شرکت اس آزادی میں کوئی رخنہ نہیں ڈالتی۔ ہماری اپنی پارلیمنٹ ہے جو اپنے بنائے ہوئے قوانین کے لئے برطانوی پارلیمنٹ کی منظوری کی محتاج نہیں بلکہ خود ہمارے منتخب صدر جمہوریہ

کے دستخطوں سے عمل میں آتے ہیں۔ شاہ انگلستان کی مہر کے منتظر نہیں رہتے۔

(۷) اس انجمن میں شامل رہنے سے ہم پر کوئی ایسی پابندی بھی نہیں آتی کہ ہماری بیرونی پالیسی یا دنیا کے دوسرے ممالک کے ساتھ وہی رویہ ہو جو برطانیہ یا کسی دوسرے ممبر کا ہے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر ممبر ملک دوسرے ممبر ملک کے ہر سیاسی اقدام کو ہمیشہ سراہے؛ اختلاف تو ایک زندہ اور خوددار قوم کی نشانی ہے کتنے موقعے ایسے آئے ہیں کہ جب ہندوستان نے حکومت برطانیہ کی سامراج پسندی اور ظلم واستبداد کے خلاف آواز بلند کی ہے، ۱۹۵۶ء میں نہر سوئز پر انگلستان کے حملے کی مذمت اس امر کی ایک مثال ہے۔

یہ بھی ضروری نہیں کہ ممبران کے آپسی جھگڑے صرف اسی انجمن کے ذریعہ طے ہوں گے۔ یہاں کے علاوہ بھی کسی دوسری انجمن یا ادارے جیسے یو، این، او، میں دو ممبر ممالک کے ذاتی اختلافات یا سیاسی مسائل کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے مثلاً ہندو پاک کے درمیان کشمیر کا مسئلہ اقوام متحدہ میں پیش ہے۔

(۸) کامن ویلتھ میں شرکت کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ہندوستان جن باتوں کو اصولی طور پر امن وانسانیت کے خلاف سمجھتا ہے۔ ان کے خلاف اپنی جدوجہد چھوڑ دے ہم آج بھی نسلی امتیاز اور سامراجیت کے مخالف ہیں۔ بلکہ اس انجمن کے ذریعہ ہم نے اپنی اس تحریک میں کامیابی کا پتہ پایا ہے۔

ہندوستان کے وزیر اعظم آج بھی انگلستان کے دارالخلافہ میں افریقہ کے کالے باشندوں پر گوروں کے مظالم اور امتیازات کے خلاف اپنے غم وغصہ کا اظہار کر سکتے ہیں، اور مجبور کر سکتے ہیں کہ جنوبی افریقہ کی حکومت اپنی اس پالیسی کو خیرباد کہے یا اس انجمن کی رکنیت سے دستبردار ہو۔

(۹) کامن ویلتھ کا ممبر ہونے ہوئے بھی ہندوستان نے فوجی گٹھ جوڑ اور معاہدوں کی مخالفت کی ہے، جبکہ برطانیہ اور دیگر ممبر ممالک اس قسم کے متعدد معاہدوں میں شریک ہیں مثلاً

نیٹو، سیٹو، بغداد پیکٹ وغیرہ - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان عالمی مسائل میں اپنی آزاد رائے رکھتا ہے اور اس کے اظہار پر بھی پوری قدرت حاصل ہے۔

(۱۰) یہاں یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ دنیا کی دو بڑی طاقتوں کے درمیان سرد جنگ کی گرماگرمی ہندوستان کے دولت مشترکہ کے تعلق پر کوئی اثر نہیں ڈالتی - اگرچہ اس انجمن کے سب ہی ممبر مغربی بلاک سے اپنی تقدیریں وابستہ کر چکے ہیں، لیکن ہندوستان آج بھی غیر جانب دار اور امن پسند ہے - ہم برطانیہ کے بھی دوست ہیں، اور روس کی ترقی اور خوش حالی کو بھی بہ نظر تحسین دیکھتے ہیں، امریکہ بھی ہمارا ہمدرد ہے اور روس بھی ہمارا بہی خواہ ہے۔

(۱۱) ہندوستان اس انجمن میں شامل ہوا تو محض اپنے فائدوں کے پیش نظر اس انجمن کے تعلق سے ہم کو دوسروں سے اور دوسروں کو ہم سے تجارتی اور ثقافتی فوائد اور سہولتیں حاصل ہیں - اور یہ صحیح ہے کہ آج کی ترقی یافتہ دنیا میں جہاں ضرورتیں کثیر اور ذرائع محدود ہیں کوئی بھی ملک دوسروں سے تعلق قائم کئے بغیر نہیں رہ سکتا ہندوستان دوسروں سے کتنی چیزیں لیتا ہے، غلہ، مشین، کپڑا، ادویات، دھاتیں اور روزانہ زندگی کی کتنی ضروریات ہیں جو ہم ابھی تک دوسروں سے لیتے ہیں، اور یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا، دنیا کا کوئی بھی ملک اپنی تمام ضروریات بذات خود پوری نہیں کر سکتا۔ اس قسم کے تجارتی لین دین کسی انجمن کے ذریعہ آسان ہو جاتے ہیں۔

(۱۲) ۱۶ رمئی ۱۹۴۹ء کو ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی کے سامنے دولت مشترکہ میں ہندوستان کی شمولیت کی ہمنوائی میں تقریر کرتے ہوئے وزیر اعظم پنڈت نہرو نے کہا تھا، "میری خواہش ہے کہ دنیا دیکھے کہ ہندوستان اس قوم سے بھی خوشگوار تعلقات رکھ سکتا ہے جس سے ماضی میں اپنے جائز حقوق کے لئے جنگ آزما رہا ہے۔ نیشلزم کے تصور کو محدود کرنے سے عالمی مسائل کبھی حل نہیں ہو سکتے۔ اور محض اس بنا پر کہ ہم کل تک انگریز کے ساتھ دست و گریباں رہے ہیں۔ دولت مشترکہ میں شامل ہونے سے انکار نہیں کر سکتے۔"

"اور بالفرض اگر اس انجمن کی رکنیت سے ہمیں کوئی بڑا فائدہ نہیں ہے تو اس سے علیحدہ رہنے میں ہمارا نقصان یقینی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کو نہ صرف اس انجمن ہی میں ایک ممتاز حیثیت حاصل ہے، بلکہ اس کے ذریعہ ہندوستان نے سیاست عالم میں اپنے لئے ایک اعلیٰ مقام حاصل کیا ہے۔ آج بین الاقوامی مسائل میں ہندوستان کی رائے اور رویہ کو جو نمایاں حیثیت حاصل ہو رہی ہے۔ اس میں اس انجمن کی آواز اور تعاون کا بڑا حصہ ہے۔ ۱۹۵۱ء میں جنگ کوریا نے خوفناک شکل اختیار کرلی تھی اور ہر گھڑی تیسری عالمی جنگ چھڑ جانے کا خطرہ تھا۔ روس اور امریکہ ایک طرح کھل کر میدان میں آگئے تھے، اس وقت اس انجمن کے دیگر ممالک کے ساتھ ہندوستان نے جنگ بندی کی انتھک کوشش کی اور کامیابی کے نتیجہ میں دنیا کی نظروں میں ایک ممتاز امن پسند قوم کا درجہ پایا۔ اسی طرح انڈوچائنا کے مسئلہ میں ہندوستان کی مشترکہ کوششوں سے ایک دیرینہ قضیے کا تصفیہ ہو سکا۔

اس انجمن کے ذریعے ہندوستان نے دنیا کی سیاست میں ایک وقار اور عزت حاصل کی ہے اس کے علاوہ کولمبو پلان اور دیگر کامن ویلتھ ممالک سے انفرادی طور پر ہمیں کس قدر مالی، صنعتی اور اخلاقی مدد مل رہی ہے۔ اس سے کم ہی لوگ واقف ہیں، اس انجمن کے ممبر ممالک کا ایک دوسرے کی ترقی اور خوشحالی کے منصوبوں میں تعاون کا وعدہ اور آپس میں جنگ کرنے اور اپنے ذاتی مسائل کو خوش اسلوبی سے طے کرنے کے اقرار نے ایک کو دوسرے سے بے حد قریب کر دیا ہے۔ اس انجمن سے قطع تعلق کرتے ہیں جذبات کی تسلی چاہے ہو جائے لیکن نقصان کا اندازہ مشکل سے کیا جا سکے گا۔

"دو کنارے"

جناب شمیم نوید علی گڑھی

دور کچھ دور اس ندی کے پار
پھوس کی جھونپڑی میں اک سادھو
کیسا دھونی رمائے بیٹھا ہے
بے نیازِ مآلِ راحت و غم
اپنی دنیا سجائے بیٹھا ہے

اور اک میں کہ اس کنارے پر
اپنے دل میں ہزار داغ لئے
غم کی تاریکیوں سے الجھا ہوں
یاس و امید کے چراغ لئے

اور کبھی میں اداس نظروں سے
تکنے لگتا ہوں ان نظاروں کو
کاش یہ فرق عیش و غم نہ رہے
ایک جا کر دوں دو کناروں کو

یا پھر اک میرا جھونپڑا بھی وہیں
ہوتا سادھو کی جھونپڑی کے پاس
میرے بھی گرد رقص کرتی خوشی
اور زمانے کے غم نہ آتے پاس
دور کچھ دور اس ندی کے پار

تعلیمی مسائل

امتحانات

"کوئی پانچ سوال کیجئے۔ سب کے نشان برابر ہیں" ان دو مختصر جملوں میں لاکھوں طالب علموں کے لئے آزمائش کی ایک بھیانک داستان پوشیدہ رہتی ہے۔ کم از کم سال کے دو مہینے فروری اور مارچ آموختہ دوہرانے ہی گذرتے ہیں تاکہ کسی طور پر کامیابی کے لئے تینتیس فیصدی نشان حاصل کر سکیں تاہم اس عرق ریزی کے باوجود بیشتر امیدواروں کے لئے امتحان کا نتیجہ ایک نعمت غیر مترقبہ ہی ہوا کرتا ہے۔ اگرچہ ہماری تعلیم کا میدان دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کے برابر وسیع نہیں ہوا ہے تاہم ہم اپنی تعداد کے لحاظ سے غیر معمولی ہیں۔ مدرسے کے اپنے بھی امتحانات سے درگذر ہمارا اترپردیش بورڈ کا ہائی اسکول سرٹیفکیٹ امتحان اپنے اعداد و شمار کے اعتبار سے دنیا کا سب سے بڑا امتحان ہے۔ ہر سال کئی لاکھ طالب علم اس امتحان میں شریک ہوتے ہیں۔ اتنے بڑے امتحان نے تعلیمی سے زیادہ تنظیمی مسائل پیدا کر دئے ہیں۔ امتحان کے شرکا بے عنوانیاں ہی نہیں برتتے بلکہ فوجداری پر بھی آمادہ رہتے ہیں۔ اب صرف چھپے چوری نقل ہی نہیں ہوا کرتی بلکہ منظم طور پر کامیابی کے "دوسرے ذرائع" بھی استعمال کئے جاتے ہیں۔ امتحانات کے زمانے میں صرف اساتذہ کی مشغولیت ہی میں اضافہ نہیں ہوتا بلکہ امن داماں کے محافظوں کی مشغولیت بھی بڑھ جاتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے امتحانات اپنی چھوٹی چھوٹی دشواریاں رکھتے ہیں۔ مدرسے کے اپنے اندرونی امتحانات کے کچھ اور مسائل ہیں۔ لیکن ایک بات طے ہے۔ خواہ کسی چھوٹی جماعت کا معاملہ ہو یا کسی مستند امتحان کی بات، سارا معاملہ قسمت کا کھیل ہو کر رہ گیا ہے! امتحانات کے پرچے، نصاب کی پورے طور پر عکاسی نہیں کرتے۔ اس لئے طلبہ، تحصیل علم کے بجائے ہتکنڈے استعمال کرتے ہیں۔ اولاً اہم اور غیر اہم حصوں میں ابواب کی تقسیم ہوتی ہے پھر مخصوص اور محدود تیاری کی جاتی ہے اور تیر ورنہ تکا کے مصداق شرکت امتحان کی

نوبت آتی ہے۔ اس میں مضمون نگاری اور عبارت آرائی کی عملداری ہے۔ اور آخر میں ممتحن کے ہاتھ ساری بات رہ جاتی ہے۔ اور حالات ایسے ہیں کہ وہ اپنی نیک نفسی کے باوجود سب کو ایک نظر سے نہیں دیکھ پاتا۔ شخصی معتقدات کے علاوہ بہ یک وقت کام کا بار عموماً اس قدر ہوتا ہے کہ دیانت داری سے فرائض کی ادائیگی واقعی دشوار ہو جاتی ہے۔ عملی امتحان کا معاملہ اور زیادہ غیر تسلی بخش ہے۔ خواہ سائنس یا کسی مضمون کا کوئی عملی امتحان ہو یا کسی حرفے کا، باہر سے آنے والے ممتحن کو بسا اوقات خانہ پوری کی فکر ہوتی ہے اور اساتذہ کو مہمان نوازی کی۔ اگر دونوں اپنی اپنی کوششوں میں کامیاب رہیں تو دونوں خوش رہتے ہیں اور طلبہ کا بس اللہ نگہبان رہ جاتا ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران میں ذہانت کی جانچ کے طور طریقوں کی طرف خصوصی توجہ دی گئی اور ماہرین نفسیات نے جانچ کے پرچوں کو ایسی شکل دے دی جن میں مروجہ امتحان کے پرچوں کی بیشتر خامیاں جاتی رہیں۔ اس اصلاح سے تعلیم نے پورا فائدہ اٹھایا مگر اس طرح تمام مسائل پھر بھی حل نہ ہوئے۔ چھوٹی جماعتوں میں تو مختصر سوالات اور مختصر جوابات سے کام چل سکتا تھا لیکن جہاں پر ندرت فکر، مدلل اور مسلسل عبارت اور تحقیق و تنقید کی بات آجاتی [illegible] پرچے میں مسلسل مضمون لکھنے کے علاوہ کوئی اور چارہ کار باقی نہیں رہتا۔ لہذا تعلیمی میدان میں کام کرنے والوں کا مسئلہ بدستور قائم رہا۔ اور سب سے خراب بات یہ ہوئی کہ ہم نے امتحان کی غرض و غایت پر غور کرنا ہی چھوڑ دیا۔ ہمارے سامنے صرف طلبہ کے چھانٹنے کی بات رہ گئی تھی [illegible] معیار مقرر کیا اور اٹکل پچو کچھ کو ناکام گردانا اور کچھ کو کامیاب قرار دیا لیکن [illegible] طور پر ہماری نظر اپنے مقاصد کی طرف گئی اور اب سب سے اہم سوال یہی ہے [illegible] اپنے طلبہ کو حقیقی تعلیم دیں۔ ہمیں شخصیتوں کی تربیت کرنی ہے۔ صرف اسناد تقسیم [illegible] ہے اور اسی نظریے کے تحت امتحان اور اس کے طریقہ کار کو بھی بدلنا ہے۔ امتحان کے [illegible] میں رد و بدل کر کے ہی طلبہ میں حصول تعلیم کے مناسب رجحانات پیدا کیے جا سکتے [illegible] بنا پر درس و تدریس کے قاعدوں میں انقلاب آسکتا ہے۔ ہمیں اس بات کی پوری

طور پر سعی کرنی ہے کہ ہمارے طلبہ صالح روایات کے حامل ہو جائیں۔ ان کا مذاق ستھرے اور ان کے نظریات میں استواری آئے۔ وہ محض کتاب کا کیڑا بن کر نہ رہ جائیں بلکہ کام کے آدمی بن سکیں۔ یہ کام ظاہر ہے کہ صرف ایک سالانہ امتحان سے انجام نہیں پا سکتا۔ اس سلسلے میں استاد کی نگاہ التفات متواتر درکار ہے۔ اس لیئے بہت سے ماہرین تعلیم نے، طلبہ کے سال بھر کے کام کو مقدم ٹھہرایا۔ پچھلے دس سال میں مختلف اداروں نے اپنی اندرونی جانچ کو مختلف عنوان سے کچھ نہ کچھ جگہ منروری ہے اور طلبہ کے دورانِ سال کی کارگذاری کو کسی قدر مدنظر رکھا ہے۔ جامعہ میں یہ کام ایک مدت سے ہو رہا ہے۔ اب تو بعض مضامین میں سالانہ امتحان کی دقعت سال بھر کے کام کے مقابلے میں صرف ایک چوتھائی رہ گئی ہے۔ لیکن اس صورت میں اساتذہ پر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اپنا کام نہ صرف پابندی اوقات سے کرانا ہے بلکہ اسے ترتیب کے ساتھ محفوظ رکھنا بھی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس کام میں بڑی احتیاط درکار ہے۔ اور شکی طبیعتوں کو اطمینان بھی دلانا ہے۔ چند سال ہوئے کہ بڑے جوش وخروش سے ریاست پنجاب میں اس کام کا آغاز ہوا لیکن بدعنوانیوں کا کچھ ایسا بازار گرم ہوا اور اس قدر خلفشار پڑھا کہ مجبوراً اس مستحسن اقدام کو بہت کچھ روکنا پڑا۔ تاہم ان دشواریوں کے باوجود اس طرف خصوصی توجہ درکار ہے اور ضرورت یہ ہے کہ ریکارڈ رکھنے کے طریقوں کی درستی کی جائے، استادِ متعلقہ کی جانچ کو ایک ضابطہ دیا جائے اور ایسے طریقے برتے جائیں جن سے جائزہ معقول بن سکے اور شخصی تعصبات و معتقدات کا عمل دخل بڑی حد تک ختم ہو جائے۔ تاکہ سالانہ امتحان کا بھوت ہمیشہ کے لیئے طلبہ کے سروں سے دُور ہو جائے۔ وہ کتابوں کو چھوڑ کر ان کی غیر ذمہ دارانہ اور گمراہ کن تلخیصوں کو حفظ کرنے کے چکر میں نہ پڑیں۔ کامیابی حاصل کرنے کے لئے ناجائز ذرائع کو استعمال نہ کریں۔ ناکامی کے خوف اور رسوائی کے ڈر سے جان نہ دیں۔ اور نہ انھیں دورانِ سال میں خالی الذہن رہ کر تضیعِ اوقات کرنے کا موقع ملے۔ تاکہ ہمارے مدرسے صحیح معنی میں کام کے مدرسے کہلا سکیں۔

لیکن یہ تو طریقہ کار کا معاملہ رہا، اصل بات تو یہ تھی کہ ہم اپنے مقاصد کے تحت تعلیم دین

اور انھیں کے پیش نظر جانچ کریں۔ یہ ہمارا بنیادی سوال ہے۔ تین سال ہوتے آئے اُس بات کو پُر زور طریقے سے شکاگو یونیورسٹی کے عالم ڈاکٹر بلدم نے ہمارے اساتذہ کی مختلف مجلسوں میں پیش کیا۔ انھوں نے اصرار کیا کہ مناسب سوالات کے ذریعے طلبہ کی ان صلاحیتوں کو بخوبی جانچا جا سکتا ہے۔ جو ان کی اندر پیدا ہونی چاہئیں۔ اسی طرح امتحان کا صحیح فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اور امتحان کے زاویے کو بدلنے سے تعلیم کے طریقوں اور حصول تعلیم کی عادتوں میں لازمی طور پر خوشگوار تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔ اُن کی اس تحریک کا کسی قدر اثر ضرور ہوا۔ اور ثانوی تعلیم کی منزل پر توسیعی پروگرام کے تحت کچھ کام بھی کیا گیا۔ کہیں کہیں اساتذہ کے تربیتی اداروں میں بھی کچھ چرچا ہوا۔ لیکن ابھی تک اس معاملے میں ہمارے مدرسوں کی فضا قطعی متاثر نہیں ہوئی ہے۔ گذشتہ اپریل میں چند ماہران تعلیم کو توسیعی پروگرام کے مرکزی ڈائرکٹریٹ کے تحت امتحانات کے مسائل پر غور و خوض کرنے کے لئے دعوت دی گئی تھی۔ امید ہے کہ اس کے کچھ خوشگوار نتائج جلد برآمد ہوں گے۔

"معلّم"

حالاتِ حاضرہ

• جمہوریۂ ہند کے نئے پاسباں ـــــ علم اور خدمت کو اعزاز

اس ماہ میں ہندوستان میں بہت بڑی بات ہوئی ہے۔ وہ یہ کہ ملک کے عظیم فلسفی اور مفکر ڈاکٹر رادھا کرشنن صدر جمہوریہ اور مشہور و معروف ماہر تعلیم ڈاکٹر ذاکر حسین نائب صدر جمہوریہ منتخب ہوئے ہیں۔ بظاہر اس واقعہ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ دو جلیل القدر عہدوں پر دو عظیم المرتبہ شخصیتوں کا انتخاب ہوا ہے لیکن اگر اس پر پوری طرح غور کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ اس کی ایک اہمیت تو وہ ہے جس کا ہمارے محبوب وزیر اعظم نے اپنی کسی تقریر میں ذکر کیا تھا کہ اتنی بڑی تبدیلی کا اتنی خاموشی اور خوش اسلوبی سے ہو جانا اس بات کی علامت ہے کہ قوم میں جمہوریت اور اس کی شاندار روایات کی جڑیں بہت گہری اور مضبوط بنیادوں پر استوار ہیں۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا تھا کہ بہت سے ملکوں میں ایسے مواقع پر ہنگامے ہوتے ہیں اور اس کے نتائج قوم و ملک کے لئے بہت ہی ناخوشگوار ہوتے ہیں۔ دوسری اہمیت یہ ہے کہ یہ دونوں عہدہ دار اگرچہ عملی سیاست سے ہمیشہ بے تعلق رہے ہیں مگر ان کی علمی اور تعلیمی خدمات کی بنا پر سیاست نے انھیں اپنا سربراہ منتخب کرنے میں فخر محسوس کیا۔ گویا خاموش اور بے لوث خدمت ہنگامہ خیز سیاست پر غالب آئی اور تعلیم گاہ کے یہ بوریہ نشیں، اقتدار اعلیٰ کی مسند پر جوڑ توڑ ساز باز اور سعی و کوشش سے نہیں، محض اپنی شرافت، نیکی، خلوص دیانتداری اور خدمت کی بنا پر بیٹھے ہیں۔

ڈاکٹر رادھا کرشنن کا انتخاب پھر بھی زیادہ حیرت انگیز نہیں ہے۔ کیوں کہ وہ بین اقوامی شہرت کے مالک ہیں اور ایک طویل عرصے سے اہم عہدوں پر فائز رہے ہیں اور شروع سے جب آزاد ہندوستان کا دستور نافذ ہوا ہے، وہ نائب صدر جمہوریہ کی حیثیت سے کام کر رہے تھے، اس لئے

صدر جمہوریہ کے عہدے کے لئے ان سے زیادہ کون مستحق ہو سکتا تھا، مگر تعجب ذاکر صاحب کے انتخاب پر ہے۔ وہ شروع سے گمنام زندگی بسر کرتے رہے ہیں۔ انھیں کئی مرتبہ بلند ترین عہدے پیش کئے گئے لیکن انھوں نے بلند مراتب پر بظاہر معمولی مگر ٹھوس خدمت کو ترجیح دی۔ ان کے اسی خلوص اور جذبۂ ایثار کا نتیجہ ہے کہ ان کی خدمت کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا اور

ہر کہ خدمت کرد آں مخدوم شد

ذاکر صاحب کا انتخاب اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس سے اس اہم مقام کی نشان دہی ہوتی ہے، جو ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کو حاصل ہے، نیز قومی یکجہتی کے لئے ایک اچھا شگون ہے اور اس کی طرف ایک اہم اور قابل مبارک باد اقدام۔

آتش فشاں پھٹنے کو ہے — لاؤس عالمی کش مکش کا شکار

ادھر ڈاکٹر رادھا کرشنن نے صدارت کی ذمہ داری سنبھالتے وقت اعلان کیا کہ "ہمیں قومی سلامتی کو عالمی سلامتی سے بلند نہیں سمجھنا چاہیئے۔ ایسی خود مختار ریاست کا تصور جو مختار مطلق ہو اب وقت کے تقاضوں کے خلاف ہے۔ تمام قومی جذبات اور امنگوں کے پیچھے ایسی مشترک قدریں ہیں، جو تمام بنی نوع انسان کا سرمایہ ہیں۔ اگر اخلاقی قدریں ہمارے اعمال کے لئے مشعل راہ نہ ہوں تو خواہ وہ قومی ہوں یا بین اقوامی مستقبل خطرے سے پر بھی ہو سکتا ہے۔" دوسری طرف جنوب مشرقی ایشیا میں ایسی کارروائیاں ہو رہی تھیں، جن سے امن عالم کے لئے دن بدن خطرہ بڑھ رہا تھا اور اب وہاں ایسی نازک صورت پیدا ہو گئی ہے کہ کسی وقت بھی سرد جنگ گرم جنگ میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ سیام اور لاؤس میں بارود کے ذخیرے جمع ہیں، آس پاس چنگاریاں بھی جو بارود کے ان ذخیروں تک پہنچ جائیں۔

ہمیشہ کی طرح امریکا اور روس اس کش مکش کی ذمہ داری ایک دوسرے پر ڈال رہے ہیں۔ مغربی طاقتوں کا کہنا ہے کہ لاؤس کی کمیونسٹ فوجیں معاہدہ کے خلاف آگے بڑھ رہی ہیں اور انھوں نے کئی جگہوں پر قبضہ کر لیا ہے۔ ان میں "نام تھا" خاص طور پر قابل ذکر ہے "نام تھا" اگرچہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، مگر فوجی لحاظ سے اس کی بڑی اہمیت ہے۔



دوسری طرف روس کو شکایت ہے کہ امریکا نے سیام میں اپنی بری، بحری اور فضائی فوجیں بھیج کر اپنی طاقت کا جو مظاہرہ کیا ہے وہ بے جا اور نامناسب ہے۔ اس نے یہ بھی دھمکی دی ہے کہ اگر امریکا نے لاؤس کے معاملہ میں ذرا بھی مداخلت کی تو لاؤس دوسرا کوریا ہوگا اور امریکا کو یہ سودا بڑا مہنگا پڑے گا۔

تادم تحریر کی اطلاعوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کمیونسٹ دستے کامیابی کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں اور برطانیہ نے بھی اپنی فوجیں بھیجنا شروع کر دی ہیں۔ سیٹو کے دوسرے ممبر ممالک بھی اس کی تقلید کریں گے۔ ان تمام وحشت ناک خبروں کے ساتھ ایک خبر یہ بھی ہے کہ خروشچوف نے وعدہ کیا ہے کہ وہ لاؤس میں غیر جانبدار مشترکہ حکومت کے قیام کے لئے پوری کوشش کریں گے۔ اگر دل سے یہ کوشش کی گئی تو امید ہے کہ یہ آئی بلا ٹل جائے۔

مغربی ایریان میں انڈونیشیا کی پیش قدمی

انڈونیشیا نے طویل گفت وشنید سے مایوس ہو کر مغربی ایریان کی آزادی کے لئے فوجی اقدامات شروع کر دیئے ہیں اب تک اس کی فوجیں کامیابی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہیں۔ ہالینڈ نے بھی جوابی کارروائی شروع کر دی ہے۔ مصالحت کی کوششیں بھی جاری ہیں۔ انجمن اقوام متحدہ کے قائم قائم مقام جنرل سیکریٹری یو تھانٹ نے دونوں سے پُر امن رہنے اور گفت وشنید سے معاملہ طے کرنے کی اپیل کی ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ ابتدائی گفتگو کے لئے دونوں ایک دوسرے کی شرط کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ انڈونیشیا اس شرط پر گفت وشنید کے لئے تیار ہے کہ مغربی ایریان کی آزادی کو اصولی طور پر تسلیم کر لیا جائے۔ ہالینڈ اس شرط کو کسی صورت میں بھی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہے، دوسر اس شرط پر دوبارہ گفتگو کے لئے آمادہ ہو سکتا کہ امریکی ثالث مسٹر بنکر کی تجاویز کو گفت وشنید کے لئے

بنیاد مان لیا جائے۔ ان حالات میں بھی اگر جارحانہ کارروائیاں روکی جاسکیں تو یہ معجزہ سے کم نہ ہوگا۔

غضب ہے باسی کڑھی میں ابال آیا ہے ــــ مسئلہ کشمیر سلامتی کونسل میں

ایسے وقت میں جب سرد جنگ پورے شباب پر ہو، توبہ نہ ٹوٹے اور عہد و پیمان کا لحاظ باقی رہے کسی اور کے لئے تو جائز ہو سکتا ہے، مگر ایک سپاہی کے لئے یہی وقت اپنی مردانگی دکھلانے کا ہے۔ چنانچہ پاکستان نے موقع و محل سے فائدہ اٹھانے کے لئے سیکورٹی کونسل میں کشمیر کا مسئلہ بڑے زور شور سے اٹھایا ہے۔ موجودہ حالات سے پاکستان کو کیا کیا توقعات رہی ہوں، اس کا صحیح علم تو اسی کو ہوگا، مگر ابھی تک ہندوستان کی ڈپلومیسی پوری طرح کامیاب ہے۔

ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ

آج کل پاکستان میں نئے دستور کی حمایت بلکہ مدح و منقبت میں بڑھ بڑھ کر قصیدے کہے جارہے ہیں۔ اس سلسلہ میں مختلف اخبارات و رسائل میں نظم و نثر میں جو کچھ شائع ہوا ہے، ان کے مختصر اقتباسات ملاحظہ ہوں :-

صدر محمد ایوب خاں نے نیا آئین پیش کر کے قائد اعظم کی توقعات کو پورا کر دکھایا ــــ شاہد احمد دہلوی

یہ ہماری تاریخ ملت میں ایک ایسا مہتم بالشان واقعہ اور ملی فکر و تدبر کا ایسا قابلِ فخر کارنامہ ہے، جس پر ہم سب انتہائی مسرت و شادمانی کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے ــــ رفیق خاور

یہ دستور جمہوریت کی طرف ایک جچا تلا قدم ہے۔ ایسی جمہوریت جو قابلِ عمل ہی اور قوم کی خواہشات مقتضیات اور عملی ضروریات کا مظہر ہے۔ دستور صاف صاف طور پر بتلاتا ہے کہ اقتدار اعلیٰ اسی رب العالمین اور احکم الحاکمین کے دست قدرت میں ہے جو روئے زمین اور اس نوزائیدہ سلطنت خداداد کا مالک ہے۔

(سید الطاف علی بریلوی (مدیر "العلم")

صرف آئین ہی خالص علمی اور دینی بنیادوں پر نہیں بنایا گیا بلکہ اس آئین کے تحت آئندہ تشکیل پانے والے تمام قوانین بھی علمی اور دینی بنیادوں پر تشکیل پائیں گے۔۔۔۔ دستور کی اسلامی روح کی ایک اہم دلیل یہ ہے کہ صدر مملکت کے لئے یہ لازمی قرار دیا گیا ہے کہ وہ مسلمان ہو ــــ (مفتی انتظام اللہ شہابی)

پاکستان کے مشہور ادیب ڈاکٹر شوکت سبزواری نے ایک مضمون میں آیات اور احادیث کے

ذریعہ ثابت کیا ہے کہ یہ دستور اسلامی تعلیمات کے بالکل مطابق ہے۔ مضمون کے آخر میں لکھتے ہیں کہ "پاکستانی دستور کی اہم بنیادی دفعات کا جو جائزہ سطور بالا میں لیا گیا ہے، اس میں تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ ان دفعات کی اسلامی بنیاد کیا ہے، کونسی دفعہ یا شق اسلام کے کس اصول، قرآن کے کس نص اور رسول اور اس کے اصحاب کے کس عمل پر مبنی ہے اور اسلام میں اس کی حیثیت کیا ہے... یہ تفصیلات اسلامی تعلیمات کے مطابق ہیں اس لئے اسلامی ہے"

نظر تھی جس کی منتظر وہ گلعذار آگیا
سکوتِ بزم توڑنے وہ نغمہ بار آگیا
لئے ہوئے لبوں پہ مژدۂ قرار آگیا

وہ زرنگار آگیا، وہ نوبہار آگیا

جلو میں زندگی لئے شعور و آگہی لئے
پیام صبح نو لئے نوید روشنی لئے
سکون دل لئے وہ جانِ انتظار آگیا

وہ زرنگار آگیا، وہ نوبہار آگیا

(محسن بھوپالی)

ایک شاعر نے دستور کی اشاعت سے قبل ہی فرما دیا:

آئینِ وطن اگرچہ ہے نادیدہ
پھر بھی جمہور اس کے ہیں گرویدہ
روزوں میں ملے تو لوگ ہوں اور بھی خوش
ان کے لئے پھر تو ہو گیا دوعیدا (اے۔ڈی۔اظہر)

ان اقتباسات سے جو صورت حال سامنے آتی ہے حقیقت اس سے بڑی حد تک مختلف ہے۔ پرانے سیاست داں اس دستور کے سخت مخالف ہیں، اگر ان کا بس چلا تو وہ قومی اسمبلی کے ذریعہ سیاسی جماعتوں کو زندہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ قومی اسمبلی میں مشرقی پاکستان کو مساوی نمائندگی حاصل ہے اور وہاں کے بیشتر نمائندے اس نعرے کے ساتھ منتخب ہوئے ہیں کہ اس دستور کو بدلنا ہے۔ وہاں کی مذہبی جماعتوں میں جماعت اسلامی سب سے باا‌ثر جماعت ہے، اور وہ اسے اسلامی دستور تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہے، ۸ جون کو قومی اسمبلی کا اجلاس شروع ہو رہا ہے۔ شاید اس وقت جذبات وخیالات کا صحیح اندازہ ہوسکے۔

تعارف وتبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجنا ضروری ہیں)

غالب (ابتدائی دور) از ڈاکٹر خورشید الاسلام

سائز $\frac{22 \times 18}{8}$۔ حجم ۲۸۴ صفحات۔ کتابت، طباعت اور کاغذ عمدہ۔ مجلد مع گردپوش

قیمت: چھ روپے۔ تاریخ طباعت۔ ۱۹۶۰ء۔ ناشر: انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ۔

جناب خورشید الاسلام صاحب ایک خوش فکر شاعر ہیں اور تنقید کا ستھرا ذوق رکھتے ہیں پیش نظر کتاب کا تعلق صرف تنقید سے نہیں تحقیق سے بھی ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مولف نے ان دونوں کا حق ادا کیا ہے۔ آج کل تحقیق و تفتیش کا بڑا چرچا ہے، مگر ہمارے ایک دوست، جو خود بھی ماشاء اللہ ایک اچھے ریسرچ اسکالر ہیں، موجودہ ریسرچ کو "گورکنی" سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کے اس طنز اور مزاح میں بڑی حد تک حقیقت ہے، مگر اس کتاب میں جو تحقیق پیش کی گئی ہے، وہ تخلیق کے ہم پلہ ہے۔

غالب پر آج کل بہت کافی کام ہو رہا ہے، مگر ان میں بہت سا "گورکنی" سے زیادہ نہیں، لیکن زیر تبصرہ کتاب واقعی غالبیات میں ایک مفید اضافہ ہے۔ مولف نے اس کتاب کا مقصد یہ بیان کیا ہے کہ غالب کی ابتدائی شاعری میں جو اثرات کام کر رہے ہیں، ان کا ایک جائزہ لیا جائے اور اس شاعر کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی جائے، جن کا براہ راست اثر غالب کی ابتدائی شاعری پر پڑا ہے۔"

یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے میں غالب کے خاندان اور ان کے عہد پر لکھا گیا ہے، دوسرے میں ان شعراء سے بحث کی گئی ہے۔ جن کے اسالیب کا غالب کی ابتدائی شاعری پر اثر

پڑا ہے۔ تیسرے میں تمثیل نگاری۔ خیال بندی اور مناسبات لفظی پر گفتگو کی گئی ہے۔ چوتھے میں خود غالب کے کارنامے پیش کئے گئے ہیں۔ آخر میں دو ضمیمے دیئے گئے ہیں۔ پہلے میں ان شعراء کا منتخب کلام دیا گیا ہے، جن کا کسی نہ کسی نہج سے غالب نے اثر قبول کیا ہے، دوسرا ضمیمہ "ان الفاظ اور ان "تلازموں" پر مشتمل ہے، جو غالب کی ابتدائی شاعری میں بار بار دقیق انداز سے استعمال ہوئے ہیں" مولف کے الفاظ ہیں "یہ ایک گونہ دیدہ سوزی کا کام تھا" فاضل مولف کے اس خیال سے بھی غالباً اختلاف کی گنجائش نہیں ہے کہ یہ ان دوستوں اور نوجوانوں کے لئے شاید زیادہ مفید ثابت ہو جو نفسیات اور ادب دونوں کے طالب علم ہیں۔ ممکن ہے کہ اس ضمیمہ کی بنیاد پر غالب کے ذہنی عمل کا مطالعہ کیا جا سکے۔"

شاد کی کہانی شاد کی زبانی

مرتبہ: پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی

سائز ۲۲×۱۸ حجم ۲۰۱، قیمت غیر مجلد پانچ روپے۔ تاریخ طباعت ۱۹۶۱ء

ناشر: انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

یہ حضرت شاد عظیم آبادی مرحوم کی خود نوشت سوانح حیات ہے، جسے مرحوم نے کسی مصلحت کی بنا پر اپنے شاگرد رشید پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی کی طرف سے لکھا تھا۔ یہ سوانح حیات ۱۹۲۱ء کے لگ بھگ لکھی گئی ہے اور حضرت شاد کا انتقال ۸ رجنوری ۲۷ء میں ہوا ہے۔ مگر ۱۹۶۱ء تک اس کو شائع کرنے کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی۔ بالآخر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی توجہ اور عنایت سے اس کی اشاعت کا انتظام ہوا۔ مرتب نے لکھا ہے کہ ڈاکٹر ذاکر صاحب نے "اکثر منتشر اجزا کو بدقت نظر دست خاص سے نقل کیا ہے۔"

اس کتاب سے حضرت شاد کے صرف حالاتِ زندگی پر ہی روشنی نہیں پڑتی، بلکہ ان کے علمی کارناموں اور شاعرانہ خصوصیات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ خود شاعر نے بصیغۂ غائب اپنی شاعری کی خصوصیات بیان کی ہیں اور بہت سے شعروں کی توضیح و تشریح کی ہے۔ اپنی غزلوں کی خصوصیات کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"ان دنوں ہندوستان میں غزل سراؤں کے مختلف مذاق ہیں۔ کوئی غالب مرحوم کے

اندازِ غزل سرائی کو پسند کرکے اسی طرز پر طبع آزمائی کرتا ہے۔ بہتیرے جوان طبیعت مرزا داغ کی غزلوں پر مٹے ہوئے ہیں، لیکن سید صاحب[1] کی غزل سرائی کا انداز جداگانہ ہے ان کی غزلوں میں فلسفۂ الٰہیات اور اخلاقی مضامین استعاروں کا پہلو لئے ہوئے نہایت سلیس و شیریں بندشوں کے ساتھ رہتے ہیں، تاکہ شعروں کے معنی ظاہر کے سمجھ لینے میں عامیوں تک کو دقت پیش نہ ہو۔ اور گو کہ اس میں معنی بلند ہوں، مگر کوئی نہ کوئی محاورہ یا لفظ یا ترکیب بندش ایسی بھی ہو کہ خاص خاص لوگوں کے علاوہ عام فہم والا بھی اس سے متلذذ ہو۔" (صفحہ ۱۰۴)

ہر خود نوشت سوانح حیات دلچسپ اور اہم ہوتی ہے، مگر زیر تبصرہ کتاب چونکہ دوسرے شخص کی طرف سے لکھی گئی ہے، اس لئے سوانح نگار نے اپنے متعلق ذرا کھل کر لکھا ہے۔ اس کی وجہ سے اس کتاب کی اہمیت اور اس کا لطف دوبالا ہو گیا ہے۔

مرزا مظہر جان جاناں کے خُطوط : مترجمہ و مرتبہ : ڈاکٹر خلیق انجم

سائز $\frac{20 \times 30}{16}$، حجم ۲۷۲، مجلد قیمت چار روپے، تاریخ طباعت جنوری ۱۹۶۲ء

ناشر: مکتبہ برہان اردو بازار۔ دہلی

مرزا مظہر جان جاناں اٹھارہویں صدی عیسوی کے سلسلۂ نقشبندیہ کے مشہور صوفیوں میں سے ہیں۔ جناب خلیق انجم صاحب شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے موصوف کے فارسی خطوط کو جمع کرکے انھیں اردو میں ترجمہ کیا۔ یہ خطوط کئی لحاظ سے بہت اہم ہیں۔ جو لوگ مرزا مظہر جان جاناں کی شخصیت اور ان کے خیالات و افکار کو سمجھنا چاہتے ہیں، ان کے لئے ان خطوط کا مطالعہ تو ناگزیر ہے ہی، لیکن اس کے علاوہ اس لحاظ سے بھی بہت اہم ہیں کہ ان سے تصوف کے اہم مسائل پر روشنی پڑتی ہے اور اُس عہد کے مذہبی

---

[1] حضرت شاد عام طور پر سید صاحب کے نام سے مشہور تھے اس لئے اس کتاب میں ان کے اصل نام کی بجائے سید صاحب ہی لکھا ہے۔

خیالات و تصورات کو سمجھنے کے لئے ان سے قابل قدر مدد ملے گی۔

فاضل مرتب و مترجم نے ان خطوط کی زبان اور اسلوب کے بارے میں لکھا ہے کہ "مرزا صاحب نے فارسی مکتوب نگاری میں بھی سادہ گوئی کی بنیاد رکھی اور اس کی اصلاح کی۔ غالب نے اردو مکتوب نگاری میں جو اصلاحیں کی تھیں اور جس سادگی اور بے تکلفی کی طرح ڈالی تھی، اس کی ابتدا نثر اسی سال قبل مرزا صاحب نے ہی کی تھی۔" (صفحہ ۴۲، ۴۳)

ایک جگہ اور لکھتے ہیں۔ "ایسی فارسی نثر کے نمونے پیش کئے، جن میں سادگی، صفائی، سلاست و فصاحت، بے تکلفی، بے ساختگی، شیرینی اور روزمرہ کا لطف تھا۔" بڑا اچھا ہوتا اگر یہ سادگی اور سلاست اردو ترجمہ میں بھی ہوتی۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض علمی مباحث کو آسان اور عام فہم زبان میں پیش کرنا مشکل ہوتا ہے، مگر ذیل کا ایک مختصر اقتباس ملاحظہ ہو۔ ایسا معلوم ہوتا کہ کسی ایسے شخص کی تحریر ہے، جس کی پوری زندگی کسی عربی مدرسہ کی چہار دیواری کے اندر گذری ہو۔

"صوفیہ لفظ وجود کا اطلاق تین معنوں پر کرتے ہیں۔ ایک وجود بہ معنی کون (ہونا) اور حصول (حاصل ہونا) جو کہ ایک امر انتزاعی اور معقول ثانوی ہے۔ دوسرے وجود بسیط جو پہلے معنی کے انتزاع کے تعبیر کرنے والا ہے اور صادر اول ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ جو انتزاع معنی اول کے منشار، اور ظاہر وجود کا، دونوں وجود ذات باری تعالیٰ سے متاخر ہیں اور ذات ان دونوں وجود سے مصدر آثار نہیں ہو سکتی۔ تیسرا وجود وہ ہے جو اول الاوائل اور مبد المبادی ہے ......" (صفحہ ۴۷)

اس طرح کی مشکل اور الجھی ہوئی زبان ہر جگہ نہیں ہے، صرف وہاں ہے، جہاں علمی خصوصاً متصوفانہ مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ ویسے کتاب دلچسپ، مفید اور قابلِ مطالعہ ہے۔

ترتیل القرآن مؤلفہ: قدیجہ بنت سیدنا طاہر سیف الدین طع

اس مختصر رسالہ میں قرآن حکیم کو صحت اور صحیح مخرج کے ساتھ پڑھنے کے طریقے تبلائے

گئے ہیں۔ یہ کتاب چھوٹے طالب علموں کے لئے بڑی مفید ہے۔ اس لئے ان مدارس میں جہاں مذہبی تعلیم دی جاتی ہے، اس کو درس میں شامل کرنا چاہئے۔ یہ کتاب گجراتی زبان میں بھی شائع ہوئی ہے، جس پر ہم رسالہ جامعہ میں دسمبر ۱۹۶۱ء کی اشاعت میں تبصرہ کر چکے ہیں۔

ملنے کا پتہ: الادارۃ الثقافیۃ العلمیہ۔ معرفت دارالبرکۃ فیضی بلڈنگ، فرسٹ فلور نظام اسٹریٹ، گلی ۲ ۔ بمبئی ۳ ؛

ادب اور تہذیب از فرحت اللہ انصاری

سائز ۲۰×۳۰/۱۶، حجم ۱۹۲ مجلد۔ تاریخ طباعت درج نہیں، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ فروری ۶۲ء ہے۔ قیمت: تین روپے۔ ملنے کا پتہ: آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی ۶

مختلف قسم کے پندرہ مضامین کا یہ مجموعہ ہے۔ یہ مضامین عموماً مختصر، دلچسپ اور شگفتہ ہیں۔ پروفیسر احتشام حسین صاحب کا تعارف بھی شامل ہے۔ موصوف نے ان مضامین کے بارے میں لکھا ہے کہ "ان پندرہ مضامین میں چند مضامین شخصیتوں سے متعلق ہیں، چند ہماری مشترکہ تہذیب کے متعلق۔ کچھ ادبی ہیں اور کچھ انشائی انداز میں تحریر کئے ہوئے ہلکے پھلکے مضامین۔ لیکن جب پڑھنے والا ان تمام مضامین کو ختم کرے گا تو اسے محسوس ہوگا کہ فرحت اللہ انصاری نے اس کے ذہن پر کوئی بوجھ ڈالے بغیر اسے اپنی قومی تہذیب کی اعلیٰ ترین قدروں اور صحت مند جمہوریت کے بنیادی اصولوں کی جھلک دکھائی ہے۔"

معلوم ہوتا ہے کہ ان مضامین کو کتابی صورت میں شائع کرتے وقت ان پر نظر ثانی نہیں کی گئی ہے۔ حالانکہ اس کی سخت ضرورت تھی۔ "ہندوستان کا جائزہ" ۱۵ اگست ۴۷ء کا لکھا ہے۔ ۶۲ء میں ہندوستان کے حالات اور اس کے مسائل بالکل بدل گئے ہیں، ضرورت تھی کہ اس مضمون کو از سر نو لکھ کر شامل کیا جاتا۔ "ایک طنزیہ خاکہ — انجمن معنفیں اردو" اگر اس میں شامل نہ کیا جاتا تو اچھا تھا۔ یہ لکھنؤ کے ایک غیر معروف رسالہ یا اخبار "مادر وطن" میں شائع ہوا تھا۔ بس یہ اسی کے لئے موزوں ہو سکتا تھا۔

ان معمولی خامیوں سے قطع نظر کتاب پر لطف اور قابلِ مطالعہ ہے۔ (ع ل ا)

کوائف جامعہ

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب جامعہ میں

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب، نائب صدر جمہوریہ منتخب ہونے کے بعد، ۱۰ مئی کو دہلی تشریف لائے۔ تا مستقل قیام گاہ کے انتظام تک راشٹرپتی بھون میں قیام کیا۔ ایک طویل عرصے کے بعد وہ عید کے موقع پر دہلی میں تھے۔ جامعہ برادری کو بڑی خوشی ہوئی کہ موصوف نے نماز عید اپنے پرانے ساتھیوں کے ساتھ جامعہ میں ادا کی اور بعد نماز اساتذہ اور کارکنوں کے ساتھ عید پارٹی میں شرکت کی۔ ڈاکٹر صاحب کے نائب صدر جمہوریہ ہند کی حیثیت سے دہلی آنے پر ملک کے ہر خطے اور ہر طبقے کے لوگوں نے خوشی کا اظہار کیا تو رہے ہم اہل جامعہ تو ہماری خوشی کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ ہم نے تو پچھلے چودہ برس اس آسرے پر گذارے ہیں۔

یوسف گم گشتہ باز آید بکنعاں غم مخور

کلبۂ احزاں شود روزے گلستاں غم مخور

ان کی تشریف آوری کے وقت جامعہ میں گرمیوں کی چھٹی ہو گئی تھی، اس لئے باضابطہ خیر مقدم کی تقریب وسط جولائی تک ملتوی رکھی گئی، لیکن انجمن جامعہ ملیہ اسلامیہ (کورٹ) کے جلسہ منعقدہ ۱۰ مئی ۶۲ء میں جناب اکبر علی خاں صاحب کی تجویز اور کئی حضرات کی تائید سے متفقہ طور پر یہ رزولیوشن پاس کیا گیا:

"انجمن جامعہ ملیہ اسلامیہ کا یہ جلسہ خدائے تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے اور اپنے بھائی اور بزرگ ذاکر صاحب کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہے کہ جمہوریۂ ہند کی پارلیمنٹ نے، جو ہمارے ملک کی رائے عامہ کی امین اور وکیل ہے، موصوف کو نائب صدر جمہوریہ کے منصب جلیل کے لئے چن کر اپنے حسن انتخاب کا ثبوت دیا ہے۔"

شیخ الجامعہ صاحب مغربی جرمنی میں

شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب ایک بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کے لئے ۱۲ مئی کو ہفتہ عشرہ کے لئے مغربی جرمنی تشریف لے گئے ہیں۔ اس کانفرنس کا موضوع اور اس کے انعقاد کا پس منظر حسب ذیل ہے:

ہندوستان کی طرف سے ۱۹۵۴ء میں یونسکو جنرل کانفرنس میں ایک تجویز پیش ہوئی تھی کہ مشرقی اور مغربی تہذیب کی وضاحت اور ان میں مفاہمت کی مختلف صورتوں پر غور کیا جائے۔ اسی کے ساتھ یہ تحریک بھی پیش ہوئی کہ مختلف ملکوں کی تاریخ کی درسی کتابوں میں، خاص طور پر ان ملکوں کی، جن کے درمیان لڑائیاں ہوتی رہی ہیں، ایسی ترمیمیں کی جائیں کہ ان میں عداوت کا جذبہ پیدا نہ ہو۔ جرمنی کے شہر برنس وک میں ایک ادارہ قائم ہوا ہے، جو انٹرنیشنل ٹکس بک انسٹی ٹیوٹ کہلاتا ہے اور جس کے ذمے یہ کام ہے کہ جرمنی اور باقی تمام دنیا کے اہم ملکوں کے ماہرین تاریخ سے مشورہ کر کے تاریخ کی درسی کتابوں میں مناسب ترمیم کرے۔ جرمنی اور فرانس، نیز جرمنی اور جاپان کے ماہروں نے ایسی ترمیمیں کر لی ہیں۔ ۱۹۵۶ء میں ایک کانفرنس ہوئی تھی، جس میں ہندوستان کے ایک نمائندے سے مشورہ کر کے جرمنی کی درسی کتابوں کے لئے ہندوستان کے متعلق مواد فراہم کیا گیا۔ اسی تحریک کے سلسلے میں انگلستان سے مختلف ناشروں نے تاریخ کی کتابیں ہندوستان کے ہائی کمیشن کو اس غرض سے بھیجیں کہ وہ ہندوستانی عالموں سے مشورہ کر کے بتائے کہ ان میں کوئی ایسی بات تو نہیں ہے جو تاریخی اعتبار سے صحیح نہ ہو، یا جسے بیان کرنے میں آج کل کے بدلے ہوئے حالات کا پورا لحاظ نہ رکھا گیا ہو۔ یہ بین الاقوامی کانفرنس، جس کی شرکت کے لئے پروفیسر محمد مجیب صاحب کو مدعو کیا گیا ہے، تاریخ کی درسی کتابوں پر نظر ثانی کی تحریک سے تعلق رکھتی ہے اور ۱۴ مئی سے ۲۳ مئی تک مغربی جرمنی کے ایک شہر گوسلار میں منعقد ہو رہی ہے۔

حضرت اثر لکھنوی جامعہ میں

جن ادیبوں کو حکومت ہند کی طرف سے امسال خطابات ملے ہیں، ان میں نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی بھی ہیں۔ ان خطاب یافتہ معززین کو تمغے عطا کرنے کے لئے ۲۹ اپریل کو راشٹرپتی بھون

میں ایک مخصوص تقریب بنائی گئی۔ اس میں شرکت کے لئے حضرت آثر دہلی تشریف لائے، تو جناب ابوالکاظم قیصر زیدی صاحب کی دعوت پر جامعہ بھی تشریف لائے اور ایک مخصوص اور مختصر صحبت میں اپنا کلام سنایا۔ ایک غزل کے کچھ منتخب اشعار ملاحظہ ہوں:

چلا آتا ہے اک مستِ شباب آہستہ آہستہ
دعائیں ہو رہی ہیں مستجاب آہستہ آہستہ

حیا کشتہ ہوں میں اٹھے نقاب آہستہ آہستہ
سکوں سے ہم بغل ہو اضطراب آہستہ آہستہ

شرابِ ناب دے لیکن ذرا رک رک کے جھک جھک کے
نگاہ مست کر مست و خراب آہستہ آہستہ

خود اپنے حسن کا پردا ہے نورِ سرمدی تیرا
بنے جس طرح مہر اپنی نقاب آہستہ آہستہ

تسلی کی یہ باتیں ہیں کہ تڑپانے کی باتیں ہیں
خموشی پھر تبسم پھر خطاب آہستہ آہستہ

بحمداللہ شوخی سے ہوا شیر و شکر آخر
گھلا موجِ تبسم میں حجاب آہستہ آہستہ

شبابِ حسن کی گرمی میں ہے رنگِ حیا شامل
گلِ عارض سے کھنچتا ہے گلاب آہستہ آہستہ

محبت راہ کرتی ہے یوں ہی محبوب کے دل میں
کہ جیسے نشہ کرتی ہے شراب آہستہ آہستہ

کھلی یوں آنکھ، افوہ یہ اک تارا جھلملاتا تھا
میں سمجھا تھا کہ جلے گا شباب آہستہ آہستہ

آثر اس طرح میں مصرع ولی کا تو سنا ہوگا
"خطاب آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ"

حضرت آثر کو عام طور پر صرف غزل گو شاعر سمجھا جاتا ہے، اور اس میں شبہ نہیں تغزل ہی آپ کی شاعری کی جان ہے، مگر آپ نے نظمیں بھی کہی ہیں اور یہ نظمیں بھی آپ کی غزل کی طرح سادگی و پرکاری کی حامل ہیں۔ موصوف کئی سال تک کشمیر میں رہ چکے ہیں، اس لئے آپ کی بیشتر نظمیں کشمیر کے مناظر پر ہیں اور بقول خود حضرت آثر ان کے ذاتی مشاہدے اور تاثر پر مبنی ہیں۔ آپ نے جو نظمیں سنائیں، ان میں سے "جہلم" کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

جہلم کے دمِ صبح وہ دلچسپ نظارے
بلور بہا جاتا ہے کرنوں کے سہارے

اودل کی طرح سطح پہ رنگوں کا جھلکنا
یا آڑے آنچل کی حسینوں کے اشارے

کھیتی کا وہ جھک جھک کے ہر اک موج سے کہنا
چھاتی سے لگا لوں اگر آجاؤ کنارے

وہ پیچ وخم ساحل وامواج کا عالم — آئینے میں گیسو کوئی معشوق سنوارے
موجوں کو شرابور کئے دیتی ہیں موجیں — قطرے ہیں کہ چھوٹی ہوئی افشاں کے ستارے
نالہ ہو کہ نغمہ ہو مزا دے کے رہے گا — جب سینے میں دم رُکنے لگے شوق کے مارے

کشمیر ترے نام پہ کچھ نغمے لٹا کر
سنتے ہیں اثر اپنے وطن آج سدھارے

یہ محفل چونکہ مختصر اور بے تکلف احباب کی تھی، اس لئے حضرت اثر اپنا کلام سنانے کے ساتھ ساتھ علمی اور ادبی باتیں بھی کرتے جاتے تھے، جا بجا اشعار کی تشریح بھی کرتے اور موقع و محل بھی تبلاتے اور کبھی کبھی تنقید بھی کرتے۔ اس نظم کا جب یہ مصرع سنایا کہ

"جب سینے میں دم رُکنے لگے شوق کے مارے"

تو فرمایا کہ میں نے "دم رُکنے لگے" کہا ہے، کوئی اور "دم گھٹنے لگے" بھی کہہ سکتا ہے۔

محترمہ صالحہ عابد حسین صاحبہ کا سفر زیارت

ابھی حال میں محترمہ صالحہ عابد حسین صاحبہ تہران اور عراق کے مقدس مقامات کی زیارت کر کے واپس آئی ہیں۔ موصوفہ رسالہ "جامعہ" کے لئے اپنے سفر کے حالات لکھ رہی ہیں، جو امید ہے پر از معلومات ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہوں گے۔



طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی مطبوعہ: یونین پریس دہلی ٹائٹیل: دیال پریس دہلی